اِک بار مُسکرا دو

شاہینہ چندا مہتاب



ترتیب

مُجھے کچھ کہنا ہے

خواتین کے ماہناموں نے اُردو کے فروغ میں جو کردار ادا کیا ہے، اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دورِ حاضر کی بہت سی خواتین رائٹر ان ہی ماہناموں کے ذریعے اُبھر کر سامنے آئی ہیں۔ مصنفین کے اس جھرمٹ میں ایک روشن ستارہ ''شاہینہ چندا مہتاب'' کے نام سے جگمگا رہا ہے۔

کسی بھی ناول یا ناولٹ کی بنیاد، مرکزی خیال پر رکھی جاتی ہے۔ پلاٹ جتنا مضبوط ہوگا، کہانی پر لکھاری کی گرفت اتنی ہی اچھی ہوگی۔

شاہینہ چندا مہتاب اس بات کو بخوبی سمجھتی ہیں اور وہ کہانی کا تانا بانا بنتے ہوئے اس کے تمام منفی تقاضے نبھاتی ہیں۔ ان کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنہوں نے لکھنے میں کسی کی پیروی نہیں کی۔ ان کا لکھنے کا، بات کہنے کا ایک الگ ہی انداز ہے۔ ان کی تحریروں کی نمایاں خوبی، پختگی، برجستگی ہے۔ وہ درحقیقت اپنی تحریروں میں زندگی کے خدوخال کو کرداروں میں ڈھال کر پیش کرتی ہیں۔ وہ سماج کے بیشتر پہلوؤں کو بڑی خوبی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کی تحریر میں رومان، آرزوئیں، خواب نئے انداز میں جنم لیتے ہیں اور کردار حقیقی صورتِ حال کو اُجاگر کرتے ہیں۔ وہ ماحول کی عکاسی اتنی خوب صورتی سے کرتی ہیں کہ کردار حقیقی زندگی سے رابطہ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ پڑھنے والے کو ان کے دُکھ سکھ ذاتی لگنے لگتے ہیں۔ وہ زندگی کے بڑے بڑے

مسائل کو بڑے آسان اور سادہ انداز میں اُجاگر کرتی ہیں۔ ان کی تحریر معصومیت سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ ہنستے ہنستے بڑے کام کی بات کہہ جاتی ہیں۔

شاہینہ چندا مہتاب جی کی اور میری رفاقت بڑی عجیب سی ہے۔ وہ آج سے دس سال پہلے میرے آفس میں آئیں تھیں، تب سے اب تک محبتوں کا یہ سفر جاری ہے۔ اگرچہ اگر گِنا جائے تو اس طویل عرصے میں ہماری گِنی چُنی آٹھ سے دس ملاقاتیں ہیں، وہ بھی پندرہ سے بیس منٹ پر محیط، جس میں صرف میں بولتی ہوں اور وہ دھیمی سے مسکراہٹ لبوں پر سجائے سنتی رہتی ہیں۔

اس دوران وہ جو چند جملے بولتی ہیں، اس میں میرے لئے بے شمار چاہتیں، محبتیں اور خلوص ہوتا ہے جو میرے لئے قابل فخر اثاثہ ہے۔ پھر وہ ایک جملہ ان کا جو وہ جاتے ہوئے ہمیشہ کہتی ہیں۔

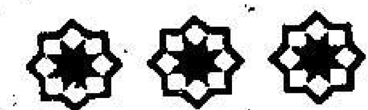
''فوزیہ......! جتنی باتیں میں تم سے کرتی ہوں، کسی اور سے نہیں۔''

میں حیرانگی سے سوچتی رہ جاتی ہوں، کون سی باتیں......؟ میں آپ کو بولنے کا موقع ہی کب دیتی ہوں......؟ یہ تو آپ کا ظرف ہے کہ آپ مجھے برداشت کرتی ہیں۔

شاہینہ چندا مہتاب جی......! میں ہمیشہ آپ کی محبتوں کی مقروض رہوں گی۔ آپ کی چاہتوں کا قرض میں کبھی نہیں اُتار سکتی اور نہ اُتارنے کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ کچھ قرض ایسے ہوتے ہیں جن کی ادائیگی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں اپنی بات کو اس جملہ میں سمیٹوں گی۔

''شاہینہ چندا مہتاب نام ہے، سراپا محبت کا۔''

مدیرہ خصوصی
فوزیہ شفیق



اِک بار مسکرا دو

شور اس قدر زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''نہ جانے لوگ شادی بیاہ میں چیخ چیخ کر بولنا کیوں ضروری سمجھتے ہیں......؟''

لالہ لیٹی سوچ رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے چھپتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی تھی تاکہ کچھ دیر آرام کر سکے مگر آرام کرنا اس کی قسمت میں نہ تھا۔

دروازہ زور دار آواز کے ساتھ کھلا۔ اس کی تقریباً ایک درجن کزنز اور سہیلیوں نے دبے پاؤں چھاپہ مار کارروائی کی۔

''ارے واہ......! تم یہاں چھپی بیٹھی ہو......؟''

سیمی اسے دیکھ کر چیخی۔

''ہم جانتے ہیں، کام کرتے کرتے تم تھک گئی ہو، مگر سگی سالی جی......! دودھ کا گلاس تو آپ کو ہی پلانا ہے۔''

''لیکن ابھی تو سلامی ہو رہی ہے۔ تب تک مجھے آرام کرنے دو......!''

''ہاں......! سلامی تو ہو رہی ہے، مگر چلو......! تمہیں ایک کمال کی

چیز دکھائیں، کیا نادر نمونہ ہے......؟"

"اور شوخ کس قدر ہو رہا ہے......؟"

زیبی نے کہا تو روبی بولی۔

"وہ شوخ ہو نہیں رہا بلکہ ہے ہی شوخ۔ سچ......! ہم ایک بات کرتے ہیں، وہ دس جواب دیتا ہے۔ بات دُلہا سے کرتے ہیں، جواب وہ دیتا ہے۔ پلیز......! تم بھی ایک نظر اسے دیکھ لو......! کہیں وہ دُلہا کا بھائی تو نہیں......؟ اگر ہے تو پھر سمجھو......! تم گئیں ہاتھ سے......؟"

"بکواس مت کرو......!"

تیسری چیخی۔

"دُلہا کا صرف ایک بڑا بھائی ہے اور وہ بھی شادی شدہ، یہ تو دُلہا کا کوئی دوست ہوگا۔"

لالہ اس کی بات سن کر مسکرا کر بولی۔

"آج کل یہ بھی فیشن ہوگیا ہے۔ جہاں کہیں شادی بیاہ ہو، وہاں لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو ہیرو ہیروئن سمجھ کر دیکھتے ہیں۔"

لالہ دودھ کا گلاس لے کر دُلہا کے پاس آئی تو سیمی نے سرگوشی کی۔

"لالہ وہ ہے......!"

"شٹ اَپ......!"

لالہ نے اسے جھڑک دیا اور دُلہا کی سمت دیکھا۔ اس نے اپنے ذہن میں بہت سے جملے دُلہا سے کہنے کے لئے سوچ رکھے تھے مگر اس وقت وہ تلملا کر رہ گئی۔ جب اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ نوجوان بولا۔

"بھئی آصف......! تمہاری سالی تو تمہیں بچہ سمجھ کر دودھ کا گلاس لائی ہے۔"

اس کی بات پر ایک زبردست قہقہہ پڑا اور لالہ بل کھا کر رہ گئی۔

"دیکھئے محترمہ......!"

وہ لالہ سے مخاطب ہوا۔

"شادی بچوں کی نہیں، بڑوں کی ہوتی ہے۔"

"یو شٹ اَپ......!"

لالہ زور سے چیخی۔

"نہیں عروج......! تمہیں اس طرح ان کی اِنسلٹ نہیں کرنا چاہئے......! آخر یہ آصف کی سالی ہوتی ہیں۔"

عروج کے ساتھ بیٹھا لڑکا بولا۔ لالہ جل ہی تو گئی۔ لالہ کو بے انتہا غصہ آیا۔ اس نے آگ برساتی آنکھوں سے سب کو دیکھا اور دودھ کا گلاس زمین پر رکھ کر چلی آئی۔

مگر آتے آتے بھی اس نے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"یااللہ......! تیرا شکر ہے......! جان بچی لاکھوں پائے......! ورنہ میں تو سمجھا تھا، یہ بجلی اگر گری تو مجھ پر ہی گرے گی۔"

بات ختم ہونے سے پہلے یہ قہقہوں کی بارش شروع ہوگئی اور لالہ دانت پیستی ہوئی دُلہن کے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد اس کی تمام کزنز بھی چلی آئیں۔

"ارے لالہ......! تم تو چلی آئی، مگر ایمان سے تمہارے بعد بڑا مزہ آیا۔"

"بکواس مت کرو......!"

لالہ نے ڈانٹ دیا۔

رُخصتی کے وقت لالہ دُلہا دُلہن پر پھولوں کی پتیاں پھینک رہی تھی۔ دُلہا دُلہن آگے بڑھ گئے۔ مگر لالہ نے بے خیالی میں جیسے ہی آخری پھول پھینکے تو وہ سیدھے عروج کے منہ پر گرے تو وہ ایک ادا سے جھکتے ہوئے بولا۔

”شکریہ……! شکریہ……!“

”شٹ اَپ……!“

لالہ نے کہا اور اندر چلی آئی۔ اندر ماں اُداس بیٹھی تھی۔ بھابی اور بھیا بھی خاموش کھڑے تھے۔

”امی جان……! آپ اُداس کیوں ہوتی ہیں……؟“

لالہ نے کہا۔

”کل باجی واپس آجائیں گی۔ اُداس آپ اس وقت ہوں، جب وہ لمبے ٹور پر جائیں گی……؟“

اس پر سب ہنس پڑے تو ماں بھی مسکرا دی۔

صبح ولیمہ تھا۔ لالہ سب سے پہلے تیار ہوئی مگر جگہ سب سے آخری گاڑی میں ملی۔ وہ جب دُلہا کے گھر پہنچے تو ان کا بہت اچھی طرح استقبال کیا گیا۔ استقبال کرنے والوں میں عروج پیش پیش تھے۔

”ہیلو……!“

وہ لالہ کو دیکھتے ہی چہکا۔

”شٹ اَپ……!“

لالہ نے کہا تو وہ پلٹ کر اپنے دوستوں سے بولا۔

”یار……! لگتا ہے بیچاری کو انگلش کا ایک ہی لفظ آتا ہے……؟“

اس کی بات پر ہمیشہ کی طرح سب ہنس پڑے مگر لالہ ہنسنے کی بجائے جل کر بولی۔

”شٹ اَپ……!“

اور پھر خود ہی بل کھا کر رہ گئی کیونکہ اب عروج چپ ہی رہا مگر باقی سب لوگ ہنس دیئے۔ لالہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

”یااللہ خیر……!“

اس نے باقاعدہ دونوں ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھا لئے۔

”ہونہہ……!“

لالہ نے نفرت سے کہا اور اندر چلی گئی اور منہ بنا کر ایک طرف بیٹھ گئی، اچانک آصف اُدھر چلے آئے۔

”کیا بات ہے لالہ……؟ تمہارے منہ پر بارہ کیوں بجے ہیں……؟“

انہوں نے اسے چھیڑا مگر وہ منہ بنائے بیٹھی رہی۔

”ارے بھئی……! ہوا کیا……؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے……؟“

وہ پیار سے پوچھ رہے تھے کہ عروج بھی چلا آیا۔

”یار……! سالی کی خدمت بعد میں کر لینا۔ ذرا باہر آؤ……!“

”تم چلو……! میں آتا ہوں۔“

مگر پھر کچھ خیال کر کے بولا۔

”ارے لالہ……! یہ میرا عزیز ترین دوست عروج ہے اور عروج……! یہ ہماری اکلوتی اور چہیتی سالی لالہ ہے۔“

”آداب……!“

عروج ایک دم سنجیدہ ہوگیا مگر لالہ اس کی پہلی باتیں بھولی نہیں تھی۔ اس لئے منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”آپ شاید مجھ سے ناراض ہیں……؟ کیا میں ناراض ہونے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں……؟“

وہ شرارت سے مسکرایا تو آصف ہنس کر بولے۔

”اچھا یار……! ہم تو چلے……! تم بھی آؤ……!“

مگر عروج وہیں جم گیا۔

”ہاں بھئی……! آپ نے بتایا نہیں……؟“

وہ سنجیدہ بننے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور لالہ کو خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔

"آپ یہاں سے کہیں اور نہیں جا سکتے......؟"

آخر لالہ جل کر بولی۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر......!"

وہ یک دم اُٹھتے ہوئے بولا اور چلا گیا۔ لالہ کچھ دیر وہیں بیٹھی رہی اور پھر دُلہن کے کمرے میں چلی آئی۔ لیکن وہ یہاں بھی موجود تھا۔

پتہ نہیں وہ کیا کیا باتیں کر رہا تھا......؟ لالہ کی سہیلیاں اور کزنز دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔ خود لالہ کی باجی دُلہن ہونے کے باوجود مسکرا رہی تھیں۔

"یہ آج کل کے لڑکے ملک و قوم کی کیا خدمت کریں گے جن کا دل لڑکیوں کے جمگھٹے سے اُٹھنے کو نہیں چاہتا......؟"

لالہ کو دیکھتے ہی وہ مسکرایا اور اپنے قریب ہی بیٹھنے کی جگہ دی۔

"شکریہ......!"

لالہ نے برا سا منہ بنا کے کہا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ بیٹھئے......!"

وہ جیسے لالہ کا مطلب سمجھ گیا۔ لالہ مسکراتی ہوئی بیٹھی تو سب حیرت سے اُسے دیکھنے لگیں۔

"آخر عروج میں ایسی کون سی بات ہے جو لڑکیاں اسے اتنی اہمیت دیتی ہیں......؟"

یہ سوچتے ہی لالہ نے اس کی طرف دیکھا۔

دراز قد، سفید رنگت، متناسب جسم، دلکش خدوخال، سیاہ بال جو بڑی خوب صورتی سے پیشانی پر جمے ہوئے تھے۔ اس میں اتنی جاذبیت تھی کہ اگر کوئی بھی لڑکی اسے ایک نظر دیکھتی تو نظر ہٹانا بھول جاتی۔ نظر لالہ نے بھی ایک ہی ڈالی تھی مگر ہٹانا نہ بھولی تھی۔

"کاش تمہارا رنگ سفید نہ ہوتا اور تمہارے اندر شوخی کی بجائے

سنجیدگی ہوتی......؟"

لالہ نے سوچا اور پھر ہنسی کی آواز سن کر چونک پڑی۔ وہ بڑے انداز سے مسکرا رہا تھا۔ لالہ کے چونکنے پر بولا۔

"اب فیصلہ سوچ سمجھ کر کیجئے گا......!"

اور لالہ کو خود پر غصہ آ گیا۔ بھلا وہ کیوں اتنی محویت سے تکنے لگی تھی......؟ اس کا تو آئیڈیل کوئی اور تھا۔ سانولی سانولی رنگت والا، جو صرف اسی کی بات پر مسکراتا اور پھر سنجیدہ ہو جاتا۔

"فیصلہ گھر جا کر لینا، اتنی جلدی بھی کیا ہے......؟"

سیمی نے کہا تو لالہ ایک دم ہوش میں آ گئی۔ عروج جا چکا تھا اور پوری محفل اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ لالہ مارے غصے کے باہر چلی آئی۔

"میں تو جیسے اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ یہ آج کی لڑکیاں بھی ایسے شوہر چاہتی ہیں جو جوکر بن کر ان کو ہنساتے رہیں۔ بدتمیز کہیں کا......؟"

لالہ بڑبڑائی اور اپنے لئے ایک ایسی جگہ تلاش کی جہاں کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ کچھ دیر تو وہ سکون سے بیٹھی رہی اور پھر عروج بھی وہیں چلا آیا۔

"ارے......! آپ یہاں ہیں......؟ اور ہم آپ کو پورے گھر میں تلاش کر رہے ہیں......؟"

وہ بڑے خلوص سے کہہ رہا تھا۔

"میں پوچھ سکتی ہوں، آپ مجھے کیوں پورے گھر میں تلاش کر رہے تھے......؟"

لالہ نے تلخی سے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

"یہ محبت بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے......؟ اچانک کسی کو دیکھو اور اس کے ہو جاؤ......!"

عروج نے سوچا اور آہستہ سے بولا۔

"سب لوگ کھانا کھا رہے ہیں، آپ بھی چلیں......!"

لالہ خاموشی سے اُٹھی تو وہ بھی ساتھ ہی چلا آیا تھا۔ کھانے کے دوران میں وہ ہر چیز اسے بڑھ بڑھ کر پیش کرتا رہا۔ لالہ کی سہیلیاں ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے کرنے لگیں۔ مگر عروج سب سے بے پرواہ اس کے آگے پیچھے رہا۔

شام کو جب یہ لوگ واپس آنے لگے تو عروج آصف سے بولا۔

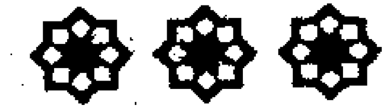
"اگر ہماری ضرورت ہو تو مفت خدمات حاضر ہیں......!"

"شکریہ......!"

آصف مسکرایا تو وہ لالہ کی طرف پلٹ کر بولی۔

"اچھا لالہ......! خدا حافظ......! پھر ملاقات ہوگی۔"

وہ جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے چلا گیا۔



لالہ دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ ایک بھائی بڑا تھا جس کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹا بھائی تعلیم کے لئے باہر تھا۔ اب گھر میں لالہ اور مالا تھیں۔

مالا نے ایف اے کے بعد تعلیم چھوڑ دی تھی۔ اب جبکہ اس کے لئے ایک اچھا رشتہ آیا تھا، تو ان لوگوں نے اس کی شادی کر دی تھی۔ آصف قصور کے بہت بڑے زمیندار کے بیٹے تھے۔ لاہور اور قصور میں ان کی کوٹھیاں تھیں اور گاؤں میں بہت بڑی حویلی، باغات اور بہت سی زمین تھی۔

عروج نے جس انداز سے لالہ کو "خدا حافظ" کہا تھا، لالہ اس کے بارے میں غور کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ سب لوگ باتوں میں مصروف تھے۔ اس لئے وہ بھی باتوں میں لگ گئی۔ جو باتیں لالہ وہاں نہیں کہہ سکی تھی، اب

رہی تھی۔ اسے یوں جھکتے دیکھ کر سیمی بولی

"یوں تو کبھی لالہ......! تم نے ہار نہیں مانی......! مگر عروج تمہیں ست دے گیا۔"

لالہ نے گھور کر اسے دیکھا مگر دل میں سوچنے لگی۔

"یہ مجھے اس کے سامنے کیا ہو گیا تھا......؟ خیر......! اب کے کبھی ں کا سامنا ہوا تو میں بھی چپ نہیں رہوں گی۔ ایک کو دس کی دس سناؤں گی۔"

یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

کچھ دنوں بعد وہ لوگ مالا کو لینے آ گئے۔ مہمانوں کی آواز سن کر لالہ باہر آئی اور عروج کی شکل دیکھتے ہی واپس پلٹ گئی۔

"یہ کم بخت ہیرو بننے کی کوشش کر رہا ہے......؟"

اس نے دل میں سوچا۔ پھر وہ مہمانوں کے سامنے نہ آئی۔ یہاں تک کہ جب مالا جانے لگی تو وہ اس سے وہیں مل لی۔ وہ دروازے تک جانا نہیں چاہتی تھی۔ تاکہ عروج اسے دیکھ نہ سکے۔

البتہ خود وہ عروج کو دیکھتی رہی جس کی بے چین نظریں کسی کی تلاش میں تھیں۔ وہ لوگ چلے گئے تو لالہ نے اطمینان کی سانس لی مگر بہن کی جدائی کا احساس کر کے اُداس ہو گئی۔ ان دونوں بہنوں میں بہت پیار تھا مگر اب تو اسے تنہا وقت گزارنا تھا۔

لالہ کے دن بے انتہا اُداس گزر رہے تھے۔ گھر والے اس کی اُداسی کو سمجھتے تھے۔ بھائی اور بھیا روزانہ اس کی خاطر تفریح کو جانے لگے۔

اس دوران مالا خود بھی ایک بار آ کر مل گئی۔ اس کے بعد آصف اسے لینے بھی آئے مگر لالہ نہ گئی۔ حالانکہ بہن کی وجہ سے وہ اُداس تھی مگر عروج کی وجہ سے اس کا وہاں جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

دن یوں ہی اُداس گزر رہے تھے۔ بہار آ چکی تھی اور پھر ایک دن

آصف لالہ کو لینے چلے آئے۔ جب لالہ نے جانے سے انکار کیا تو وہ پیار سے بولے۔

''سالی صاحبہ......! آپ نے کشمیر، مری، کاغان اور بہت سے لوکیشن دیکھئے ہوں گے مگر جس نظارے کے لئے میں آپ کو لینے آیا ہوں، وہ ان سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔''

''کیوں......؟ آپ مجھے جنت کی سیر کے لئے لینے آئے ہیں......؟''

لالہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو آصف مسکرا کر بولے۔

''گڑیا......! ایسا ہی سمجھو......! مگر تمہیں ہر حال میں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ یوں بھی آپ کی باجی آپ کے بغیر بہت اُداس ہیں۔''

''تو پھر باجی کو بھی ساتھ لے آتے......؟''

''بھئی......! آپ کی باجی وہ خوب صورت نظارہ چھوڑ کر آنا نہیں چاہتی۔''

لالہ نے بہت انکار کیا مگر آصف اسے لے کر ہی اُٹھے۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے اپنی تمام کزنز کو فون کر دیا کہ اگر وہ خوب صورت نظارہ کرنا چاہتی ہیں تو وہ بھی آجائیں۔

سارا راستہ لالہ جھلائی ہوئی بیٹھی رہی۔ آصف اگر کوئی بات بھی کرتے تو جواب نہ دیتی۔

''کمال ہے......!''

آصف غصے سے اس کا چہرہ پھولا ہوا دیکھ کر بولے۔

''ہم اتنے پیار سے لینے آئے ہیں اور جناب کے منہ پر بارہ کی بجائے اٹھارہ بج رہے ہیں......؟ آخر تم آنا کیوں نہیں چاہتی تھی......؟ بھئی......! تم ایک بار دیکھو تو سہی......! بڑی خوب صورت جگہ ہے۔''

یہ لوگ قصور پہنچ چکے تھے مگر آصف قصور میں رُکنے کی بجائے آگے

بڑھے تو لالہ چیخ کر بولی۔

''کیا آپ مجھے گاؤں لے جا رہے ہیں......؟''

''جی ہاں......! کیونکہ وہ خوب صورت نظارہ گاؤں میں ہے۔''

''میری ٹانگیں تھک گئی ہیں۔ پلیز......! یہیں رُک جائیے......!''

''کیوں......؟ کیا پیدل مارچ کر کے آ رہی ہو......؟''

آصف مسکرائے۔

''آپ کون سی میرے لئے مرسڈیز لے کر آئے تھے......؟ ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوں۔''

''بھئی سوری......! یہ بھی تو دیکھو، میں چلا رہا ہوں۔''

آصف نے کہا تو موٹر سائیکل فراٹے بھرتی ہوئی گاؤں کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہ ابھی کمال چشتی کے مزار کے پاس ہی پہنچے تھے کہ سامنے سے ایک موٹر سائیکل سوار طوفانی رفتار سے آتا ہوا نظر آیا۔ جب وہ ان لوگوں کے قریب آیا تو لالہ چونک پڑی۔

وہ عروج تھا۔ عروج نے آگے بیٹھے آصف کو دیکھا تھا۔ اب جو لالہ کو دیکھا تو یک دم بریک لگائے مگر اتنی دیر میں آصف دُور نکل گئے۔ مگر اس کی موٹر سائیکل گرتے گرتے بچی۔

آصف نے آئینہ میں یہ دیکھ کر موٹر سائیکل روکنا چاہی، مگر لالہ نے منع کر دیا۔

عروج بھی ضرورت سے زیادہ ڈھیٹ ثابت ہوا۔ موٹر سائیکل فوراً ان کے پیچھے لگائی اور آصف کا راستہ روکتے ہوئے بولا۔

''کیا بکواس ہے......؟ تم نے دیکھا نہیں میں نے رُکنے کا اشارہ کیا تھا......؟''

''کوئی خاص وجہ......؟''

آصف مسکرائے۔

''تمہارا سر......!''

عروج نے اس کا مطلب سمجھ کر دانت پیسے پھر لالہ سے مخاطب ہوا۔

''ہیلو لالہ......! تمہارا کیا حال ہے......؟''

''کچھ زیادہ اچھا نہیں......!''

لالہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔ اسے عروج کا پیچھے آنا ذرا اچھا نہ لگا تھا۔ عروج اس سے بے خبر کہہ رہا تھا۔

''پھر تو خدا خیر کرے......!''

''جی ہاں......! وہ تو کرے گا۔ پلیز آصف بھائی......! جلدی چلئے......! میں تھک گئی ہوں۔''

''اچھا بھئی......! اس وقت تو میں قصور جا رہا ہوں۔ پھر رات کو ملاقات ہوگی۔''

عروج نے کہا اور جس رفتار سے آیا تھا، اسی رفتار سے قصور روانہ ہوگیا۔

''یااللہ خیر......!''

لالہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا ہوا......؟''

''آصف بھائی......! آپ کے یہاں لوگ موٹر سائیکل بڑی تیز چلاتے ہیں۔''

''ہاں بھئی......! ٹریفک زیادہ نہیں......!''

آصف نے کہا اور کچھ دیر بعد موٹر سائیکل گاؤں میں داخل ہوگئی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ باغات میں داخل ہوگئی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ باغات میں داخل ہوگئی۔ چاروں طرف باغات تھے، ان

کے بیچ سڑک پر موٹر سائیکل دوڑ رہی تھی۔

لالہ غور سے آلوچے کے باغات کو دیکھنے لگی۔ جن پر خوب صورت سے سفید پھول کھلے ہوئے تھے اور کچھ کھلنے والے تھے۔ پھر کچے پکے مکانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد ایک خوب صورت حویلی نظر آئی۔ لالہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے سوچنے لگی۔

''کتنی خوب صورت جگہ پر بنائی گئی ہے۔''

مگر جب موٹر سائیکل اس کے قریب سے گزر گئی تو لالہ حیران رہ گئی۔

اس کے پوچھنے پر آصف نے بتایا۔

''یہ عروج کی رہائش گاہ ہے۔ وہ سامنے ہماری حویلی ہے۔''

لالہ نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ یہ بھی ایک حویلی تھی مگر کچھ قدیم سی۔ حویلی کے گیٹ پر آصف موٹر سائیکل روکتے ہوئے بولے۔

''تم اپنا بیگ اُٹھا کر اندر چلو......! مجھے ایک ضروری کام ہے۔''

لالہ جواب دیئے بغیر حویلی میں داخل ہوگئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ نوکر نے آ کر اس سے بیگ لے لیا۔ کچھ آگے بڑھی تو کمرے سے نکل کر مالا اس سے لپٹ گئی اور بولی۔

''میری گڑیا......! تو نہیں جانتی، مجھے کتنا یاد آتی تھی......؟''

لالہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''آپی......! آپی......! آپ بھی مجھے بہت یاد آتی تھیں۔''

''تو پھر آئی کیوں نہیں تھی......؟ کتنی دفعہ میں نے آصف کو لینے بھیجا......؟ ارے ہاں......! آصف تمہیں چھوڑ کر کہاں گئے......؟''

''کہتے تھے ضروری کام ہے۔''

لالہ آنسو صاف کر کے بولی۔

''اسی اثناء میں مالا کی جیٹھانی آگئی۔ لالہ نے انہیں آداب کیا اور

بہن کے ساتھ کمرے میں آگئی۔

''آپ نے کون سا نظارہ دکھانے کے لئے مجھے بلایا ہے.....؟''

چائے پینے کے بعد لالہ نے پوچھا۔

''ارے.....!''

مالا ہنس پڑی۔

''کچھ دن انتظار کرو.....! بلکہ دو تین دن، پھر تمہیں پتا چل جائے گا۔''

''کیوں.....؟ پھر یہاں کیا ہوگا.....؟ درخت تو یہی آلوچے کے رہیں گے؟''

''ہاں بھئی..... درخت تو یہی رہیں گے مگر ان کی بہار اور ہی قسم کی ہوگی۔ خیر.....! اس وقت تم آرام کرو.....!''

لیٹی تو لالہ آرام کی نیت سے تھی، مگر نیند ایسی آئی کہ جب آنکھ کھلی تو شام کا ملگجی اندھیرا چھا رہا تھا۔ لالہ باہر آئی تو سب لوگ چائے پی رہے تھے۔

''آؤ بھئی.....! تمہیں یہ آتے ہی سونے کی کیا سوجھی.....؟''

''آصف بھائی.....! میں تھک گئی تھی۔''

''ہماری ہمت دیکھو.....! سارا دن کام کرتے ہیں، اکثر ایک دو چکر قصور کے بھی لگانے پڑتے ہیں۔''

''ہاں بھئی.....! آپ بڑی ہمت والے ہیں۔''

اتنے میں چائے آگئی تھی۔ وہ چائے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

لالہ چائے پیتی ہوئی یہاں کے لوگوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ ابھی تک تو جتنے ملے تھے، سب محبت سے پیش آئے تھے، ورنہ اس نے تو سن رکھا تھا کہ یہاں کے لوگ بہت اکھڑ مزاج ہوتے ہیں۔

''کیا سوچنے لگی ہو لالہ.....؟''

آصف نے اسے گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں آصف بھائی.....!''

صبح لالہ کی آنکھ جلد ہی کھل گئی۔ باہر آئی تو موسم بھی خوب صورت تھا۔ وہ کسی کو بتائے بغیر ہی سیر کے لئے نکل گئی۔ ابھی وہ گھر سے کچھ ہی دور گئی تھی کہ کتوں کی ایک ٹولی سے ملاقات ہوگئی۔ لالہ اُلٹے پیر گھر کو بھاگی اور گیٹ میں داخل ہوتے ہی کسی سے ٹکرا گئی۔

''ارے ارے.....!''

آصف اسے تھامتے ہوئے بولے۔

''کہاں سے آرہی ہو.....؟''

''آصف بھائی.....! وہ کتے.....''

لالہ ہکلا کر بولی۔

''اچھا.....! تو کتوں سے ڈر کر بھاگی ہو.....؟''

آصف ہنسی دباتے ہوئے بولے۔

''باہر جانا تھا تو کسی نوکر کو ساتھ لے لیا ہوتا.....؟ یا مجھ سے کہتیں.....! خیر چلو.....! میں تمہیں باغات دکھاتا ہوں۔''

''جی نہیں.....! اب میں نہیں دیکھوں گی۔''

لالہ نے کہا اور اندر چلی آئی۔

کمرے میں بیٹھی وہ کتابوں سے دل بہلا رہی تھی کہ عروج آگیا۔

''کہو بھئی لالہ.....! کیا حال ہے.....؟''

جواب کا انتظار کئے بغیر پھر بولا۔

''دراصل میں رات دیر سے آیا تھا۔ خیر.....! تم کہو رات کیسی گزری یہاں پر.....؟ کسی سے ملاقات ہوئی.....؟''

''رات کچھ زیادہ اچھی نہیں گزری۔ یہاں کسی سے نہیں ملی۔ کیونکہ میں آتے ہی سوگئی تھی۔''

لالہ نے ناگواری سے جواب دیا۔

''ہاں بھئی......! شہر کے لوگ بہت جلد تھک جاتے ہیں اور وہ بھی بغیر کام کیئے......!''

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟''

لالہ نے جل کر پوچھا۔

''کچھ نہیں......!''

عروج نے اس کے غصے سے پھولے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''چلیئے......! آپ کو لینے آیا ہوں۔''

''کیوں......؟''

''وہ بھئی......! ہماری بھابی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''معاف کیجیئے گا......! میں اس وقت کہیں جانا نہیں چاہتی۔ پھر کبھی سہی......!''

''مگر میں تو لے کر ہی جاؤں گا......!''

اتنے میں بالا کمرے میں داخل ہوئی۔

''لالہ......! چلی جاؤ......! میں نے نصرت سے کہا تھا کہ جب تم آؤ گی تو تم سے ملاؤں گی۔''

''مگر باجی......''

''اگر مگر کچھ نہیں......! جاؤ شاباش......!''

لالہ نے منہ بنا کر عروج کی طرف دیکھا تو وہ شوخی سے بھوئیں اُچکا کر ہنس دیا۔

''اس سے قبل بھی گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے یا پہلی بار آئی ہو......؟''

عروج نے چلتے چلتے باتوں کے لئے موضوع ڈھونڈا۔

''مجھے گاؤں دیکھنے کا کبھی شوق نہیں رہا۔''

لالہ کا لہجہ خشک تھا۔

''پھر یہاں کیا کرنے آئی ہو......؟''

عروج نے چڑانے والے انداز میں کہا۔ لالہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا مگر خاموش رہی۔

عروج کی بھابی بے حد خلوص و محبت سے ملیں۔ جیسے لالہ کو بہت پہلے سے جانتی ہو۔

''لالہ......! کیا پینا پسند کرو گی......؟''

''جی......! میں تو ناشتہ کر کے آ رہی ہوں۔''

''پھر بھی......؟''

نصرت نے پوچھا۔

''چھوڑیئے بھابی......! میں کچھ اپنی پسند سے لے آتا ہوں۔''

پھر عروج کی پسند پر انار کا جوس آ گیا۔ لالہ کو عروج کی پسند کی داد دینا پڑی۔ اس وقت جوس پینا اسے واقعی اچھا لگ رہا تھا۔

پھر عروج نے اسے اپنی پوری کوٹھی گھمائی۔ لان میں گلاب کے مختلف پودے تھے اور لگتا تھا، دُنیا بھر کے پودے جیسے وہاں موجود ہوں۔

''عروج کو پھولوں سے بڑی محبت ہے۔''

عروج کی بھابی نے لالہ کو بتایا۔

''عروج کو اچھے کھانے اور لباس کا ہی نہیں، گانے کا بھی شوق ہے۔''

آخر میں عروج اسے اپنے کمرے میں لایا۔ نفاست سے سجا ہوا یہ کمرہ خاصا بڑا تھا۔ جدید طرز کے ڈیکوریشن فرش پر قیمتی پاکستانی قالین اور دریچوں پر بہار کی مناسبت سے جالی دار پردے۔

لالہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی اور دل ہی دل میں عروج کی

نفاست پسندی اور اعلیٰ ذوق کی داد دے رہی تھی۔

''کمرہ پسند آیا......؟''

لالہ کو کچھ سوچتے دیکھ کر عروج نے جھک کر پوچھا۔

''کیا مطلب......؟''

لالہ نے آنکھیں نکالیں۔

''کچھ نہیں......!''

عروج کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ تھی۔

لالہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کمرے سے نکلنے میں ہی بہتری سمجھی۔

جب وہ گھر آنے لگی تو عروج کو اپنے ساتھ اُٹھتا دیکھ کر بولی۔

''آپ بیٹھیں......! میں خود ہی چلی جاؤں گی۔''

''اکیلی نہیں جا سکو گی۔ باغوں میں آج کل بہت خطرناک جانور ہوتے ہیں۔''

''جی شکریہ......! میں چلی جاؤں گی۔''

لالہ نے کہا اور باہر نکل آئی۔ ابھی وہ حویلی سے کافی دُور تھی کہ دو سؤر کہیں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ یہ جانور اس علاقے میں بکثرت پائے جاتے تھے۔

اس وقت یہ راستہ ویران تھا۔ لالہ نے خوفزدہ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ مگر زیادہ تیز بھی بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اس اثناء میں سوروں کو اپنے قریب آتا دیکھ کر چیخ نکل گئی۔

دوسرے ہی لمحے باغ میں سے بھاگنے کی آواز آئی۔ لالہ نے سر اُٹھا کر دیکھا تو آصف اسی کی طرف آ رہے تھے۔ لالہ بھاگ کر ان کے قریب پہنچ گئی اور جانور دوسرے باغ میں گھس گئے۔

''کہاں گئی تھیں اکیلی......؟''

آصف نے نرمی سے پوچھا اور لالہ کچھ بتانے کی بجائے رونے

لگی۔

''میں نے کہا بھی تھا کہ باہر آتے وقت کسی نوکر کو ساتھ لے لیا کرو......!''

لالہ کے کوئی جواب دینے سے قبل ہی عروج آصف کے قریب پہنچ گیا۔

''یار......! میں بتاتا ہوں۔ یہ بھابی سے ملنے گئی تھیں۔''

''اور تم نے اسے اکیلے بھیج دیا......؟''

''یار......! تمہاری سالی کا دماغ ٹھیک ہونے والا ہے......؟ میں نے بہت کہا تھا کہ میں چھوڑ آتا ہوں، مگر ایک ہی رٹ لگی تھی کہ میں چلی جاؤں گی۔''

''آپ میرے پیچھے آ رہے تھے......؟ اور آپ نے میری مدد نہیں کی......؟''

''بس......! ذرا تماشا دیکھنے لگ گیا تھا۔''

عروج نے اسے چڑایا۔

''بکو نہیں......! چلو اب گھر چھوڑ کر آؤ......!''

''بندہ پہلے ہی حاضر تھا۔''

عروج نے شرارت سے لالہ کو دیکھا۔

''آصف بھائی......! آپ خود مجھے چھوڑ کر آئیں......! میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''بچوں جیسی باتیں نہیں کرتے لالہ......! میں کچھ آدمیوں سے بات کر رہا ہوں۔ تم عروج کے ساتھ جاؤ......!''

آصف نے کہا اور باغ میں چلے گئے۔

لالہ خاموشی سے چلنے لگی۔ عروج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سیٹی بجاتے ہوئے ایک شوخ دُھن شروع کر دی۔

''لیجئے بھابی......! سنبھالئے اپنی چہیتی بہن کو......!''

''کیوں......؟ کیا ہوا......؟''

مالا نے مسکرا کر پوچھا۔

''انہیں سے پوچھ لیجئے......! میں چلتا ہوں۔''

عروج واپسی کے لئے مُڑ گیا۔

''بہت بدتمیز ہے آپ کا یہ رشتہ دار......!''

''ہوا کیا......؟''

مالا کے پوچھنے پر لالہ نے اس کی گستاخیوں کی پٹاری کھول دی۔

اسی دن دوپہر میں لالہ کی تمام کزنز بھی آ گئیں۔ لالہ ان کو دیکھ کر خوش ہوئی۔ اتنی جلد ان کے آنے کی اسے اُمید نہ تھی۔

''کیوں بھئی......؟ یہ تم ہمیں آنے کا پیغام دے کر کیوں آئی تھیں......؟''

''اس لئے کہ تم لوگ بھی تھوڑی تفریح کر لو......!''

''سنو لالہ......! عروج سے کبھی تمہاری ملاقات ہوئی......؟''

سیمی نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں......؟ عروج یہاں کی بڑی ہستی ہے کیا......؟''

''اچھی اچھی باتیں کرتا ہے، وقت گزر جاتا ہے۔''

''مجھے اچھی اچھی باتیں سننے کا کوئی شوق نہیں......!''

اس دن تو سب نے آرام کیا۔ مگر اگلی صبح لالہ اُٹھی تو عجیب پُرکیف سی فضاء تھی۔ نسیم سحر کے خنک جھونکے اور فضاء میں رچی ہوئی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور آسمان پر بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے لالہ کے مزاج میں شگفتگی پیدا کر رہے تھے۔ اس نے سب کو جگایا اور پھر وہ گھر سے نکل آئیں۔

گاؤں کی زیادہ تر عورتیں صبح ہی صبح کام سنبھالتی ہوئی نظر آئیں۔

کچھ بچے اسکول جا رہے تھے۔ کچھ کھیل رہے تھے۔ زیادہ تر مرد اپنے کام پر جا رہے تھے۔ بوڑھے دُھوپ میں چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے۔

جہاں کہیں بھی کوئی عورت ملتی، لالہ رُک کر بڑے ادب سے اسے سلام کرتی۔ یہ بات وہ واضح طور پر محسوس کر رہی تھیں۔ شہر کی بہ نسبت، گاؤں کی عورتیں زیادہ محنتی ہیں۔ کیونکہ وہ کپاس چنتیں، آلوچے کے موسم میں آلوچے توڑتیں، امرودوں کے موسم میں امرود توڑتیں۔

یعنی کہ ہر موسم میں ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی کام لگا رہتا۔ ایک جگہ کچھ عورتیں تنور پر روٹیاں لگا رہی تھیں۔

''یہ لوگ صبح کو بھی تنور پر روٹی لگا کر کھاتے ہیں......؟''

لالہ حیران سی بولی۔

''مکھن کا پیڑا روٹی پہ رکھ کر کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔''

''چہ چہ......! لالی نے منہ بنایا۔ پھر ان عورتوں کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ سب نے ان کو حیرت سے دیکھا اور پھر ان کا اخلاق دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

''کچھ کھاؤ گے تم لوگ......؟''

''نہیں......! ہم بس ذرا روٹی لگائیں گے۔''

سیمی نے کہا۔

''لگانی آتی ہیں تمہیں......؟''

''جی ہاں......! لالہ بڑی اچھی طرح لگا لیتی ہے۔''

سیمی نے شرارت سے لالہ کو دیکھا۔

''تب تو بڑی پیاری بچی ہے یہ......!''

اس ایک جملہ میں پتا نہیں کیا تھا کہ لالہ روٹی لگانے کو تیار ہوگئی۔

سیمی نے اسے سچ مچ روٹی لگانے کو تیار دیکھا تو دانت پیس کر بولی۔

''لالہ کی بچی......! ہاتھ جل جائے گا۔''

"ارے......! پرواہ نہیں......! اتنی شاندار تعریف کے بعد روٹی نہ لگانا میری توہین ہے۔"

اس نے چھوٹا سا پیڑا بنایا اور روٹی بنا کر تنور پہ جھکی اور پوری جان سے کانپ گئی۔ تنور سے نکلتی ہوئی آنچ نہ صرف اسے سرخ کر گئی، بلکہ ہاتھ کو بھی جلا دیا۔ مگر خیریت رہی۔ روٹی تنور میں لگ گئی۔ ہاتھ کے جلنے کی تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ مگر چونکہ اب وہ عورت اس کے لئے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنانے لگی تھی۔ اس لئے لالہ بھی ڈھیٹ بن گئی۔ اس نے چار روٹیاں لگائیں۔

اس دوران میں پہلے والی روٹی پک گئی۔ لالہ نے ہاتھ پر رومال لپیٹ کر روٹی اُتارنے کی کوشش کی مگر چونکہ اسے زور زور سے ہاتھ مار مار کر جمایا تھا، اس لئے وہ تنور سے چپک گئی تھی۔ معاملہ کمبل والا ہوگیا۔ تنور تو چھوڑتا مگر روٹی تنور کو نہیں چھوڑ رہی تھی۔ رومال لالہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر تنور میں گرا اور اس نے آگ پکڑ لی۔

لالہ نے بڑی مشکل سے چہرہ بچایا۔ سیمی اور دوسری کزن ہنسنے لگیں۔ مارے شرمندگی کے لالہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اچانک پرویز وہاں سے گزرا۔ یہ وہ لڑکا تھا جو مالا کی شادی میں آیا تھا۔ لالہ کے سرخ چہرے کو اس نے بڑی حیرت سے دیکھا۔

"آپ یہاں کیسے......؟"

"روٹی لگانے کی پریکٹس کر رہی تھی۔"

لالہ نے طنز کیا۔

"ماسی......! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ یہ بچاریاں بھلا روٹی لگانا کیا جانیں......؟ آپ نے خواہ مخواہ اجازت دی......؟"

پھر وہ لالہ سے مخاطب ہوا۔

"آیئے......! میں آپ کو چھوڑ آؤں......!"

وہ سب خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیں۔ چلتے ہوئے لالہ نے سنا۔

"ارے......! سارے تنور کا ستیاناس ہوگیا......!"

حویلی کے قریب پہنچ کر پرویز چلا گیا اور یہ اندر چلی آئیں۔

اندر مالا پریشانی سے ٹہل رہی تھی۔

"کہاں چلی گئیں تھیں......؟ سب کو خواہ مخواہ پریشان کیا......؟ کم از کم بتا کر جایا کرو......! یہاں آج کل خطرناک جانور پائے جاتے ہیں۔ اگر کسی نے کاٹ کھایا تو......؟"

مالا نے غصے سے کہا مگر لالہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی غصہ کافور ہوگیا۔

"تمہیں کیا ہوا......؟"

مالا نے پوچھا تو لالہ نے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔

"ارے بھئی......! ہوا کیا......؟"

"ہاتھ جل گیا......!"

"وہ کیسے......؟"

"تنور میں روٹیاں لگائی تھیں۔"

سیمی نے طنز سے کہا۔ تب ہی عروج آ گیا۔ اسے پتہ چلا تھا کہ یہ لوگ صبح ہی گم ہوگئی تھیں۔

"ہائے......! میں مر جاؤں۔"

مالا اس کے ہاتھ کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔

"تم سے روٹی لگانے کو کس نے کہا تھا......؟"

لالہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر عروج کو دیکھ کر آنسو صاف کرتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

"یہ سب کیسے ہوا......؟"

عروج نے پوچھا تو سیمی نے ہنستے ہوئے تفصیل بتائی۔
''یہ تو بہت برا ہوا......!''
سیمی کی بات ختم ہونے پر عروج نے کہا۔
''بھابی آپ کے ہاں برنال ہے......؟''
مالا نے نوکر کو برنال لانے کو کہا اور ان سے بولی۔
''چلو ناشتے کی میز پر......!''
اور خود کچن میں چلی گئی۔
عروج جب برنال لے کر لالہ کے کمرے میں آیا تو وہ بیٹھی رو رہی تھی۔ عروج کو اس پر بے انتہا پیار آیا۔
''ہاتھ لاؤ لالہ......! برنال لگا دوں۔''
''تم آخر بار بار یہاں کے چکر کیوں لگاتے ہو......؟''
لالہ نے تلخی سے پوچھا۔
''بہت جلد سمجھ جاؤ گی۔''
عروج مسکرایا اور لالہ کا ہاتھ تھام لیا۔
''چھوڑو میرا ہاتھ......! مجھے نہیں لگانا برنال۔''
''اوں ہوں......! بری بات ہے۔''
عروج شرارت سے مسکرایا۔
''اگر باہر کسی نے سن لیا تو کہے گا ضرور دال میں کالا ہے جو تم اس طرح کی حرکتیں کرتی ہو۔''
''واٹ......؟''
لالہ نے غصے سے کہا۔
''ہاں......!''
عروج نے آہستہ سے کہا اور برنال اس کے ہاتھ پر لگانے لگا۔
''ارے ہاں......! سنو ......!''

برنال لگانے کے بعد وہ بولا۔
''آج شام تم سب کی دعوت ہے۔''
''میں نہیں آ سکتی......!''
لالہ نے خشک لہجہ اختیار کیا۔
''تمہاری وجہ سے تو میں پارٹی دے رہا ہوں اور تم کیسے نہیں آؤ ......؟ تم ضرور آنا......! ورنہ میں سمجھوں گا......''
بات اُدھوری چھوڑ کر وہ باہر گیا، واپس آ کر دو ٹیبلٹ دیتے ہوئے ا۔
''انہیں کھالو اور جاؤ......! آرام آ جائے گا۔''
اور پھر وہ چلا گیا ٹیبلٹ کھانے کے بعد لالہ کو جلد ہی نیند آ گئی۔
شام پانچ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ ہاتھ کی جلن بہت کم ہو تھی اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ لالہ شور مچاتی ہوئی باہر آئی۔ لان میں بیٹھے تھے۔ مالا اسے لے کر کچن کی طرف چلی گئی اور آصف پیچھے چلے آئے۔
''کیوں بھئی......؟ یہ تم نے صبح کیا حرکت کی......؟''
''مجھے نہیں معلوم......! بھوک لگ رہی ہے۔''
مالا جلدی جلدی اس کے لئے کھانا نکالنے لگی اور آصف اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگے۔
''جلن تو نہیں ہوتی......؟''
''جی نہیں......! برنال لگا دی تھی آپ کے اس چہیتے دوست نے۔''
لالہ نے ناگواری سے کہا اور کھانا کھانے لگی۔ آصف اس کی بات پر نہ جانے کیوں مسکرائے......؟
''ہاں بھئی بیگم......!''

وہ پلٹ کر مالا سے کہنے لگے۔

”آپ ذرا جلدی تیار ہو جانا......!“

”میں تو نہیں جاؤں گی۔“

لالہ نے کورا سا جواب دیا۔

”نہیں بھئی......! وہ بڑے خلوص سے مدعو کر رہا ہے۔ انکار نہیں کرنا۔ یوں بھی اگر وہ پارٹی نہ دیتا تو میں آج ایک دعوت کا اہتمام کرتا کیونکہ آج چودھویں کی رات ہے اور باغات کی بہاریں بھی اپنے عروج پر ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ آلوچوں پر بہار آئے اور چودھویں کی رات بھی ہو۔ آج کی رات تو دیکھنے والی ہوگی۔ تم ضرور چلنا......!“

لالہ نے بے دلی سے جانے کا فیلہ کیا۔ البتہ سیمی، عالیہ، نوشی اور فری بہت خوش تھیں۔

جب یہ لوگ عروج کے باغات میں پہنچے تو عروج اپنے بھائی، بھابی اور کچھ دوستوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ نہر اور باغ کے درمیان پارٹی کی جگہ بنائی گئی تھی۔

”آصف بھائی ......! یہاں صرف آلوچے ہی ہوتے ہیں کیا......؟“

”نہیں...... یہاں تقریباً ہر قسم کا پھل ہوتا ہے مگر آلوچے اور امرود بکثرت ہوتے ہیں۔“

آصف اور لالہ باتوں میں مصروف تھے اور عروج لالہ کو دیکھ رہا تھا جو سفید لباس میں سب سے منفرد لگ رہی تھی۔

”یار......! تھوڑی شرم کرو......!“

پرویز نے اسے کہنی ماری تو وہ چونک کر مسکرا دیا۔ عروج کی بھابی کھانا خود بنا کر لائی تھیں۔ سب کو باتوں میں مصروف دیکھ کر بولیں۔

”پہلے کھانا کھا لیں......! نہیں تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

یوں سب کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔

”میں نے کہا تھا عروج سے کہ شکار کے لئے جاؤ مگر سونڈی کے کاٹنے کی وجہ سے نہ جا سکا۔“

عروج کی بھابی لالہ کو بتا رہی تھی۔

”یار......! کب کاٹا سونڈی......؟“

آصف نے ہنس کر پوچھا۔

”آج ہی......!“

عروج نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

”کوئی جرم کیا ہوگا جس کی سزا مل گئی۔“

لالہ نے کھانا کھاتے ہوئے چوٹ کی۔

”جرم تو خوب صورت کیا تھا۔ سزا نہ جانے اتنی بدصورت کیوں لی......؟“

عروج نے مسکرا کر جواب دیا۔

”کھانے سے فارغ ہوتے ہی باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پرویز نے عروج سے گانے کی فرمائش کر دی عروج نے انکار کرنا چاہا مگر عالیہ اور نوشی نے بھی جب کہا تو اس نے لالہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک گیت شروع کیا۔

لالہ عروج کی سحرانگیز آواز میں کھو گئی۔ گانا ختم ہوا تو سب نے تالیاں بجا کر داد دی اور پھر باتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔

اچانک سیمی بولی۔

”کیا خیال ہے، اگر لالہ اور عروج کی جوڑی بنے تو بڑی اچھی لگے گی......؟“

”بکومت......!“

لالہ نے گھور کر کہا۔

”ویسے اس میں کوئی برائی بھی نہیں......
پرویز نے رائے دی۔
”خدا نے عروج کو ہر چیز سے نوازا ہے۔ بہت خوش قسمت ہے عروج......!“
”آپ لوگ دراصل مطلب نہیں سمجھتے۔ لالہ کا آئیڈیل کوئی اور ہے۔“
”کیسا آئیڈیل......؟“
عروج نے اشتیاق سے پوچھا۔
”ارے......! آپ کو نہیں پتہ......؟“
سیمی ہنسی۔
”سانولی رنگت، سنجیدہ، باوقار اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والا۔“
”واقعی......؟“
عروج لالہ کی طرف پلٹا۔
”شٹ اَپ......!“
لالہ بے ساختہ بولی۔
سب ہنسے تھے مگر عروج مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔
”جہاں تک سفید رنگت کا تعلق ہے، کل سے سارا دن دُھوپ میں بیٹھا کروں گا اور کوشش کروں گا کہ تھوڑے سے وقار صاحب بھی میرے اندر آجائیں۔ باقی رہی سنجیدگی کی بات تو یہ کام شادی کے بعد بیویاں بڑی خوب صورتی سے کرتی ہیں۔“
عروج کی بات پر ہنسی کا ایک طوفان اُٹھا تھا۔ لالہ تلملا کر رہ گئی تھی اور وہاں سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
”چلئے آصف بھائی......! بہت وقت ہوگیا۔“

”ارے ارے......!“
آصف ہنس کر بولے۔
”یہ سب مذاق تھا۔ تم سنجیدہ ہوگئیں۔ آؤ بیٹھو......!“
قبل اس کے کہ لالہ بیٹھتی، عروج بول پڑا۔
”یہ مذاق نہیں آصف......! حقیقت ہے۔ میں کل سے انشاء اللہ پہلا کام یہی کروں گا۔“
وہ لالہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔
دوسرے دن ان سب کی عروج کے گھر دعوت تھی۔ یہ لوگ وہاں چلے گئے۔
عروج جس طرح لالہ کے آگے پیچھے گھوم رہا تھا، اس نے لالہ کو اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ عروج کی حویلی چونکہ لالہ ایک بار پہلے بھی دیکھ چکی تھی، اس لئے کھانے کے بعد وہ خاموشی سے لان میں آگئی۔
اسے گلاب کے پھول بے حد پسند تھے۔ وہ آکر انہیں دیکھنے لگی۔ دل چاہتا تھا ایک بڑا سا گلدستہ بنا کر اپنے ساتھ لے جائے یا پھر بالوں میں سجا لے مگر اجنبی جگہ تھی۔ لالہ نے بالوں مین ہاتھ پھیرتے ہوئے حسرت سے پھولوں کی طرف دیکھا اور کسی نے بڑی پھرتی سے گلاب توڑ کر اس کے سامنے کر دیا تھا۔
لالہ حیرانگی سے پلٹی۔
عروج دُنیا بھر کا پیار لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ لالہ کو بہت غصہ آیا۔ جی چاہا، پھول نوچ کر پھینک دے مگر گلاب اس کی کمزوری تھے۔ صرف دانت پیس کر رہ گئی۔
”گلاب بہت پسند ہیں کیا......؟“
عروج نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”جی بہت زیادہ......!“

"اچھا......! اور کیا کیا پسند ہے......؟"

"آپ سے مطلب......؟"

لالہ کاٹنے کو دوڑی۔

"آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گی۔"

عروج نے دانستہ بات اُدھوری چھوڑ دی۔

"یہ چپکے چپکے کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں......؟"

سیمی اور عالیہ نے اچانک حملہ کیا۔ عروج نے مسکرا کر لالہ کی طرف دیکھا اور اندر چلا گیا۔ عروج کے جاتے ہی سیمی اور عالیہ نے اسے پکڑ لیا۔

"ہاں بھئی لالہ......! تم ذرا بتانا ہمارے سامنے نفرت، بعد میں محبت......؟ آخر چکر کیا ہے......؟"

"تمہارا سر......!"

کہتے ہوئے لالہ بھی اندر آ گئی۔

اگلے روز وہ سب تیار ہو کر نہر دیکھنے کا پروگرام بنا کر باہر آئیں تو آصف باہر اپنے چند دوستوں کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھے۔ یہ لوگ خاموشی سے قریب سے گزرنے لگیں تو پرویز عروج کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"آصف یار......! تمہاری سالی ابھی تک یہیں پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں......؟"

"کیوں......؟ آپ کو اعتراض ہے کوئی......؟"

لالہ تنک کر بولی۔

"یار پرویز......! کیوں اپنی شامت کو دعوت دیتے ہو۔ ان کا غصہ بہت تیز ہے۔"

عروج نے لالہ کو چڑایا۔

"تو کیا ہوا......؟"

پرویز لالہ کو غصہ دلاتے ہوئے بولا۔

"یہ اگر سالی صاحبہ ہیں تو ہم بھی آصف کے دوست ہیں۔"

لالہ کو غصہ تو بہت آیا مگر نہر پر جانا تھا، اس لئے خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

اسی شام لالہ کی کزنز واپس چلی گئیں۔ کیونکہ وہ اچھی طرح گھوم چکی تھیں۔

صبح لالہ کی آنکھ گلاب کی بھینی بھینی خوشبو سے کھلی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو سائیڈ ٹیبل پر گلاب کے پھولوں کا بڑا سا گلدستہ رکھا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر باہر آئی اور نوکر سے پوچھا۔

"یہ گلدستہ کون لایا......؟"

"جی......! بڑی حویلی سے آیا تھا۔"

اس کے بعد عروج باقاعدگی سے پھولوں کا گلدستہ بھیجنے لگا۔ اس دن وہ خود ہی گلدستہ لے کر آیا اور ایک پھول لالہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کیا خیال ہے......؟"

"شکریہ......!"

لالہ نے پھول لے کر میز پر رکھ دیا۔

"سنو لالہ......! مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اگر ساتھ چل سکو تو......؟"

لالہ بھی اس کی روز روز کی رومانی باتوں سے تنگ آ چکی تھی۔ اس لئے بولی۔

"چلئے......!"

دونوں کمرے سے نکلے تو ماما مل گئی۔

"ارے بھئی......! کہاں جا رہی ہو......؟"

"بھابی نے انہیں ناشتہ پر بلایا ہے۔"

عروج نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ لالہ کو لئے باغ کے ایک مخصوص حصے میں آ بیٹھا۔

"لالہ......! میرا خیال ہے تم اس بات سے بے خبر نہیں ہو گی کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ میں نے اپنی ساری تعلیم لاہور میں مکمل کی۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی مجھے ملی مگر ان میں کوئی میری منزل نہ تھی۔ ہاں تمہیں دیکھا تو مجھے لگا جیسے میری منزل سامنے آ گئی ہے۔ اب جبکہ بھیا اور بھابی میری شادی پر زور دے رہے ہیں، میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں تا کہ بھیا، بھابی تمہارے گھر آ سکیں۔"

لالہ نے بڑے تحمل سے اس کی باتیں سنیں اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم نے جواب نہیں دیا لالہ......!"

عروج بھی اُٹھ گیا۔

"سنو عروج......! پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے گاؤں کی زندگی پسند نہیں، اور دوسری بات یہ کہ تم بھی مجھے پسند نہیں۔"

"کوئی خاص وجہ......؟"

"میرے لئے تو خاص ہے۔ آپ کے لئے شاید نہ ہو......؟"

"پھر بھی اگر تم بتا دو تو میرے لئے اچھا ہو گا۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ میرا آئیڈیل سانولا، سنجیدہ اور باوقار سا مرد ہے جبکہ تم میں ایسی کوئی بات نہیں......!"

"ارے......!"

لالہ کی بات پر عروج قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"یہ تو کوئی بڑی بات نہیں......! میں سمجھا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔ جہاں تک رنگ کا تعلق ہے، اسے کالا کرنا میرے بس میں نہیں۔ البتہ اس بات کی پوری کوشش کروں گا کہ سنجیدہ بن سکوں۔"

عروج کو اس کی خواہش پر ہنسی آ رہی تھی۔

"دیکھئے عروج صاحب......!"

لالہ بالکل سنجیدہ تھی۔

"جس طرح آپ میں شوخی قدرت کی طرف سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اسی طرح میرا آئیڈیل بھی حساس اور سنجیدہ ہو گا۔ آپ کبھی سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم صرف اس لئے مجھے ٹھکرا رہی ہو کہ میرا رنگ سفید ہے اور میں قہقہے لگاتا ہوں۔"

"یہ بہت بڑی بات ہے۔"

لالہ نے کہا اور چلی آئی۔

آلوچے کے درختوں پر آخری بہار آ چکی تھی مگر تین چار دن سے عروج آصف کے ہاں نہیں آ رہا تھا جبکہ روزانہ ایک دو چکر لگانا اس کا معمول تھا۔

مالا کی جیٹھانی کا بھائی باہر سے آیا ہوا تھا۔ ان سب کی آصف کے یہاں دعوت تھی۔ اس لئے مالا اور اس کی جیٹھانی کام میں مصروف تھیں۔ لالہ کوئی ناول پڑھ رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک دیتے ہوئے عروج آ گیا۔

ہلکے گرین کلر کی شلوار سوٹ میں وہ بے حد جچ رہا تھا۔ لالہ مبہوت سی دیکھتی رہ گئی۔

"تم میرے آئیڈیل سے ملتے جلتے کیوں ہو......؟ اگر تم میرے آئیڈیل سے ملتے جلتے ہو تو کاش تم تھوڑے سنجیدہ ہوتے یا پھر تمہارا رنگ سانولہ ہوتا۔"

وہ سوچ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو......؟"

عروج اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ لالہ جھینپ گئی۔

"کچھ نہیں......!"

کہتے ہوئے اس نے رُخ موڑ لیا۔

"سنو لالہ......!"

عروج اس کے قریب چلا آیا۔

"میں نے تمہارے فیصلہ پر بہت غور کیا بہت سمجھنے کی کوشش کی مگر میں اسے سنجیدہ فیصلہ قرار نہیں دے سکتا۔ میری طرف دیکھو لالہ......!"

لالہ بات کاٹ کر چلائی۔

"جب بات اس دن ختم ہو گئی تھی۔ پھر آج یہاں کیا لینے آئے ہو......؟"

"اس لئے لالہ......! کہ مجھے تمہارا وہ فیصلہ منظور نہیں تم میری منزل ہو میں اپنی منزل سے دُور نہیں رہ سکتا۔ یہ آئیڈیل بنانا افسانوی باتیں ہیں۔ تمہارا آئیڈیل مجھ سے میری محبت نہیں چھین سکتا۔"

"تم سے میں نے تو نہیں کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرو......!"

"مگر لالہ......! میں تمہارے چھین جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر تم مجھے نہ ملیں تو میری زندگی سونی ہو جائے گی اور شاید میں زندگی سے بھی دُور چلا جاؤں۔"

"اس کی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔"

"خدا کے لئے لالہ......! مجھ سے میرا سکون، میری مسکراہٹیں مت چھینو......! ایسا نہ ہو زندگی کے کسی موڑ پر دوبارہ ملو تو اپنے جرم کی تلافی بھی نہ کر سکو۔"

"پلیز......! آئی سے گیٹ آؤٹ......!"

لالہ غصے سے پاگل ہو کر چلائی۔

"کیا ہوا......؟"

اسی وقت مالا کمرے میں داخل ہوئی۔ عروج نے کچھ کہنے کی بجائے ایک تڑپتی ہوئی نگاہ لالہ پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

پھر ایک ہفتہ سکون سے گزر گیا۔ عروج نہ آیا۔ کھانے کی میز پر لالہ آصف سے پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے......؟ آج کل عروج نظر نہیں آ رہا......؟"

"پہلے تو اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اب لالہ کے لئے شکار کرنے گیا ہے۔"

"میری باتوں کے باوجود تم شکار پر گئے ہو، وہ بھی میرے لئے......؟"

وہ سوچ رہی تھی۔

کھانا کھا کر وہ اس وقت برآمدے میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ جیپ رُکنے کی آواز آئی۔ لالہ نے پلٹ کر دیکھا۔ عروج شکاری لباس میں شکار والا تھیلا اُٹھائے جیپ سے اُتر رہا تھا۔ پھر وہ برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ لالہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم میرے آئیڈیل کے قلعے کو ڈھانے کیوں چلے آتے ہو......؟"

سوچتے ہوئے اس نے عروج کی طرف دیکھا۔ وہ شکار نوکر کو دے کر واپس جا رہا تھا۔ لالہ کو اپنی سخت توہین کا احساس ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ کل واپس چلی جائے گی۔ ورنہ یہاں رہ کر نہ اسے پا سکے گی اور نہ چھوڑ سکے گی۔

مالا نے اس کے واپس جانے کا سنا تو بولی۔

"کچھ دن اور رُک جاؤ......!"

"نہیں......! آپ آصف بھائی سے کہیں، وہ مجھے چھوڑ آئیں گے۔"

اس نے اپنے کپڑے بیگ میں رکھے اور آخری بار باغات کی سیر کرنے چلی آئی۔ ندی کی طرف آئی تو چونک پڑی۔

تھکن سے چور عروج سوئمنگ کر رہا تھا۔ لالہ کتنی دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر پلٹ آئی۔ اچانک اسے ایک چیخ سنائی دی۔ لالہ نے دیکھا گاؤں کی ایک لڑکی جانوروں میں گھری ہوئی تھی۔ پہلے تو لالہ ڈر گئی پھر لگی ''شی شی'' کرنے۔ مگر اس کی ''شی شی'' میں اتنی طاقت نہ تھی کہ جانور ڈر کے بھاگ سکیں۔ البتہ اتنا ضرور رہوا کہ وہ لڑکی کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکے۔ لالہ چیخ مار کر اُلٹے قدموں بھاگی تو سامنے عروج کھڑا تھا۔

''معلوم تو ہے کہ یہاں خوفناک قسم کے جانور پائے جاتے ہیں، پھر اکیلی کیوں آئی تھیں......؟''

وہ اجنبی لہجے میں بولا۔

''ٹھہرو......! میں آتا ہوں۔''

مگر وہ نہ ٹھہری۔ گھر آئی تو آصف اور مالا باتوں میں مصروف تھے۔ لالہ کو دیکھ کر دونوں خاموش ہوگئے بلکہ آصف اُٹھ کر چل دیئے۔

''سنو لالہ......!''

مالا اسے قریب بٹھاتی ہوئی بولی۔

''تم سے ایک بات پوچھ رہی ہوں۔ اچھی طرح سوچ کر جواب دینا۔ عروج تمہیں کیسا لگتا ہے......؟''

''بس......! اچھا ہے۔''

لالہ اس کا مطلب سمجھ گئی۔

''نہیں لالہ......! ٹھیک سے جواب دو......!''

''اگر آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے اور مجھے بھی اسے پسند کرنا چاہئے......؟ مگر افسوس میں ایسا نہیں کر سکتی۔''

''مگر لالہ......! عروج بہت اچھا ہے۔ ایسے لڑکے قسمت والوں کو

ملتے ہیں۔''

''باجی......! جب مجھے پسند نہیں تو پھر اس کے اچھا ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔''

اور مالا نے بھی اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

لالہ کا انکار سن کر آصف بولے۔

''عروج لالہ کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں خود لالہ سے بات کرتا ہوں۔''

''آصف بھائی......! آپ......؟''

لالہ انہیں دیکھ کر سمجھ گئی، وہ کیوں آئے ہیں......؟

''تم نے جو عروج کے بارے میں فیصلہ کیا ہے، وہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔''

آصف کسی تمہید کے بغیر بولے۔

''مجھے تم سے ایسی بات کرنی نہیں چاہئے کیونکہ تم میری سالی کم اور بہن زیادہ ہو۔ مگر پھر بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ عروج تم سے محبت کرتا ہے، تم نے اسے ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا۔''

''آپ سے یہ سب کس نے کہا......؟''

''تمہارے اور عروج کے درمیان جو باتیں ہوئیں، عروج نے ان کے بارے میں مجھے بتا دیا ہے۔ آئیڈیل بنانا کوئی اچھی بات نہیں۔ آئیڈیل مل بھی جائے تو اندر سے ایسا نہیں ہوتا جیسا انسان سوچتا ہے۔ ایسے آئیڈیل کا کیا فائدہ جس کی رنگت تو سانول ہو، سنجیدہ ہو مگر تم سے محبت نہ کرے۔ جبکہ عروج تم سے محبت کرتا ہے، تمہاری ہر بات اس کے لئے عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔''

''آپ سمجھتے کیوں نہیں آصف بھائی......؟ جب وہ مجھے پسند نہیں تو میں شادی کس طرح کر سکتی ہوں......؟ آپ کے کہنے پر اگر میں شادی کر

بھی لوں تو ایک ناپسندیدہ ہستی کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا مشکل کام ہے، آپ جانتے ہیں......؟''

''مگر لالہ......! یہ سب اس وقت تک ہے جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی۔ شادی کے بعد اس کی محبت اسے تمہاری پسند بننے پر مجبور کر دے گی۔ وہ بہت لاڈ پیار میں پلا بڑھا ہے۔ اگر تم اس کو نہ ملیں تو یہ صدمہ اس کی زندگی ختم کر سکتا ہے۔''

''اُف......! آصف بھائی......! آپ کو اپنے دوست کا خیال ہے، میرا نہیں......؟ کچھ نہیں ہوگا آپ کے دوست کو، لیکن میری زندگی بے سکون ہو جائے گی۔''

لالہ رونے لگی۔

''ٹھیک ہے لالہ......! جیسے تمہاری مرضی......!''

آصف پشیمان سے باہر چلے گئے۔

آصف، لالہ کی ضد سے مجبور ہو کر اسے لاہور لے کر آ گئے۔ وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ عروج کے بارے میں لالہ کے والد سے بات کریں گے۔ مگر وہ گھر پر موجود نہ تھیں۔ چونکہ وہ خود بھی جلدی میں تھے اس لئے جلد واپس آ گئے۔

لالہ کو لاہور اتنے دن ہو گئے تھے۔ وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ جیسے وہ بھی عروج کو پسند کرنے لگی ہو۔ رات دن عروج کا خیال رہتا۔

اس وقت بھی وہ عروج کی یاد میں گم سم سی بیٹھی تھی کہ سیمی آ گئی اور اپنی سالگرہ کا کارڈ دیتے ہوئے بولی۔

''کیا خیال ہے، ایک کارڈ عروج کو بھی بھیج دوں......؟''

''بکواس نہیں کرو......!''

لالہ نے کہا مگر لہجے میں دم نہیں تھا۔

سیمی کی سالگرہ میں صرف خاندان کی لڑکیاں اور لڑکے موجود تھے۔

ہ باتوں میں مصروف تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک ہستی پر پڑی جو یوں
وں سے اس کے آئیڈیل کے روپ میں اس کے قریب تھا، مگر حقیقت
ں بہت دُور۔

''سیمی......! وہ کون ہے......؟''

وہ ضبط نہ کر سکی اور پوچھ بیٹھی۔

''ارے......! وہ وقار بھائی کے دوست ہیں۔''

''اچھا......!''

لالہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ کیک کاٹنے کا ہنگامہ شروع ہوا مگر لالہ کا آئیڈیل ایک طرف خاموش بیٹھا رہا۔ لالہ خود ہی پلیٹ میں کیک ال کر اس کے قریب چلی آئی۔

''یہ لیجئے......!''

لالہ نے مسکرا کر کہا۔

''شکریہ......!''

اس نے پلیٹ تھام لی۔

''آپ بھی لیجئے ناں......!''

اور لالہ نے مسکراتے ہوئے ایک پیس اُٹھا لیا۔ باتوں ہی باتوں ں لالہ نے سب کچھ پوچھ لیا۔

اس کی تعلیم بی اے تھی اور اب بزنس کرتا تھا۔ لالہ جب کوئی بات پوچھتی وہ بڑے دھیمے لہجے میں جواب دیتا۔ لالہ کھلکھلا کر ہنس دی مگر وہ ھیمے انداز میں مسکرا دیا۔ وہ چلا گیا اور لالہ اس کا خیال لئے گھر چلی آئی۔ عروج کا پریشان چہرہ دل سے نکل گیا اور نعیم دل و دماغ پر چھا گیا۔

جب بہت دن گزر گئے تو لالہ ملاقات کے طریقے سوچنے لگی۔ یسے میں سیمی اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

''لالہ......! اس دن جو لڑکا میری سالگرہ میں موجود تھا ناں......؟''

''کیوں......؟ کیا ہوا اسے......؟''

لالہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''اسے کچھ نہیں ہوا، البتہ اس نے تمہیں پرپوز کیا ہے۔''

''بکواس مت کرو......! اس نے اگر مجھے پسند کیا تو اس میں میرا کیا قصور......؟''

اور پھر جھٹ پٹ سب کام ہوگئے اور مالا کو بھی اطلاع دے دی کہ وہ آکر لڑکا دیکھ لے تاکہ منگنی کی رسم ادا ہو جائے۔

''آصف بھائی......! مجھے میرا آئیڈیل مل گیا۔''

لالہ نے کہا تو آصف اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''اچھا......! خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو......!''

منگنی کی بجائے ان لوگوں نے شادی پر زور دیا اور تیاریاں شروع ہوگئیں۔ مالا کو ان لوگوں نے روک لیا اور آصف واپس چلے گئے۔

''آصف......! لالہ کیسی ہے......؟''

راستے میں عروج مل گیا۔ آصف نے بھی کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور سب کچھ بتا دیا تاکہ یہ اس بے وفا کے غم میں پاگل نہ ہو جائے۔

آخر شادی والا دن آ پہنچا۔ لالہ کو اپنوں سے بچھڑنے کا غم کم اور نعیم سے ملنے کی خوشی زیادہ تھی اور پھر ولیمہ کے روز ہی وہ اور نعیم ہنی مون کے لئے ملک سے باہر چلے گئے۔

لالہ گئی تو ہنی مون کے لئے تھی مگر نعیم کے بزنس کی وجہ سے ٹور لمبا ہوگیا۔ البتہ گھر والوں کو وہ خط ضرور لکھتی۔ خاص کر مالا کے خطوں میں وہ اپنی مطمئن خوش گوار اور بھرپور زندگی کا ذکر ضرور کرتی اور آصف کہتے۔

''وہ صرف عروج کو ایسی باتیں بتانے کے لئے لکھتی ہے۔''

لالہ کو گئے دس مہینے ہوگئے تو اس کا خط ملا کہ وہ چند دنوں میں پاکستان پہنچ رہی ہے۔ انہی دنوں خدا نے مالا کو بیٹے سے نوازا۔

پھر لالہ اچانک واپس آگئی، نعیم کے ساتھ۔ ماں باپ کے ہاں آئی تو پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

''ارے لالہ......! یہ تمہیں کیا ہوا......؟''

بھابی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔

''میں ٹھیک ہوں......!''

لالہ نے نعیم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ تم لالہ کو کیا کر کے لے آئے ہو......؟''

بھابی نے نعیم کے تندرست چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا جو پہلے سے کہیں زیادہ پرکشش نظر آ رہا تھا۔

''میں کیا عرض کروں......؟''

نعیم نے ہنس کر کہا۔

''لگتا ہے ملک ملک گھومنا راس نہیں آیا......؟''

''ہائیں......؟ لوگ باہر جاتے ہیں تو موٹے ہو کر آتے ہیں، تم پہلے سے بھی کمزور ہوگئی ہو......؟''

ماں نے لالہ کو تشویش سے دیکھا۔

''بس امی......! طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ آپ بتائیں، مالا باجی کیسی ہیں......؟''

''ارے ہاں......!''

بھابی چونک کر بولی۔

''مالا کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔''

''کب......؟''

لالہ نے خوشی سے پوچھا۔

''ابھی تو صرف ایک ماہ کا ہوا ہے۔ تم دیکھنے نہیں جاؤ گی......؟''

''میں......؟''

لالہ سوچ میں پڑ گئی۔

"یہاں آئیں گی تو دیکھ لوں گی......!"

"مگر نہ جانے کی وجہ......؟"

بھابی غور سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی تو لالہ نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"بس......! یوں ہی۔"

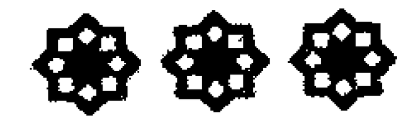
اور پھر رات کو ہی نعیم کے ساتھ چلی گئی۔ سب نے رُکنے کا کہا مگر وہ نہ رُکی۔

"کیا بات ہے......؟ تم یوں منہ بنا کر سب سے ملی ہو جیسے میں نے تمہیں بہت دُکھی رکھا ہو......؟ کیا سوچتے ہوں گے وہ لوگ میرے بارے میں......؟"

نعیم نے خفگی سے کہا۔ لالہ نے اسے دیکھا مگر خاموش رہی۔

"آخر کیا وجہ ہے......؟ تم خاموش کیوں رہتی ہو......؟"

نعیم نے پھر پوچھا تو لالہ کو نعیم کی باتیں یاد آگئیں جو اس نے شادی کے پہلے ہی دن کہی تھیں۔ جب وہ دل میں ہزاروں ارمان لئے اپنے اس آئیڈیل کا انتظار کر رہی تھی جو اسے اچھے وقت میں مل گیا تھا ورنہ اس کو خدشہ تھا کہ اگر نعیم کچھ عرصہ بعد اس کی زندگی میں آتا تو شاید آصف بھائی امی سے بات کر کے زبردستی اسے عروج کی بنا چکے ہوتے۔



وہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ لالہ نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اپنے محبوب کو دیکھا۔ وہ ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ لئے باوقار انداز میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لالہ نے شرما کر گھونگھٹ کچھ اور لمبا کر لیا۔

"آداب پیش کرتا ہوں......!"

کہتے ہوئے نعیم نے ڈائمنڈ سیٹ پیش کیا اور گھونگھٹ اُلٹا دیا۔

لالہ کو محسوس ہوا جیسے کائنات کی ساری خوشیاں اس کے گرد سمٹ آئی ہوں۔ اس نے شرما کر سر جھکانا چاہا مگر نعیم بولا۔

"میں تمہیں روایتی دُلہنوں کے رُوپ میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ جتنا شرما چکی ہو، اتنا ہی کافی ہے۔"

لالہ کو یوں محسوس ہوا جیسے نعیم کے اوپر کوئی خول ہو، جو آہستہ آہستہ سرک رہا ہو۔

اور جب باتوں ہی باتوں میں نعیم نے کہا۔

"وقار نے بتایا تھا کہ تمہیں سنجیدہ مرد پسند ہیں۔ سانولہ تو خیر میں پہلے سے تھا۔ سنجیدہ بننے کے لئے مجھے تھوڑی سی ایکٹنگ کرنی پڑی۔ تیر ٹھیک نشانے پر لگا۔ میں نے محسوس کیا تمہاری نگاہیں میرے تعاقب میں ہیں۔ یقین کرو لالہ......! تم میری پسند ہو۔ میری چاہت ہو۔ میں کوشش کروں گا تمہیں زندگی میں کبھی کوئی دُکھ نہ دوں۔"

نعیم کہہ رہا تھا مگر لالہ یہاں کب تھی......؟ وہ سوچ رہی تھی۔

"خواب یوں بھی بکھرتے ہیں......؟ میں نے کیا سوچا اور یہ کیا نکلا......؟"

اور دل جیسے تڑپ گیا۔

"عروج......!"

لالہ کے سینے سے آہ نکلی مگر پھر وہ کچھ اور نہ سوچ سکی۔ لالہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار چکی ہے۔



"لالہ......! لالہ......!"

نعیم زور زور سے آوازیں دیتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور لالہ اپنے اس آئیڈیل کو یاد کرنے لگی جو دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔

"آخر تم ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہو......؟"

اسے خاموش دیکھ کر نعیم کو غصہ آ گیا۔

"کیا بات ہے......؟"

لالہ اس کے ہاتھ سے کوٹ لیتے ہوئے بولی۔

"شام کو تیار رہنا......! کلب میں پارٹی ہے۔"

"مگر نعیم......! میں کبھی کلب نہیں گئی۔"

"ٹھیک ہے......! پھر کبھی نہیں جانا، یہ پارٹی ہماری شادی کی خوشی میں دی جا رہی ہے۔ تمہیں پتہ ہے، شادی کے دوسرے دن ہی ہم ہنی مون کے لئے چلے گئے تھے۔"

لالہ کلب تو آ گئی تھی مگر اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہ کر سکی۔ وہ ایک دن کے لئے اوور ایکٹنگ کر سکتی تھی۔ عمر بھر کے لئے نہیں۔ واپسی پر نعیم اس پر برس رہا تھا۔

"یہ تم ہر وقت رونی صورت بنا کر کیوں رکھتی ہو......؟ خواہ مخواہ دوسروں کے سامنے مجھے نشانہ بناتی ہو۔ کیا دُکھ ہے تمہیں......؟ آخر مجھے بھی تو پتہ چلے......؟"

لالہ جو بہت عرصہ سے سب کچھ برداشت کر رہی تھی، اب برداشت نہ کر سکی۔

"میں اگر چاہوں بھی تو اب کیا ہو سکتا ہے......؟ میں نے جب پہلی بار آپ کو دیکھا تو آپ بہت سنجیدہ اور باوقار لگ رہے تھے۔ آپ میں مجھے میرا آئیڈیل نظر آیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے جب شادی کا پیغام بھیجا تو میں انکار نہ کر سکی۔ مگر افسوس......! آپ وہ نہ نکلے۔ کاش میں یہ سب کچھ پہلے جانتی۔"

"اب تو جان چکی ہو......!"

وہ چیخ کر بولا۔

"میں اپنے دوستوں کے حلقے میں ایک زندہ دل آدمی کے طور پر مشہور ہوں۔ جس محفل میں چلا جاؤں، وہ زعفران زار بن جاتی ہے۔ تمہارے لئے میں سنجیدگی اختیار نہیں کر سکتا۔ میرا ساتھ دینا ہے تو ٹھیک سے رہو......!"

نعیم نے کہا۔

دن اُداس اُداس گزر رہے تھے۔ نعیم بہت کم لالہ سے بات کرتا۔ ایسے میں مالا اور آصف اپنے بچے کے ساتھ چلے آئے۔

"لالہ......! میری جان......! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے......؟"

مالا اس کی گرتی ہوئی صحت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"بس......! یوں ہی۔"

لالہ اس کی گود سے بچہ لے کر بولی۔ آصف غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"آپ بیٹھیے ناں آصف بھائی......!"

لالہ اس طرح ان کے دیکھنے پر گھبرا گئی۔

"نعیم کی سناؤ......!"

مالا پوچھ رہی تھی اور لالہ ہنس ہنس کر اس کی تعریف کر رہی تھی مگر جب وہ دوپہر کے کھانے پر نہ آیا تو مالا کو حیرت ہوئی۔

"نعیم گھر کھانا نہیں کھاتا......؟"

مالا نے پوچھا تو لالہ بولی۔

"آج ہی نہیں آئے ورنہ روز آتے ہیں۔"

آصف بہت کم بات کر رہے تھے۔ لالہ نے اس بات کو محسوس کیا اور پوچھا۔

"آصف بھائی......! کیا بات ہے......؟ آپ بہت خاموش ہیں۔"

"یوں ہی......!"

آصف مسکرائے۔

"یہ تمہارے نعیم صاحب گھر کس وقت آتے ہیں......؟"

لالہ کا رنگ یک دم پیلا پڑ گیا۔ وہ جواب دینا چاہتی تھی کہ نعیم کی گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی۔ لالہ اسے دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔

"کیوں بھئی نعیم......! تم ہماری لالہ کا خیال نہیں رکھتے......؟ کتنی کمزور ہو رہی ہے۔"

"آصف بھائی......! خیال تو بہت رکھتا ہوں۔ لالہ میری اپنی پسند ہے۔ اصل میں وطن آ کر کچھ مصروف ہوگیا ہوں۔ ویسے بھی نئے مہمان کی آمد تک ان کی صحت ایسی ہی رہے گی۔"

"نعیم......! تم کچھ زیادہ ہی مصروف لگتے ہو......؟ ایسی حالت میں تمہیں زیادہ وقت لالہ کے ساتھ گزارنا چاہیے۔"

مالا نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے نعیم کو ڈانٹا۔

"کیوں نہیں......؟"

نعیم نے مسکرا کر کہا مگر لالہ خاموش رہی۔

چائے پیتے ہی وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لالہ نے روکنا چاہا تو مالا کہنے لگی۔

"خود تو گھر ملنے تک نہیں آئی، روک کس منہ سے رہی ہو......؟"

لالہ نے ان کی طرف دیکھا مگر خاموش رہی۔

"سنو......!"

جاتے جاتے آصف بھائی رُک کر بولے۔

"لالہ......! زیادہ سوچا نہیں کرتے۔ یہ راستہ تم نے خود چنا تھا۔

اپنی صحت کا خیال رکھنا۔"

وہ لوگ چلے گئے۔

کچھ دن نعیم کا رویّہ ٹھیک رہا اور لالہ نے سوچا۔

"یوں ہی سہی......! اب زندگی ہی تو گزارنی ہے۔"

مگر اچانک نعیم پھر اپنی پرانی روش پر لوٹ گیا۔ خرم (بھانجا) کے عقیقے سے ٹھیک دو دن پہلے وہ اپنی سیکرٹری کے ساتھ کراچی چلا گیا۔ لالہ نے روکا تو بولا۔

"عقیقہ والے روز لوٹ آؤں گا۔"

عقیقے کا دن آگیا۔ مگر نعیم نہ آیا۔ اس نے اکیلے جانے کا فیصلہ کیا۔ رچہ عروج کی وجہ سے جانا نہیں چاہتی تھی مگر پھر اس نے سوچا۔

"عروج مجھے بھول چکا ہوگا۔ اس کی وجہ سے میں کیوں اپنی بہن ا خوشیاں مس کروں......؟"

لالہ جب اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتی ہوئی وہاں پہنچی تو نہ جانے وں ہر طرف عروج ہی عروج نظر آنے لگا۔ لالہ نہ گاڑی روک کر سر ٹرنگ پر ٹکا دیا اور پھر آصف کی آواز سن کر چونک پڑی۔

"ارے......! تم اکیلی آئی ہو......؟"

لالہ نے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا اور بولی۔

"آصف بھائی......! وہ ضروری کام سے کراچی گئے ہوئے ہیں۔"

"اچھا......!"

آصف جانتے تھے اگر اس نے کچھ اور پوچھا تو لالہ رو دے گی۔ لئے خاموش رہے۔ لالہ جب ان کے ساتھ اندر آئی تو مالا اور بھابی بھی نعیم کے بارے میں پوچھا۔ لالہ نے ان سب کو بھی مطمئن کر دیا مگر کو مطمئن نہ کر سکی۔

لالہ کے چہرے کو دیکھ کر ان کے اپنے انتخاب پر افسوس ہوا۔ پھر

وہ لوگ برآمدے میں آگئے جہاں خوب صورت انداز میں کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ لالہ تھکے تھکے سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی اور ایسے میں اس کی زندگی کا نازک لمحہ آگیا۔ دل اندر سے چیخ اُٹھا۔

''دیکھو تمہارا آئیڈل......؟''

لالہ نے اس ہستی کو پہچانا نہیں تھا اور جب پہچانا تو اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ گئی۔

وہ عروج ہی تھا۔ لائٹ بلیو شلوار سوٹ میں خرم کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے مالا کو مبارک باد دے رہا تھا اور لالہ کے ذہن میں اس کی بازگشت گونج رہی تھی۔

''لالہ......! مجھ سے میرا سکون میری مسکراہٹیں مت چھینو......!''

لالہ نے گھبرا کر پھر اس کی طرف دیکھا۔ لالہ کی دُوری نے اس کی زندہ دلی اور شوخی چھین لی تھی۔ اس کی سیب جیسی سرخ اور سفید رنگت ہجر کی دُھوپ میں سانولی ہو چکی تھی۔

دُکھ انسان کو اندر ہی اندر اس طرح ختم کر دیتے ہیں، اس کی مثال عروج اس کے سامنے تھا۔ اس کے چہرے پر صدیوں کی سنجیدگی طاری تھی۔ یوں جیسے جنم جنم سے دُکھوں کا بار اُٹھائے سنجیدہ چلا آ رہا ہو۔ لالہ نے اسے آواز سے پہچانا تھا۔ مالا سے بات ختم کر کے وہ لالہ کی طرف پلٹا۔

''کیسی ہو لالہ......؟''

لالہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی پھر جواب دینے کی بجائے

''نہیں نہیں......!''

کرتے ہوئے اس کمرے کی طرف بھاگ گئی جس میں اس نے کبھی خوشی سے بھرپور دن گزارے تھے۔ مالا فوراً اس کے پیچھے آئی۔ عروج بھی آیا مگر باہر دروازے پر رُک گیا۔

مالا جب کمرے میں داخل ہوئی تو لالہ اپنے گلے کو مسلتے ہوئے رو

رہی تھی۔ مالا کو اس پر ترس آنے کی بجائے غصہ آیا جس نے پہلے تو عروج کو زندگی سے دُور کر دیا، اب وہ اگر تھوڑا نارمل ہوا تو پھر اس کے سامنے ڈرامہ کرنے لگی تھی۔

''لالہ......!''

انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم نے خود اپنے لئے سب کچھ کیا ہے تو اب کیوں روتی ہو......؟''

''باجی......! یہ عروج تھا......؟ وہی عروج......؟''

لالہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں......! یہ وہی عروج ہے، مگر اب تمہارے رونے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا......؟''

وہ سسک پڑی۔

''نعیم کو میری پرواہ نہیں اور عروج میری یاد میں زندگی سے دُور ہو رہا ہے۔ میں طلاق لے لوں گی...... ہاں ہاں......! میں طلاق لے لوں گی اس سے......!''

وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑائی۔

''اپنے جرم کی تلافی کروں گی......!''

''بکواس مت کرو......!''

مالا کو غصہ آگیا۔

''تم اس کے بچے کی ماں بننے والی ہو۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب میں کہتی تھی کہ عروج اچھا لڑکا ہے، اس وقت تم اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھیں۔''

عروج نے اتنا ہی سنا اور واپس پلٹ گیا اور آصف، مالا کو تلاش

کرتے ہوئے اندر آئے۔

”اب کیا ہوا......؟“

انہوں نے پوچھا تو مالا سب کچھ بتاتے ہوئے بولی۔

”اب ہوش آیا ہے بیچاری کو ......؟ کسی کی زندگی تباہ کر کے......؟“

”تم کچھ مت کہو......! باہر جاؤ......! مہمان تمہارا پوچھ رہے ہیں۔“

مالا باہر چلی گئی تو آصف اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”ہمت سے کام لو لالہ......!“

”آصف بھائی......!“

لالہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آپ میرے بڑے تھے، مجھے زبردستی عروج سے شادی پر راضی کر سکتے تھے۔ مگر آپ نے بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا......؟“

”لالہ......! بڑے اگر اپنی مرضی کریں، تب بھی مجرم اور اگر اولاد کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیں، تب بھی مجرم......! تم اس وقت ہمیں مجرم کہہ رہی ہو......؟ اب پتہ چلا، بڑے جو بھی کرتے ہیں، سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ بڑے آخر بڑے ہی ہوتے ہیں۔

خیر......! اب سب کچھ بھول جاؤ......! اب تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ نعیم سے میں بات کروں گا۔ اسے سمجھاؤں گا۔ اس وقت تم باہر چلو......! لوگ کیا سوچیں گے......؟“

لالہ خاموشی سے اس کے ساتھ باہر آگئی۔

سارا دن گزر گیا مگر پھر عروج لالہ کے سامنے نہ آیا۔ سب مہمان رُخصت ہوگئے تھے۔ بس خاص خاص رہ گئے تھے۔ بڑے ایک طرف تھے اور چھوٹے ایک طرف۔ لالہ گم سم سی بیٹھی تھی کہ پرویز اور عروج بھی

آ گئے۔

عروج سنجیدگی سے لالہ کو دیکھ رہا تھا جو آنکھوں میں آنے والے آنسو پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ عروج کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”لالہ......! تم نے بہت دیر کی ہوش میں آنے میں......؟“

عروج نے سچا اور جانے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت نعیم کمرے ں داخل ہوا۔

”یہ تمہارا آنے کا وقت ہے......؟“

مالا نے تلخی سے پوچھا۔

”معاف کریں آپی......! کام بہت ضروری تھا۔ اس کے باوجود پ کے خیال سے آگیا ہوں۔“

”بہت شکریہ......!“

آصف مسکرائے اور عروج سے اس کا تعارف کروایا۔ نعیم نے ہاتھ ایا اور لالہ کے پاس آگیا۔

”معاف کرنا لالہ......! بات ہی ایسی تھی۔ میں تمہیں اطلاع نہ کر کا۔“

لالہ نے کچھ نہ کہا۔ وہ عروج کو دیکھ رہی تھی جو آصف کے روکنے کے باوجود چلا گیا تھا۔

وہ رات ان لوگوں نے وہیں بسر کی۔ صبح نعیم کے اُٹھنے سے پہلے لہ باغات میں چلی آئی۔ پیاسی نظریں عروج کی تلاش میں تھیں، آخر وہ مل لیا۔

”تم آج پھر اکیلی ہو......؟“

عروج نے نارمل انداز میں پوچھا۔ لالہ کے جی میں آیا کہ کہہ ے۔

"میں شاید ہمیشہ اکیلی رہوں۔"

مگر بولی۔

"وہ سو رہے تھے، اس لئے میں چلی آئی۔"

"اچھا......!"

عروج نے دُکھ سے اسے دیکھا جو اپنی ہی ضد کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

"ایک بات کہوں، مانو گے......؟"

لالہ نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کہو......!"

"تم شادی کر لو......!"

عروج نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جی میں آیا کہ پوچھے۔

"ہر لڑکی بے وفائی کے بعد محبوب کو شادی کا مشورہ کیوں دیتی ہے......؟ کیا اس طرح وہ اپنے جرم کی تلافی کرنا چاہتی ہے......؟"

مگر وہ لالہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ لالہ کے غم کی داستان جو سن چکا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"کوشش کروں گا لالہ......!"

"وعدہ......؟"

لالہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

عروج کھوئی کھوئی نظروں سے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"پتہ نہیں وعدہ ہے کہ نہیں......!"

اور واپس پلٹ گیا۔

آصف نے نعیم کو پتہ نہیں کیا کیا سمجھایا تھا......؟ جب وہ رُخصت ہوئے تو نعیم کا موڈ خوش گوار تھا۔ گاڑی جب عروج کے گھر کے قریب پہنچی

تو لالہ نے دیکھا، عروج گیٹ میں کھڑا تھا۔ لالہ کی آنکھیں ضبط کے باوجود آنسوؤں سے بھر گئیں۔

عروج اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر دُکھی ہو گیا۔

"جاؤ لالہ......! جہاں بھی رہو، خوش رہو......! خدا میری خوشیاں بھی تمہاری جھولی میں ڈال دے۔"

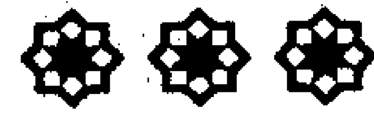
اس نے سچے دل سے دُعا دی۔

لالہ نے عروج کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں میں ندامت، پشیمانی تھی۔

"عروج......! میں اس بات کو کبھی فراموش نہیں کروں گی کہ میں نے تمہیں اپنی نا سمجھی، نادانی، کم عقلی اور کم عمری کی وجہ سے کھو دیا۔ میرے اس جرم کی سزا تو مجھے ساری زندگی ملے گی مگر میرے محبوب......! خدا تمہاری زندگی خوشیوں سے بھر دے۔"

اس کی ہر خوشی چھین کر اب وہ اسے زندگی کی دُعا دے رہی تھی۔

گاڑی کا موڑ مُڑنے سے پہلے اس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا، مگر گاڑی کے پیچھے اُڑتی ہوئی دُھول کے سوا کچھ نظر نہ آ سکا۔



ایک ہی راستہ

رضیہ اور رمضان کے محلّہ چھوڑ جانے کی قصے کہانیاں خدا خدا کر کے اب ختم ہونے میں آ رہی تھیں کہ محلے کی عورتوں کے ہاتھوں ایک نیا قصہ آ گیا تھا۔ اور یہ قصہ رضیہ کے چھوڑے ہوئے گھر میں آنے والے نئے مالک مکان کے بارے میں تھا۔ رضیہ اور رمضان اس محلے میں پچیس برس رہے تھے اور پھر اچانک جب خدا نے ان کی سن لی تھی تو وہ لوگ یہ محلّہ اور یہ مکان چھوڑ کر چلے گئے۔

رمضان ایک معمولی سبزی فروش تھا اور رضیہ معمولی پڑھی لکھی غریب میکے اور غریب سسرال کی عام سی لڑکی تھی۔ وہ اپنی سسرال سے علیحدگی کر کے اس محلے میں آن بسی تھی۔

میاں بھی اسے ماں باپ سے نکال کر لے تو آیا تھا مگر سختی بہت کرتا تھا۔ خرچ بہت کنجوسی سے دیتا، اگرچہ سبزی کی ذاتی دُکان تھی مگر سبزی بھی کبھی وہ تازی گھر میں نہ دیتا تھا۔

رضیہ محلے کی عورتوں سے مانگ تانگ کر اپنا گزارہ کرتی۔ مگر رمضان کو کوئی پرواہ نہ تھی۔ رضیہ جس بات پر بہت زیادہ خوش ہوتی وہ تھے،

اس کے پانچ بیٹے، جن کو سات سات برس کی عمر کو پہنچتے ہی پہلے کو ویلڈنگ پر، دوسرے کو ورکشاپ میں، تیسرے کو درزی کی دُکان پر، چوتھے کو بجلی کا کام سکھانے پر ڈال دیا گیا تھا۔ البتہ پانچویں کے بارے میں رضیہ کا خیال تھا کہ اسے وہ پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنائے گی۔

یہی وجہ تھی کہ بچے کو اس نے پانچ سال کی عمر کو پہنچتے ہی اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک کلاس میں وہ دو دو سال لگا رہا تھا اور کام سیکھنے والے بچے کام کے ساتھ ساتھ پیسے بھی لانے لگے تھے۔

پھر اچانک قسمت نے کروٹ لی۔ رضیہ کے دونوں بڑے بیٹے موٹر میکنک اور ویلڈر بن کر دبئ چلے گئے۔

پھر تو رضیہ کے گھر کا نقشہ بدلنے لگا۔ پہلے ٹوٹا پھوٹا مکان مرمت کرایا گیا۔ پھر گھر میں فریج آیا، ٹی وی آیا، واشنگ مشین آئی، ائر کنڈیشنر آیا۔ دو سال ہی میں رضیہ اپنی اصلیت بھول گئی۔

اب تو وہ گھر سے باہر آ کر محلے کی کسی عورت کے پاس بیٹھنا بھی پسند نہ کرتی۔ پیراشوٹ نما برقعہ جو وہ ہمیشہ سے پہنتی آئی تھی، اسے اُتار کر اب وہ بوسکی کی چادر اوڑھنے لگی تھی۔ محلے کی عورتیں اس کے منہ پر تو کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں مگر جب وہ نہ ہوتی تو خوب دل کی بھڑاس نکالتیں۔

پھر ایک دن جب محلے کی سب عورتیں حسب معمول بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ رضیہ پاس سے گزری تو نہ جانے کیا سوچ کر رُک گئی۔

''بھئی رضیہ......! تم تو عید کا چاند ہو گئیں۔''

زیبو کی ماں نے بات چیت کا آغاز کیا۔

رضیہ تھوڑا سا مسکرائی اور نخوت سے بولی۔

''کیا کروں......؟ گرمی بہت ہے۔ ایک منٹ کے لئے بھی ائیر کنڈیشنڈ کمرے سے نکلوں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔''

سب کے جی میں آیا کہیں کہ ائیر کنڈیشنر کو تو دو سال ہوئے

ہیں۔ پہلے کہاں تھیں تم......؟ مگر وہ سب چپ رہیں البتہ رضیہ خود ہی اپنی چوڑیوں والی کلائی خواہ مخواہ اِدھر اُدھر لہراتی ہوئی بولی۔

''یہ محلّہ اس قابل تو نہیں کہ یہاں رہا جائے۔ میں تو رمضان سے کہہ رہی ہوں، گلبرگ میں یا پھر شادمان ٹاؤن میں کنال دو کنال کی کوئی اچھی سی کوٹھی دیکھئے۔ اس محلے میں تو گندگی بہت ہے۔''

وہ بات ختم کرتے ہی چلی گئی اور محلے کی عورتیں اس کی ذہنیت پر افسوس کرنے لگیں۔ انہیں بہت رنج تھا کہ محض دولت آنے کی وجہ سے ایک اچھی خاصی دوست ان سے جدا ہوگئی تھی۔

پھر کچھ دنوں بعد ہی ان لوگوں نے سنا کہ رمضان نے مکان فروخت کر دیا ہے اور وہ سب یہاں سے ہمیشہ کے لئے رُخصت ہوگئے۔ جاتے ہوئے رضیہ نے کسی سے ملنا بھی گوارہ نہ کیا تھا۔

رضیہ تو چلی گئی مگر محلے والوں کے پاس باتیں چھوڑ گئی۔ جب چند عورتیں جمع ہوتیں، موضوع رضیہ کی ہی ذات ہوتی۔ اس طرح تین ماہ گزر گئے۔ مکان نہ جانے کن لوگوں کے ہاتھ فروخت کیا تھا......؟ ابھی تک یوں ہی ویران پڑا تھا۔ دو کمروں کا یہ مکان جس میں بیٹھک بھی نہیں تھی، تین ماہ سے ویران پڑا تھا۔ اسے کوئی ایک نظر دیکھنے بھی نہ آیا تھا۔

تب ایک دن اچانک جب رات کو کھانے سے فارغ ہو کر سب عورتیں اکٹھا ہو کر بیٹھیں، تو بات چیت کا وہی پرانا موضوع تھا کہ کس کی ساس ظالم ہے، کسی کی بہو، کسی کا بیٹا آوارہ نکلا ہے اور کسی کی بیٹی تاک جھانک کرتی ہے۔

اچانک سامان سے لدے ہوئے دو تانگے رضیہ والے گھر کے دروازے پر آ کر رُکے اور ان میں سے دو عورتیں سب سے پہلے اُتریں۔ دونوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں، وہ دونوں ان کے قریب سے گزر کر رضیہ کے گھر میں چلی گئیں۔ یہ تھے نئے مالک مکان۔

نئے مالک مکان کو آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ مگر نہ ان کے گھر سے کوئی محلے میں آیا تھا اور نہ ہی محلے میں سے کوئی ان کے گھر گیا تھا۔ یوں ہی پندرہ بیس دن گزر گئے اور زیبو کی ماں جسے اس قسم کی باتوں میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی تھی، بولی۔

''ارے...... کیسی بد اخلاق عورت آئی ہے، نہ کسی کو اپنے گھر بلایا ہے، اور نہ کسی کے گھر آئی ہے۔ یہ تو رضیہ سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ ابھی سے ہی محلے والوں پر رُعب ڈالنا چاہتی ہے۔''

''پتہ نہیں گھر کے افراد کتنے ہیں......؟ میں نے تو صرف لڑکوں کو اور ان کے باپ کو دیکھا ہے۔''

حلیمہ نے کہا تو نمو کی ماں بولی۔

''بھئی......! وہ نئی نئی آئی ہے۔ جھجکتی ہوگی۔ ہمیں خود اس کے گھر جانا چاہئے اور ایسا کرنا کوئی برا بھی نہیں ہے۔''

''پر جائے کون......؟''

شیدے کی ماں بولی۔

''سب ہی مل کر چلتے ہیں......!''

وحید کی ماں نے کچھ سوچ کر کہا۔

''میرے خیال میں سب لوگوں کا جانا کچھ غیر مناسب ہے۔ پہلے کسی ایک کو جانا چاہئے، تاکہ پتہ چل سکے کہ کیسے مزاج کی عورت ہے......؟ ایسا نہ ہو کہ تم سب غول کی طرح جاؤ اور وہ گھبرا جائے۔''

حلیمہ نے بہت سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

''اچھا تو پھر ٹھیک ہے......! زیبو کی ماں کا گھر سامنے ہے۔ زیبو کی ماں ہی جائے......!''

اس بات پر سب متفق ہوگئیں اور زیبو کی ماں اپنے گھر چلی گئی تاکہ گندے کپڑے اُتار کر کچھ اچھے کپڑے پہن سکے۔ زیبو کی ماں بڑی

چالاکی سے تھوڑا سا حلوہ اور دو کلچے منگوا کر ان کے گھر لے گئی۔

دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے دستک دی۔ دروازہ ایک بچے نے کھولا اور زیبو کی ماں احتیاط سے اندر داخل ہوگئی۔ وہ منہ اُٹھائے سیدھی کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ کچن میں سے آواز آئی اور زیبو کی ماں کے قدم رُک گئے۔

''کیا بات ہے......؟ کس سے ملنا ہے آپ کو......؟''

زیبو کی ماں نے کچن میں نظر ڈالی تو ایک عورت بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگ گورا تھا۔ نین نقش بھی ٹھیک تھے۔

زیبو کی ماں اس کے قریب چلی آئی۔ پھر کلچوں والی پلیٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''نیاز دِلائی تھی۔ سوچا آپ کے ہاں بھی دے دوں۔ اب تو خیر سے آپ ہمارے محلے داروں میں شامل ہوگئی ہیں۔''

''ہاں......! یہ تو ہے۔''

وہ عورت تھوڑا سا مسکرائی اور پلیٹ پکڑ کر ایک طرف رکھ دی اور بولی۔

''رابعہ......! یہ ذرا چارپائی تو صحن میں بچھانا۔''

آواز سنتے ہی ایک سولہ سترہ برس کی لڑکی کمرے سے باہر آئی اور ایک طرف کھڑی چارپائی کو کچن کے سامنے بچھا دیا اور فوراً اندر چلی گئی۔

''بیٹھ جاؤ بہن......!''

اس عورت نے کہا اور زیبو کی ماں پھیل کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ پھر اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ کون تھی......؟''

''میری بیٹی رابعہ ہے......!''

''کتنے بچے ہیں آپ کے......؟''

زیبو کی ماں کا تجسس بیدار ہو چکا تھا۔

''تین بیٹے ہیں اور ایک بیٹی......!''

''چلو شکر ہے۔ بیٹی ایک ہے اور بیٹے ماشاء اللہ تین۔ بیٹیاں تو جھ ہی ہوتی ہیں۔ بیٹی جوان ہو جائے تو ماں باپ کی راتوں کی نیندیں رام ہو جاتی ہیں۔''

اس عورت کو یہ باتیں شاید ناگوار گزری تھیں۔ خشک لہجے میں ولی۔

''میری بیٹی تو بیٹوں سے زیادہ مہنگی ہے۔ وہ سترہ برس کی ہونے کو آئی ہے مگر ابھی تک میں نے اسے گھر کے کام کاج میں نہیں لگایا۔ بیٹیاں تو بیٹوں سے زیادہ پیاری ہوتی ہیں۔ آئندہ ایسی بات مت کیجئے گا۔''

عورت آٹا ایک طرف رکھ کر ہاتھ دھونے لگی۔

زیبو کی ماں کچھ دیر بیٹھی رہی اور پھر چلی آئی۔

رفتہ رفتہ رابعہ کی ماں بھی آ کر محلے کی عورتوں کے پاس بیٹھنے لگی۔ مگر ایک بات طے تھی، نہ وہ کسی کے گھریلو معاملات میں دخل دیتی تھی اور نہ ہی اپنے گھر کے بارے میں کچھ بتاتی تھی۔

یہی حال رابعہ کا تھا۔ اکیلی رہنے والی لڑکی تھی۔ محلے کی کسی لڑکی سے اس کی ابھی تک دوستی نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ زیبو سامنے ہی رہتی تھی اور چونکہ وہ سارا دن سلائی کرتی تھی، اس لئے پورے محلے کی بہت سی لڑکیاں سلائی سیکھنے آتی تھیں۔ مگر رابعہ نہ کبھی ان کے گھر گئی تھی اور نہ دروازے میں کھڑی زیبو کو بلایا تھا۔

یوں ہی ایک سال گزر گیا۔ رابعہ اور اس کی ماں اچھی طرح محلے والوں سے مانوس ہو چکے تھے۔ آج کل رابعہ کی ماں، رابعہ کے لئے رشتے دیکھ رہی تھی جو خیر سے اب اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس کی ماں جب بھی

محلے والیوں کے پاس آ کر بیٹھتی، یہی کہتی۔

"بس بہن......! دُعا کرو میری بیٹی کو اچھا گھر ملے۔ بڑا گھر، اونچے لوگ۔ میں نہیں چاہتی وہ بھی ان چھوٹی چھوٹی گلیوں کے گھروں جیسے گھر میں جا بسے۔ میں چاہتی ہوں، اس کی کسی اچھے رہائشی علاقے میں کوٹھی یا بنگلہ ہو۔"

سب عورتوں کو بہت غصہ آتا تھا۔ آخر نمو کی ماں منہ پر ہی کہہ دیتی۔

"بہن......! کوئی جگہ، کوئی علاقہ برا نہیں ہوتا اور نہ ہی چھوٹی بڑی گلیاں کسی کی شناخت ہوتی ہیں۔ انسان اپنی شناخت خود ہوتا ہے۔ اس کے عمل ہوتے ہیں، اخلاق ہوتا ہے اور پھر انسان کو اپنی اوقات دیکھ کر بات کرنا چاہئے۔ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہئے۔"

رابعہ کی ماں کو ان تلخ باتوں سے اتنا غصہ آتا تھا کہ اس نے بیٹی کے رشتے کی بات ان کے سامنے کرنا ہی چھوڑ دی۔ تاہم وہ بات کرتی یا نہ کرتی، محلے کی عورتیں تو خود سب باتوں کی جاسوسی کرتی رہتی تھیں۔

"ارے زیبو کی ماں......! یہ رابعہ کے گھر آج کون آیا ہے......؟ بڑی ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔"

حلیمہ نے گلی میں کھڑی زیبو کی ماں سے سرگوشی میں پوچھا۔

"بھئی......! مجھے کیا پتا......؟"

زیبو کی ماں نے اُکتا کر جواب دیا۔

"تمہیں پتہ نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا......؟ تمہارا گھر ہی تو سامنے ہے۔ ہر بات سنائی دیتی ہے تمہارے گھر سے۔"

حلیمہ نے تنک کر کہا۔

"تمہیں تو برا لگ گیا۔ جانتی تو ہو کہ زیبو سارا دن مشین چلاتی ہے۔ بھلا اس کی کھڑ کھڑ میں، میں کسی کی کیا آواز سن سکوں گی......؟

جہاں تک مہمانوں کا تعلق ہے، میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ کوئی رشتہ دیکھنے کے لئے آئے ہوں گے۔"

"ہاں......! تمہاری یہ بات تو دل کو لگتی ہے۔ مگر کیا فائدہ لوگوں کے آنے کا......؟ روز آتے ہیں اور روز جاتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ رابعہ کی ماں کیسا رشتہ چاہتی ہے......؟ نمو کی ماں کہہ رہی تھی، اس نے بھی دو رشتے دکھائے ہیں رابعہ کے لئے۔ ایک بینک میں حساب کرتا ہے اور دوسرا کسی بینک میں کلرک ہے۔ مگر رابعہ کی ماں کو دونوں میں سے کوئی ایک رشتہ بھی پسند نہیں آیا۔"

حلیمہ نے پوری تفصیل بیان کی۔

"بھئی......! اس بے چاری کا اپنا بھی قصور نہیں۔ جب لڑکی ہی کسی کو پسند نہیں کرتی۔ اب اتنا بھی لاڈ پیار بیٹیوں سے نہیں کرنا چاہئے کہ بیٹی ماں بن جائے اور ماں بیٹی۔ اصل میں لوگ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔

رابعہ خود کہتی ہے، شادی کرے گی تو کسی امیر، خوب صورت آدمی سے۔ ورنہ یوں ہی ساری عمر ماں کے دَر پر بیٹھی رہے گی۔ آج کی ہر لڑکی بس یہی چاہتی ہے۔ شوہر خوب صورت ہو، موٹر، بنگلہ ہو۔ مگر غریبوں کی ایسی قسمت کہاں......؟ انسان کو اپنی برابری کی بات کرنی چاہئے ورنہ شادی کے بعد بھی انسان بہت سی دُشواریوں میں پڑ جاتا ہے۔"

حلیمہ بات کرتے کرتے ایک دم چپ ہوگئی کیونکہ رابعہ کے گھر سے کچھ لوگ باہر آ رہے تھے۔

زیبو کی ماں بولی۔

"شاید ان کو لڑکی پسند نہیں آئی......؟"

"ارے......! لڑکی نہیں، گھر کہو۔ لڑکی تو لاکھوں میں ایک ہے۔ مجھے لگتا ہے لڑکی بوڑھی ہو جائے گی مگر اس کی ماں کو کوئی پسند نہیں آئے

گا۔"

یہ لوگ باتیں کر رہی تھیں کہ رابعہ اور اس کی ماں باہر آتی ہوئی نظر آئیں۔ جب وہ دونوں ان کے قریب آئیں تو حلیمہ بولی۔

"کیسی ہو رابعہ بیٹی......؟"

"بس ٹھیک ہوں خالہ جان......! آپ اپنی کہیں......!"

رابعہ نے بڑے اخلاق سے پوچھا اور حلیمہ خوش ہوگئی۔ کیونکہ رابعہ نے کبھی کسی سے اتنے اخلاق سے بات نہ کی تھی۔ پھر وہ دونوں ماں بیٹی جانے لگیں تو زیبو کی ماں بولی۔

"ارے بہن......! آؤ بیٹھو ناں......!"

"نہیں بہن......! ہم تو بازار جا رہے ہیں۔"

رابعہ کی ماں نے جلدی سے کہا اور رابعہ کو لے کر آگے بڑھ گئی۔

ان کے جاتے ہی نمو کی ماں آگئی اور بولی۔

"پتہ نہیں کہاں کہاں جاتی ہیں دونوں ماں بیٹیاں......؟"

"بازار کا کہہ رہی تھیں۔"

حلیمہ نے بتایا۔

"ارے چھوڑو......! بازار......؟ بھلا بازار بھی کوئی روز جاتا ہے......؟ اور پھر یہ کون سی ڈپٹی کمشنر یا کسی ایس پی کی بیگم ہے......؟ سمجھتی ہے میں لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہوں۔

ارے......! اگر کوئی منہ پر کچھ نہیں کہتا تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ ہم کچھ جانتے ہی نہیں......؟ تم تو جانتی ہو، شریف عورتیں روز بازار نہیں جاتیں۔"

آہستہ آہستہ گلی کی عورتیں آتی گئیں اور غیبت میں جوش پیدا ہوتا گیا۔

رابعہ اور اس کی ماں جب واپس آئیں تو گلی خالی پڑی تھی۔

"توبہ......! اس محلے سے دو بار بازار جاؤ تو پتہ نہیں کیا سے کیا مطلب نکال لیتی ہیں......؟ آپ نے دیکھا نہیں، جب ہم بازار جا رہے تھے تو وہ ہمیں کیسی مشتبہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں......؟ بے وقوف کہیں کی۔ جاسوسی کرتی ہیں، شرم نہیں آتی ایسا کرتے ہوئے......؟"

رابعہ بڑبڑاتی ہوئی گلی سے گزر کر اپنے گھر کے قریب پہنچی تو زیبو کی ماں جو ان کے انتظار میں چھت پر ٹہل رہی تھیں، جھک کر پوچھنے لگیں۔

"بازار سے واپس آگئی رابعہ بیٹی......؟"

رابعہ کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ دانت پیس کر بولی۔

"خالہ جان......! آپ نے دیکھ تو لیا ہے۔"

وہ اپنے گھر میں داخل ہوگئی اور غصے سے بولی۔

"امی جان......! اگر مکان لینا ہی تھا تو کسی اچھے سے علاقے میں لیتیں۔ اس گندے محلے میں تو کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا سب شمار کیا جاتا ہے۔ میں تو تنگ آگئی ہوں ان محلے والوں سے۔"

"رابعہ......! تم کیوں بھول رہی ہو کہ یہ مکان ہمیں بہت سستا ملا ہے......؟ اور پھر اپنی چادر دیکھ کر ہی پیر پھیلائے جاتے ہیں۔ خیر......! تم ...لعہ کرو ان محلے والوں کو۔ چلو تم بھائیوں کو آواز دو۔ دیکھو گلی میں کھیل رہے ہوں گے۔"

"جی امی......!"

رابعہ نے کہا اور اُٹھ کر بھائیوں کو بلانے چلی گئی۔

رابعہ کا باپ اگرچہ کلرک ہی تھا مگر رابعہ کی ماں نے بچت کر کر کے رابعہ کے لئے ایک اچھا جہیز تیار کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے لئے اچھا گھر چاہتی تھی۔ خود اس نے اپنی زندگی چھوٹے گھروں اور تنگ گلیوں میں بسر کی تھی مگر بیٹی کے لئے وہ وسیع گھر اور کشادہ سڑک چاہتی تھی۔

اب تک جتنے بھی رشتے دیکھے گئے تھے، وہ اس لئے طے نہ ہو سکے کہ جن لوگوں نے لڑکی پسند کی تھی، ان لوگوں کو رابعہ کی ماں نے ناپسند کیا تھا اور جن لوگوں کو رابعہ کی ماں نے پسند کیا تھا، انہیں لڑکی پسند نہیں آئی تھی۔ ناپسند آنے کا مطلب یہ نہیں کہ رابعہ خوب صورت نہیں تھی، رابعہ تو کسی افسانوی ہیروئین سے بھی زیادہ خوب صورت تھی مگر حسن کی دولت ہونے سے کیا ہوتا ہے......؟ جب کاغذی دولت پاس نہ ہو۔ یہ سلسلہ یوں ہی چل رہا تھا۔ رابعہ کی ماں ابھی مایوس نہیں تھی۔

رابعہ سولہ برس کی تھی جب اس کی ماں نے اس کے لئے بر کی تلاش شروع کر دی تھی۔

اور پھر بیسویں سال میں پہنچتے ہی رابعہ کی قسمت جاگ گئی۔ محلے والے بھی اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ سارا معاملہ چپکے چپکے طے ہوا تھا۔ لڑکا قالینوں کا بزنس کرتا تھا۔ صرف دو بھائی تھے، بہن کوئی نہ تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ ماں زندہ تھی۔ محلے والوں کو عین نکاح کے دن پتا چلا تھا۔ کیونکہ صفیہ نے کسی کو پہلے سے کچھ نہ بتایا تھا۔ نکاح بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ لڑکا رابعہ سے بھی زیادہ خوب صورت تھا۔ عمر بھی اتنی زیادہ نہ تھی کہ بے جوڑ نظر آئے۔ بہت خوب صورت اور قیمتی بری لائے تھے۔

محلے والیاں دیکھ دیکھ کر رشک کر رہی تھیں اور صفیہ کی فراست کی قائل ہو رہی تھیں کہ بالآخر اس نے اپنی بیٹی کے لئے امیر رشتہ ڈھونڈ ہی لیا۔ صفیہ نے صرف نکاح کیا تھا۔ رخصتی روک لی تھی۔ دلہا والے بھی فوری رخصتی نہیں چاہتے تھے۔

پھر نہ جانے کیا ہوا......؟ شاید ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی تھی......؟ دو دن بعد ہی پتا چلا کہ یہ سب تو فراڈ تھا۔ لڑکا تین شادیاں تو پہلے ہی کر چکا تھا۔ یہ اس کی چوتھی شادی تھی۔ پہلی تینوں کو طلاق دے چکا تھا۔ اس کا اپنا کوئی ذاتی کاروبار نہیں۔ دونوں بھائی دھوکہ دھڑی سے پیسہ

کماتے ہیں۔ بے غیرتی تو ان کے گھر کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

جب رابعہ کی والدہ اور والد کو ان سب باتوں کا پتا چلا تو وہ لوگ نہ صرف پریشان ہوئے بلکہ انہیں شدید غصہ بھی آیا۔ کسی اور کو کچھ کہنے کی بجائے وہ بیوی پر ہی برس پڑے۔

”یہ سب کیا دھرا تمہارا ہے صفیہ بیگم......! تم نے ہی کوٹھیوں، بنگلوں کے خواب دیکھے تھے اور ان کی پاداش میں بیٹی کے لئے کھوٹا سکہ چن لیا۔ تم اگر اس قسم کے خیالات نہ رکھتیں تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ اب بتاؤ میں کیا کروں......؟“

”مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب دھوکا ہوگا۔ ہر ماں اپنی اولاد کی بہتری کے خواب دیکھتی ہے۔ میں نے بھی رابعہ کے لئے ایسے ہی خواب دیکھے تھے۔ مگر ان کی تعبیر اتنی بھیانک ہوگی، یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔“

صفیہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”رونے دھونے سے اب کام نہیں چلے گا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تو وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایک باپ کے لئے یہ بات بڑے دکھ کی ہے کہ وہ رات کو بیٹی کا نکاح کرے اور صبح طلاق کا مطالبہ۔ خدا ایسا دن کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔“

مارے غصے اور غم کے وہ کانپ رہے تھے اور رابعہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بند تھی۔ ابھی تو اس کے بالوں سے گجرے کی مہک اور ہاتھوں سے مہندی بھی نہ اتری تھی کہ اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوگیا۔

دو دن پہلے وہ خود پر رشک کر رہی تھی کہ اس نے جس بنگلے اور موٹر کے خواب دیکھے تھے، وہ حقیقت میں ڈھل کر اس کے سامنے آگئے تھے۔ وہ اونچی اڑان اڑنے لگی تھی مگر یہ اچانک کیا ہوا تھا......؟

اس کے پر کٹ گئے تھے اور وہ منہ کے بل زمین پر آگری تھی۔ کتنا بڑا فریب ہوا تھا اس کے ساتھ۔ سیانے لوگ ٹھیک ہی بات کہہ گئے

ہیں۔

''جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔''

اس نے زمین پر رہتے ہوئے ہمیشہ چاند ستاروں کی تمنا کی تھی۔

اس کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی ان گلیوں اور چھوٹے چھوٹے گھروں میں نہ رہتی۔ مگر چونکہ اس کا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ملازم تھا، اس لئے اسے ایسی جگہوں پر رہنا ہی پڑا۔ مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ شادی کسی ایسی جگہ کرے گی جہاں نوکروں کی ایک فوج اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہے۔ جہاں اسے ہل کر پانی بھی نہ پینا پڑے۔ اس کو یہ خواب دکھانے والی اس کی ماں تھی جو سمجھتی تھی اس کے لئے آسمان سے بر اُترے گا اور جب یہ رشتہ طے ہوا تھا، ماں خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی۔

''مگر اب......؟''

''اُف......! یہ سب کیا ہوگیا......؟''

اندر بیٹھی رابعہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بڑبڑائی۔

باہر ماں باپ اور بھائی مسلسل اسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ اب ان لوگوں سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے......؟ بات چیت کا آغاز کس طریقے سے کیا جائے......؟

اور اندر بیٹھی رابعہ اپنے بھیانک مستقبل کا تصور کر کے روئے جا رہی تھی۔

محلے والے الگ افسوس کرنے آ رہے تھے۔ بظاہر تو محلے کی عورتیں افسوس کرتیں مگر باہر نکل کر کہتیں۔

''ارے......! یہ بھی شہزادہ خرم تلاش کرتی تھی۔ اب گری ہے منہ کے بل......!''

کوئی کہتا۔

''ارے......! اس عورت کے غرور نے اس کو یہ دن دکھایا ہے۔

کے رشتے کے معاملے میں انسان دیواروں سے بھی مشورہ کر لیتا ہے۔ ں طرح چھان بین کر کے لوگ بیٹیوں کا رشتہ کرتے ہیں اور اس نے تو ہی اندر نہ جانے کیا کیا کسی کو کانوں کان ہوا نہ لگنے دی۔ اب بھی شکر ے کہ رُخصتی نہیں ہوئی، ورنہ تمام عمر سر پکڑ کر روتی۔''

''ارے......! میں نے سنا کہے یہ لوگ طلاق لے رہے ں......؟''

رضیہ کی ماں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

''طلاق نہ لیں گے تو کیا کریں گے......؟''

الغرض جتنے منہ، اتنی ہی باتیں بن رہی تھیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد رابعہ کے ماں باپ نے یہی مناسب جانا کہ وہ دونوں میاں بیوی لڑکے والوں کے گھر جائیں اور کہیں کہ وہ جو کچھ کاح میں لائے ہیں، وہ سب واپس لے لیں اور اس کے بدلے میں ہماری ں کو آزاد کر دیں۔

اسی شام دونوں میاں بیوی ان کی کوٹھی جا پہنچے۔ وہ لوگ اُنہیں یکھ کر بہت خوش ہوئے مگر صفیہ ماتھے پر تیوریاں ڈال کر بیٹھ گئی اور رابعہ کے والد نے بات کا آغاز کیا۔

''بہن......! آپ لوگوں نے کہا تھا لڑکا قالینوں کا کاروبار کرتا ہے۔ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں وہ یہ کاروبار کرتا ہے۔''

''لیکن آپ وہ جگہ کیوں دیکھنا چاہتے ہیں......؟''

دُلہا کی والدہ نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

''بس......! دیکھنا چاہتے ہیں۔ آخر ہم بیٹی والے ہیں۔ کیا ہمیں حق نہیں کہ ہم اپنے دل کا اطمینان کر لیں......؟''

صفیہ بیگم نے نفرت سے ان سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب......!''

وہ عورت طنزیہ لہجے میں بولی۔

''یہ سب باتیں نکاح سے پہلے پوچھی جاتی ہیں۔ نکاح کے بعد ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ آپ کو یہ سب پہلے دیکھنا چاہئے تھا۔ اب آپ کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ نکاح ہو چکا ہے۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ ہمیں وہ جگہ نہیں دکھائیں گی جہاں یہ قالینوں کا کاروبار کرتے ہیں......؟''

رابعہ کے والد نے غصے سے کہا۔

''شاید......؟''

وہ عورت بے زاری سے بولی۔

''آپ بھول رہی ہیں محترمہ......! ابھی صرف نکاح ہوا ہے، رُخصتی نہیں۔ میری بیٹی میرے گھر بیٹھی ہے اور میری رضامندی کے بغیر اس کی رُخصتی نہیں ہو سکتی۔''

رابعہ کے والد نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ لوگ مجھے دھمکی دے رہے ہیں......؟''

دُلہا کی والدہ بگڑ کر بولی۔

''یاد رکھیں، نکاح ہو چکا ہے، آپ رُخصتی کریں یا نہ کریں، ہم میں اتنی طاقت ہے کہ لڑکی کو اُٹھوا کر اپنے گھر لے آئیں۔ آئے بڑے کاروبار دیکھنے......؟ پہلے اپنی اوقات تو دیکھ لیتے۔''

''تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے......!''

صفیہ غصے میں بھری ہوئی بولی اور اتنے میں دُلہا سلیم تیزی سے چلتا ہوا ان کے قریب آ پہنچا۔

''کیا بات ہے امی......؟ یہ سب کیا ہے......؟ آپ لوگ کس بات پر جھگڑ رہے ہیں......؟''

اس نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

''یہ لوگ تمہارا قالینوں کا کاروبار دیکھنا چاہتے ہیں۔''

ماں نے تمسخرانہ انداز میں ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو اس میں جھگڑنے یا ناراض ہونے کی کیا بات ہے......؟ آپ ...ک کاروبار دیکھنا چاہتے ہیں......؟''

وہ اپنے سسر کے روبرو بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

''ہاں......! ہم تمہاری کاروبار والی جگہ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

صفیہ بیگم نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے......؟ آج تو میں جا رہا ہوں ...ن، ایک ہفتے کے لئے۔ اس کے بعد جب آؤں گا تو آ کر میرا کاروبار ...ھ لیجئے گا۔''

سلیم نے بڑے نرم اور مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ پھر پلٹ کر ماں سے ...طب ہوا۔

''کمال ہے امی......! میرے ساس سسر آئے ہیں اور آپ نے ...انے پینے کا کوئی انتظام نہیں کیا......؟''

''بھئی......! یہ لوگ آتے ہی ایسی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔''

''ہم کچھ کھانا پینا نہیں چاہتے۔ بس اسی وقت کاروبار دیکھنا چاہتے ...۔''

رابعہ کے والد نے سخت لہجے میں کہا۔

''دیکھئے......! میں نے ابھی آپ سے عرض کیا ہے کہ میں ایک ...فتے کے لئے لندن جا رہا ہوں۔ واپسی پر آپ میرا کاروبار دیکھ لیجئے گا۔''

سلیم کا لہجہ اب بھی نرم ہی تھا۔

''نہیں......! ہم ابھی تمہارا کاروبار دیکھنا چاہتے ہیں۔''

صفیہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہم نہیں دکھائیں گے۔ تم لوگوں کے جو جی میں آتا ہے کر

لو......!"

سلیم کی والدہ تلخ لہجے میں بولیں۔

"امی......! پلیز......!"

سلیم نے احتجاج کیا اور پھر ان سے مخاطب ہوا۔

"دیکھئے......! صرف ایک ہفتے کی بات ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں......؟"

"نہیں......!"

رابعہ کے والد کھڑے ہوگئے۔ اب تک وہ ضبط کرتے آئے تھے مگر اب معاملہ ان کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔

"تم لوگ دھوکے باز ہو۔ فریب کرتے ہو۔ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم پہلے بھی تین شادیاں کر چکے ہو۔ میں اپنی بیٹی ہرگز رُخصت نہیں کروں گا۔ تم لوگوں کو طلاق دینا ہوگی۔"

"ہوں......! تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ خیر......! آپ لوگ اگر سب کچھ جان چکے ہیں تو میں آپ کو بتا دوں کہ میں اپنی پہلی تین بیویوں کو طلاق دے چکا ہوں اور یہ شادی میں اپنی پوری نیک نیتی سے کر رہا ہوں۔ آپ یقین کیجئے، میں رابعہ کے تمام حقوق ادا کروں گا۔ بس آپ رُخصتی کر دیجئے۔"

"ہرگز نہیں......!"

رابعہ کے والد دہاڑے۔

"تمہیں طلاق دینا ہوگی۔ میری بیٹی ہرگز تمہارے گھر نہیں آئے گی۔"

"کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے......؟"

سلیم نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں شک کیوں ہے......؟ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔ سیدھے

یقے سے طلاق دے دینا ورنہ تمہاری خیر نہیں......!"

"اور تم لوگ بھی کان کھول کر سن لو کہ اپنی بیٹی کی رُخصتی کر دو ورنہ لوگوں کی بھی خیر نہیں......! تم لوگ مجھے نہیں جانتے۔ میں لاشوں کے ر لگا کر بھی تمہاری بیٹی کو اُٹھا کر لے آؤں گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ رسم و ج کے مطابق آپ لوگ رُخصتی کر دیں ورنہ......"

وہ بھیانک انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ جو کچھ دیر پہلے بڑے نرم اور م لہجے میں بات کر رہا تھا، ایک دم جانور بن گیا تھا۔ رابعہ کے والد، رہ اسے ایک ہفتہ کی مہلت دے کر گھر آگئے۔

ایک ہفتہ گزر گیا مگر ان لوگوں میں سے کوئی بھی نہ آیا۔ ادھر صفیہ اپنے تمام میکے اور سسرال والوں کو جمع کر کے مشورہ کر رہی تھیں کہ اب کیا جائے......؟

پھر سب نے اپنا اثر و رسوخ دکھایا مگر وہ لوگ تو ماننے ہوئے ے تھے۔ ان دھمکیوں میں کہاں آنے والے تھے......؟ سارے رشتے اپنے اپنے گھر بیٹھ گئے اور رابعہ جس کو سوائے رنگین خواب دیکھنے کے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا، اب رونے لگتی تو چپ نہ ہوتی۔

ادھر یہ لوگ طلاق کے لئے پورا زور لگا رہے تھے مگر وہ لوگ کسی ح بھی رضامند نہ ہو رہے تھے۔ ادھر رابعہ کی ماں محلے میں کہتی کہ بے ب وہ لوگ طلاق دیں یا نہ دیں، میں اپنی بیٹی کی رُخصتی نہیں کروں گی۔

اس طرح چھ ماہ گزر گئے اور پھر ایک دن سارا محلہ یہ سن کر حیران گیا کہ رابعہ کی ماں نے رُخصتی کی تیاریاں شروع کر دی ہیں اور وہ رُخصتی رضامند ہوگئی ہے۔

سارا محلہ اس کے اس فیصلے پر حیران تھا۔ کہیں تو یہ کہتی تھی۔

"اگر ان لوگوں نے طلاق نہ بھی دی تو میں ساری عمر اپنی بیٹی کو گھر ا کر رکھوں گی۔ مگر رُخصتی نہیں کروں گی۔"

اب ایسی کیا بات ہوگئی جو یہ لوگ رُخصتی پر رضامند ہوگئے......؟

مگر صفیہ نے کسی کو بھی کچھ نہ بتایا تھا۔ تاہم جب حنیفہ نے اس سلسلے میں رابعہ کی ماں سے بات کی تو وہ بولی۔

''اب کیا کہوں حنیفہ......؟ وہ لوگ تو بہت بڑے بدمعاش ہیں۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ اگر ہم نے رُخصتی نہ کی تو وہ میرے تینوں بیٹوں کو قتل کر دیں گے۔ اب میں رابعہ کی وجہ سے اپنے لڑکوں کی زندگی تو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ رابعہ کی قسمت میں جو لکھا تھا، وہ ہوگیا۔

اور لڑکی پرایا دھن ہوتی ہے اور پھر سوچو......! ہم نے تو خوب سوچ سمجھ کر یہ رشتہ طے کیا تھا، اب آگے اس کا مقدر......! تم خود ہی کہو......! ایک لڑکی کے لئے تین لڑکوں کی زندگی سے کھیلنا کوئی اچھی بات تو نہیں......؟''

''صفیہ......! ایسے تو مت کہو۔ یہ رابعہ کی زندگی کا سوال ہے۔ وہ بہت نیک بچی ہے۔ نہ جانے وہ رابعہ کے ساتھ کیا سلوک کریں......؟ اور پھر تم تو بڑے دعوے سے کہتی تھیں، تمہیں رابعہ لڑکوں سے زیادہ عزیز ہے۔ اب کیا بات ہوگئی......؟ تمہاری محبت کو کیا ہوگیا......؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو......!''

صفیہ افسردہ لہجے میں بولی۔

''یہ بات تو تم بھی سمجھتی ہو بیٹے، بیٹے ہی ہوتے ہیں، بیٹیوں کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ہمارا کل یہی ہمارے بیٹے ہیں۔ ہماری زندگی کی کل پونجی، ہمارا مستقبل، بیٹیوں کے مقدر تو ہمیشہ سے ایسے ہی رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے میں ان سے دُشمنی نہیں چاہتی۔''

اندر بیٹھی رابعہ نے یہ سب کچھ سنا تو تلخی سے مسکرا دی آج اسے اپنی اہمیت اور اوقات کا احساس ہوگیا تھا۔ آج اسے اپنی اصلیت کا پتہ چل گیا تھا لڑکی چاہے کتنی ہی نیک سگھڑ اور فرمانبردار ہو اس کی زندگی پر ہمیشہ

ٹیوں کی زندگی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ رابعہ نے بھی خود کو ذہنی طور پر اس ی کے لئے تیار کر لیا تھا۔

شادی والا روز کون سا دُور تھا......؟ وہ بھی چپکے سے آگیا۔ رابعہ یتی انداز میں دُلہن بنی اور گم سم سی بغیر ماں، باپ اور بھائیوں کے گلے ے دُلہا کے ساتھ چلی گئی۔ جب کسی کے دل میں اس کے لئے جگہ نہ تھی تو اداکاری کیوں کرتی......؟

حجلہ عروسی میں وہ بغیر کسی احساس اور جذبے کے بیٹھی تھی کہ اس کا ہر سلیم کمرے میں داخل ہوا۔ روایتی انداز میں رونمائی کی رسم ہوئی تو بہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ ایک اچھی شکل وصورت کا مالک تھا اور ی طور پر بھی دھوکے باز نہیں لگ رہا تھا۔ رابعہ نے اسے دیکھ کر سر جھکا

''میں تمہاری کیفیت اور احساسات کو سمجھتا ہوں۔ یقیناً تمہیں مجھ ے شدید نفرت ہوگی لیکن یقین کرو میں اپنے روّیے اور اپنے عمل سے اری نفرت کو محبت میں بدل دوں گا۔ تمہیں میری پہلی تین شادیوں سے یشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ان تینوں کو طلاق دے چکا ہوں۔ ین جانو......! میں تمہارا ہر حق ادا کروں گا۔''

وہ بہت کچھ کہتا رہا مگر رابعہ تو گویا پتھر کی ہو چکی تھی نہ ہوں، نہ ں، وہ آنکھیں بند کئے یوں بیٹھی رہی جیسے سلیم سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ گر سلیم تو کفارے کے طور پر ہر تعلق آج کی رات مضبوط کرنا چاہتا تھا۔

اپنی نئی زندگی سے رابعہ نے سمجھوتہ کر لیا تھا اور کرتی بھی کیوں ں......؟ جبکہ اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف یا اذیت نہ تھی۔ اس گھر میں اسے ر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ سا یا دیور کسی نے بھی کبھی کوئی روک ٹوک نہ ائی تھی اور رہا سلیم تو وہ گویا اسے دُنیا کی ہر خوشی دینا چاہتا تھا۔ اس کی واہش تھی کہ رابعہ ہمیشہ سولہ سنگھار کئے بیٹھی رہے۔ کام وام شاید وہ حقیقت

میں کوئی نہیں کرتا تھا۔

سارا دن وہ گھر میں ہر نظر آتا۔ یہ سب کچھ تھا مگر اس کے باوجو رابعہ ذہنی طور پر پرسکون نہیں تھی۔ وجہ ماں باپ کا وہ تلخ رویہ تھا جس کی بنا پر وہ سلیم سے شادی کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ وہ سارا دن سلیم کے ساتھ اِدھر اُدھر آتی جاتی، گھومتی پھرتی مگر جب کبھی سلیم اس کے میکے جانے کا نا لیتا، وہ ایک دم انکار کر دیتی۔

نہ جانے کیوں وہ کسی کو بھی اپنی شکل دکھانا نہیں چاہتی تھی......
ماں اکثر اسے فون کرتی اپنے ہاں آنے کو کہتی اور رابعہ کو تو واقعی جیسے ا سے اب کوئی لگاؤ نہ تھا۔ صاف انکار کر دیتی۔ ایسا کر کے وہ خود کو بھ اذیت دیتی۔

اس کی شادی کو چھ ماہ ہوگئے تھے اور ان چھ ماہ میں وہ حد زیادہ بدل گئی تھی۔ وہ رابعہ جو کبھی چادر اُوڑھے بغیر بازار نہیں جاتی تھی اب پینٹ شرٹ اور اسکرٹ بلاؤز میں نظر آنے لگی تھی۔ بقول سلیم
''اس ڈریس میں تم بہت خوب صورت نظر آتی ہو'' رابعہ وہی ڈریس زیا پہننے لگی تھی۔

ایک دن وہ پارٹی میں جانے کے لئے جلدی جلدی تیار ہو پرفیوم اسپرے کرتی ہوئی کمرے سے باہر آئی تو سلیم کو جھلائی ہوئی آواز س کر چونک گئی۔

''امی......! کیا کہنا چاہتی ہیں......؟ جلدی سے کہہ دیجئے۔ راب تیار ہو رہی ہے ہمیں پارٹی میں جانا ہے۔''

''میں دیکھ رہی ہوں وہ دن بدن تمہاری کمزوری بنتی جا رہی ہے ابھی تک تمہارا دل نہیں بھرا اس سے......؟''

رابعہ کی ساس نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔

''امی......! آپ ابھی کچھ عرصہ صبر نہیں کرسکتیں......؟''

دفعتہً پردے کے باہر کھڑی رابعہ پر سلیم کی نظر پڑ گئی اور وہ چپ ہوگیا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ دوسرے موضوع پر باتیں کرنے لگے تو رابعہ دستک دیتی ہوئی اندر چلی آئی۔

''تیار ہوگئی میری بیٹی......؟''

رابعہ کی ساس نے مکاری سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ رابعہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے باہر نکل آئی۔ تاہم دل میں وہ سوچ رہی تھی۔

''ان باتوں کے کیا معنی ہیں......؟ سلیم ماں کو کس معاملے میں صبر کا مشورہ دے رہا تھا......؟''

وہ شاید کچھ دیر ابھی اور سوچتی مگر سلیم مسکراتا ہوا باہر آگیا۔

''کیوں بھئی......! تم نے امی کی بات کا جواب نہیں دیا اور منہ بنا کر باہر نکل آئیں......؟''

حالانکہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ تمام باتیں سن چکی ہے۔

''امی آپ سے یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ میں دن بدن آپ کی کمزوری بنتی جا رہی ہوں......؟ اور یہ کہ آپ کا دل ابھی مجھ سے نہیں بھرا......؟ ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے......؟ کیا مجھے بھی آپ کی پہلی تین بیویوں کی طرح طلاق دلانا چاہتی ہیں......؟''

رابعہ نے غصے سے پوچھا۔

سلیم نے دل میں شکر ادا کیا کہ وہ اصلی معاملے کو نہیں پہنچ پائی۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

''تم نے امی کی باتوں کا بہت غلط مطلب لیا ہے۔ امی تو یہ بات اس لئے کہہ رہی تھیں کہ جب سے شادی ہوئی ہے، میں تمہارا اور گھر کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ مجھے اب کچھ کام دھام کرنا چاہیئے۔''

رابعہ نے ساری باتیں سنیں تو اسے سخت افسوس ہوا۔ ندامت سے

بولی۔

''سوری سلیم......! میں نے غلط سوچا۔''

''چلو خیر......! کوئی بات نہیں......! آؤ چلیں۔''

سلیم اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا تو وہ بولی۔

''سلیم......! امی ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ کو کام کرنا چاہئے۔ چھ ماہ تو ہو چکے ہیں ہماری شادی کو۔ یہ پارٹیاں اور ہنگامے تو زندگی بھر کی باتیں ہیں۔''

''پر کیا کروں......؟ لگتا ہے جیسے ابھی چھ دن ہی ہوئے ہیں ہماری شادی کو۔''

سلیم نے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھا تو رابعہ مسکرا دی۔

پارٹی سے واپسی پر رابعہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو پیچھے سلیم نہیں تھا۔ وہ واپس پلٹی لیکن راہ داری میں اپنی ساس کی سرگوشی سن کر رُک گئی۔

''سلیم......! تمہیں پتا ہے زاہد کتنا بے تاب ہو رہا ہے......؟ ختم کرو یہ اپنی محبت اور سیر سپاٹے۔''

''امی......! کیا آپ سچ مچ یہ سمجھتی ہیں کہ وہ میری کمزوری بن گئی ہے......؟ میری کمزوری تو نازنین بھی نہ بن سکی تھی جو رابعہ سے کئی درجے حسین تھی۔ اصل میں یہ ذرا ان لڑکیوں سے مختلف ہے۔ اسے آہستہ آہستہ شیشے میں اُتارنا ہوگا۔ آپ زاہد سے کہیں وہ کچھ روز اور انتظار کرے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اچھا......! جیسے تمہاری مرضی......!''

رابعہ کی ساس نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر سلیم کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور رابعہ بھاگ کر باتھ روم میں گھس گئی۔

کافی دیر بعد لباس تبدیل کر کے وہ باہر آئی تو سلیم بیڈ پر لیٹا تھا۔

''میں تو سمجھا شاید آج باتھ روم میں سونے کا پروگرام ہے۔''

رابعہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ کتاب نکال کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آج پڑھنے کا موڈ کیسے بن گیا......؟''

سلیم نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

''آپ لباس تبدیل نہیں کریں گے......؟''

رابعہ نے اس کی سنی اَن سنی کر کے پوچھا۔

''ارے ہاں......! میں تو بھول ہی گیا تھا۔''

یہ کہہ کر وہ لباس تبدیل کرنے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

رابعہ جلدی سے اُٹھی، کتاب شیلف میں رکھی اور لائٹ آف کر لیٹ گئی۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ شادی کے بعد وہ ایک ھی میکے نہیں گئی تھی۔ یہ سوچ کر ماں باپ نے اس پر بیٹوں کو ترجیح دی ۔ مگر اب جبکہ اس کی شادی کو چھ ماہ ہو رہے تھے۔ سلیم اور اس کے گھر ں کا رویّہ بھی ٹھیک رہا تھا تو اب وہ سوچتی تھی، کسی دن اچانک جا کر کو حیران کر دے۔

مگر اس وقت پھر دل میں نفرت کا طوفان اُٹھا تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی، م اب تک کیوں ان کے ساتھ نرم رویّہ رکھے ہوئے ہے......؟ گویا ان ں کا کام ہی یہ تھا۔ غریب گھروں کی خوب صورت لڑکیوں سے دونوں ں شادیاں کرتے، کچھ عرصہ خود عیش کرتے اور پھر دوسرے کے ہاتھ خت کر دیتے۔ اس سے قبل تین لڑکیاں سلیم کی بیویاں بن کر آچکی ں۔ سلیم نے کہا تھا، اس نے انہیں طلاق دی ہے لیکن رابعہ اب سمجھ رہی ۔ ان تینوں کو بھی طلاق دے کر فروخت کیا جا چکا ہے اور اب اس کی تھی۔

وہ کیسے خود کو بچاتی......؟ ماں باپ کو اگر اس سے ہمدردی ہوتی تو یہاں اس کی شادی ہی کیوں کرتے......؟

اور پھر اس نے بھی تو اپنی پوری زندگی میں کسی کو دوست نہ بنایا تھا جو اس مشکل وقت میں اس کی مدد کرتی۔ اب تو وہ تھی اور ان لوگوں کے لمبے ہاتھ۔

رابعہ جانتی تھی، وہ ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکے گی۔ کیونکہ ان کے ہاتھ دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ ان سب کو مزہ چکھانا چاہتی تھی۔

"لگتا ہے آج سونے کا پروگرام بہت جلد بن گیا۔"

سلیم کی آواز سن کر وہ چونک پڑی، مگر بولی کچھ نہیں۔

"کیا بات ہے ڈیئر......؟"

سلیم نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے پڑھنے کا پروگرام تھا، اور اب سونے کا......؟"

"پلیز سلیم......! میری طبیعت ٹھیک نہیں، مجھے ڈسٹرب مت کرو......!"

"یہ طبیعت کو اچانک کیا ہوگیا......؟ ابھی تو ٹھیک ٹھاک تھی......؟"

سلیم نے ٹیبل لیمپ آن کیا تو رابعہ نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"سلیم پلیز......! میرے سر میں درد ہے۔"

رابعہ نے کروٹ بدلی تو سلیم نے لیمپ آف کر دیا۔

رابعہ پریشان تھی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہنے لگی تھی۔ ساس تو کیا، وہ سلیم کو بھی اب بہت کم منہ لگاتی تھی۔ ایسے میں ایک دن شام کو سلیم گھر آیا تو اس کے ساتھ زاہد بھی تھا۔ جو بقول اس کے، اس کا دوست تھا۔ سلیم کا ہم عمر ہی لگ رہا تھا۔

"رابعہ......!"

اندر داخل ہوتے ہی سلیم بولا۔

"دیکھو زاہد صاحب کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیسی مدد......؟"

رابعہ آنکھوں میں آئی ہوئی نفرت چھپا کر پوچھنے لگی۔

"بھابی جان......! مجھے تھوڑی سی شاپنگ کرنی ہے، اپنی منگیتر کے ے۔ اب مجھے کیا پتہ، خواتین کس قسم کے پرنٹ اور کپڑے پہنتی ہیں......؟ پ اگر اس سلسلے میں میری مدد کریں تو نوازش فرمائیں گی۔"

"دیکھئے زاہد صاحب......! میں ایک غریب گھر کی معمولی لڑکی ں۔ میرے لئے لباس کا انتخاب خود سلیم صاحب کرتے ہیں۔ بہتر ہوگا آپ سلیم صاحب کو ہی ساتھ لے جائیں۔"

"لیکن رابعہ......! یہ صرف تمہیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔"

سلیم نے جلدی سے کہا۔

"لیکن میں ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔"

رابعہ نے بھی اسی تیزی سے کہا۔

"لیکن تم ان کے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہتیں......؟"

سلیم نے غصے سے پوچھا۔

"ضروری نہیں کہ اس وقت وضاحت بھی کروں۔ بس کہہ دیا، میں ں جانا چاہتی۔"

رابعہ نے نفرت سے سلیم اور زاہد کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تم......"

سلیم غصے سے آگے بڑھا تو رابعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑو دوست......! بھابی اگر میرے ساتھ نہیں جانا چاہتی تو نہ ں۔"

پھر وہ باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ہی سلیم بھی چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کمرے میں آیا تو وہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔

"تم نے یہ سب کر کے اچھا نہیں کیا۔"

وہ رابعہ کو گھورتے ہوئے بولا۔

"یہ تو مجھے ہی معلوم ہے، میں نے اچھا کیا ہے یا برا......؟"

رابعہ تلخی سے بولی۔

"رابعہ......! وہ میرا بہت عزیز دوست ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ جانا چاہیئے تھا۔ وہ کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں......؟"

سلیم اب کی بار ذرا نرمی سے بولا۔

"سلیم......! میں رابعہ ہوں۔ تمہاری طلاق شدہ بیویوں کی طرح نہیں ہوں۔"

"بکواس بند کرو......!"

سلیم نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا اور غصے سے بھرا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

رات گئے وہ واپس آیا تو رابعہ کے قریب رُک کر بولا۔

"سو گئی ہو یا جاگ رہی ہو......؟"

رابعہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود ہی قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے معلوم ہے تم جاگ رہی ہو اور مجھ سے ناراض ہو۔ اصل میں مجھے خود ہی تم سے یہ بات کہنا نہیں چاہیئے تھی۔ تم ان باتوں کی عادی نہیں ہو۔ لیکن ہماری سوسائٹی کا یہ معمول ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم پر ہاتھ اُٹھایا۔"

رابعہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ روتی رہی اور سلیم اسے مناتا رہا۔

کچھ دن بڑے پُرسکون گزرے۔ پھر اچانک ایک دن سلیم گھر آیا اس کے پاس دو ٹکٹ تھے۔

"لو بھئی......! تیاری کر لو۔"

اس نے ٹکٹ رابعہ کے آگے پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کیا ہے......؟"

رابعہ نے ٹکٹ لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی......! میں جانتا ہوں تمہیں یہ ماحول پسند نہیں۔ مگر کیا کروں......؟ میں کوئی ملازمت وغیرہ تو کرتا نہیں تھا۔ اب شکر پڑیاں میں مجھے ایک ملازمت مل گئی ہے۔ کل شام کی فلائٹ سے ہم لوگ شکر پڑیاں چلے جائیں گے۔ اپنی ضروری پیکنگ کر لینا۔"

"سچ سلیم......!"

رابعہ نے خوش ہو کر اس کے کاندھے پر سر رکھ دیا تو سلیم مسکرا دیا۔

رابعہ اسی وقت اپنی ضروری پیکنگ میں لگ گئی۔ اپنی پیکنگ سے فارغ ہو کر وہ سلیم سے اس کی ضرورت کی چیزوں کے بارے میں پوچھنے گئی تو ماں بیٹے کو باتیں کرتے دیکھ کر باہر ہی رُک گئی۔ سلیم جلدی جلدی ماں کو بتا رہا تھا۔

"امی......! میں اسے شکر پڑیاں چھوڑ کر آ جاؤں گا۔ باقی زاہد جانے......! میرا کام تو ختم ہو جائے گا۔ طلاق کے کاغذات اس کے سوٹ کیس میں رکھ دوں گا۔"

"پرسوں ہر حال میں دس بجے آ جانا......! تمہیں دیکھنے لوگ آ رہے ہیں۔"

رابعہ کی ساس نے کہا۔

"آپ فکر مت کیجئے......! میں ان کے آنے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔"

رابعہ نے آگے کچھ نہ سنا۔ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ ساری رات پریشانی میں گزر گئی۔ سلیم آ کر چپکے سے سو گیا۔ مگر اسے نیند نہ آئی۔ وہ جانتی تھی، وہ ان کے چنگل سے نہیں نکل سکتی۔ مگر وہ آخری کوشش کرنا چاہتی تھی۔

اسے سلیم کی ماں سے بھی شکایت نہ تھی۔ جن کی وہ بیٹی تھی، انہوں نے ہی اسے جہنم میں دھکیل دیا تھا تو سلیم کی ماں کے تو بیٹی ہی نہ تھی۔ اسے اس کا درد کیا معلوم..... ؟

صبح ابر آلود تھی۔ رابعہ اُٹھی اور ضروریات سے فارغ ہو کر وہ دریچے کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی ملازمہ اسے ناشتے کے لئے بلانے آئی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں......!''

رابعہ نے کہا اور کچھ سوچ کر سائیڈ ٹیبل پر پڑی ہوئی سلیم کی گاڑی کی چابی اُٹھائی اور پورچ کی طرف چلی گئی۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے باہر نکال رہی تھی جب سلیم کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ مگر رابعہ نے پلٹ کر نہ دیکھا اور گاڑی گیٹ سے باہر نکال لائی۔

''رابعہ......! رابعہ......!''

سلیم چیختا رہ گیا مگر وہ یہ جا وہ جا......!

گاڑی چلانا اسے سلیم نے شادی کے ابتدائی دنوں ہی میں سکھا دیا تھا لیکن اسے ابھی سڑکوں کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح گاڑی بھگائے لئے جا رہی تھی۔ اس کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے......؟ وہ اپنے حواس میں تھی ہی کب......؟



ٹھیک دو گھنٹے بعد رابعہ کی ماں کے گھر کے سامنے ایک گاڑی رُکی اور سب نے دیکھا، گاڑی سے رابعہ کی خون سے لت پت لاش باہر نکالی گئی۔ رابعہ کی ماں نے جب اسے دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے رابعہ کہہ رہی ہو۔

''دیکھو ماں......! میرے پاس یہی ایک راستہ تھا، تم سب سے

آزادی حاصل کرنے کا۔''

''مجھے معاف کرنا بیٹی......!''

رابعہ کی ماں اس کی لاش سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی۔

''مجھے اس گھر میں بیٹی یا بیٹوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا اور...... اور یہ دُنیا کی ریت ہے، عورت پر مرد کو، بہن پر بھائی کو، اور بیٹی پر بیٹوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ سو بیٹی مجھے معاف کرنا......! تمہاری طرح میرے پاس بھی یہی ایک راستہ تھا اور میں نے بیٹوں کو تم پر ترجیح دے دی۔''

وہ روتے روتے بے ہوش ہو کر گر گئی اور سلیم بغیر تدفین میں شرکت کئے گاڑی لے کر واپس چلا گیا، مگر گھر پہنچنا اسے بھی نصیب نہ ہوا۔

کچھ دیر بعد سلیم کے گھر کے سامنے ایک گاڑی رُکی اور سلیم کی خون میں لت پت لاش جب باہر نکالی گئی تو سلیم کی ماں یہ سب کچھ دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر گئی۔

خدا نے شاید اسے اپنے کئے کا بدلہ دے دیا تھا۔



اپنا گھر

تپتی دوپہر میں بس اسٹاپ پر کھڑے اسے بس کا انتظار کرتے ہوئے بے حد کوفت ہو رہی تھی۔ ایک مہینے سے مسلسل وہ اسی وقت اس اسٹاپ پر کھڑی ہوتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے یہ آگ برساتا موسم بہت حسین و دلکش لگتا تھا، وہ تو مجبوری کی وجہ سے روزانہ گھر سے نکلتی تھی۔ کیونکہ اسے سروس کی تلاش تھی۔

روزانہ وہ کہیں نہ کہیں انٹرویو دے کر آتی مگر نتیجہ اس کی مرضی کے برعکس نکلتا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ میٹرک پاس لڑکی تھی اور اس سے بیشتر ملازمت کرنے کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ تو گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے ملازمت کرنے لگی تھی۔

ماں بچپن میں ہی ساتھ چھوڑ گئی تھی اور باپ نے بھی اس کے میٹرک کرتے ہی اس دُنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔ باپ نے مرنے کے بعد کوئی بینک بیلنس یا کوئی بہت بڑی جائیداد تو چھوڑی نہیں تھی، جس کے سہارے وہ لوگ آرام سے زندگی گزار لیتے۔ نہ ہی گھر میں کوئی بڑا بھائی تھا جو کماتا۔ فریدہ سے بڑی ایک بہن تھی جس نے صرف مڈل تک پڑھا تھا۔

ریدہ سے چھوٹی کنیز تھی، جو مڈل میں پڑھ رہی تھی۔ کنیز سے چھوٹا عارف تھا و کنیز کے ساتھ ہی مڈل کلاس میں پڑھتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد گھر کا خرچ اب تک یا تو قرض سے چل رہا تھا یا پھر بڑی بہن نادرہ سلائی کر کے کچھ پیسے جمع کر لیتی۔

فریدہ کے نزدیک ہی قہقہوں کی آواز اُبھری تو وہ چونک پڑی۔ اس کے قریب ہی بے فکر طلباء ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر کے ہنسنے میں شغول تھے۔ اتنے میں بس آگئی۔ فریدہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اس کے اتھ اسٹاپ پر کھڑے دوسرے لوگ بھی بس کی طرف بڑھے مگر پھر واپس ٹ گئے۔ کیونکہ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مگر فریدہ پلٹنے کی بجائے بس پر ڑھ ہی گئی۔

یہ اور بات تھی کہ بیٹھنے کی بجائے اسے کھڑے ہی رہنا پڑا۔ ابھی ب دو منٹ ہی گزرے تھے کہ مدھم سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آپ اِدھر آجائیں......!"

فریدہ نے پلٹ کر دیکھا تو ایک خوبرو، اسمارٹ سا نوجوان اپنی یٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ فریدہ کا دل تو نہیں چاہتا تھا بیٹھنے کو، مگر چونکہ سٹاپ پر کافی دیر کھڑے رہنے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں دُکھنے لگی تھیں۔ ں لئے جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی اور جب اس کی منزل آئی تو خاموشی سے اُتر ئی۔

"بھئی......! نوکری تو تمہیں ملتی نہیں، خواہ مخواہ قرض کیوں بڑھا ہی ہو......؟"

نادرہ باجی نے چنگیر میں روٹی رکھتے ہوئے کہا اور فریدہ صرف کرا کر رہ گئی۔

"روزانہ بیس تیس روپے کرایے میں اُجاڑ دیتی ہو......؟"

فریدہ کے مسکرانے پر نادرہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"سامنے والی خالہ بلقیس پیسوں کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ابھی تو میں نے دو چار دن کے لئے ٹال دیا ہے۔ مگر کب تک......؟"

"باجی......! اللہ کے واسطے......! مجھ سے یہ باتیں نہ کریں، میں کیا کروں......؟ اُمید کی کوئی کرن نظر ہی نہیں آتی۔ لیکن آپ گھبرائیں نہیں......! صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے......!"

نادرہ نے سالن گرم کر کے روٹی کے اوپر ہی ڈالتے ہوئے کہا۔

"کنیز اور عارف کہاں ہیں......؟ نظر نہیں آ رہے۔"

"اندر پڑھ رہے ہوں گے۔ جانا کہاں ہے......؟"

نادرہ نے کہا اور فریدہ کے پاس سے اُٹھ گئی۔

فریدہ روزانہ اخبار سے کوئی نہ کوئی اشتہار دیکھ کر گھر سے نکل کھڑی ہوتی۔ مگر ہر بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ واپسی پر روزانہ فریدہ کی ملاقات اسی لڑکے سے ہوتی مگر فریدہ نے کبھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

آج بھی فریدہ کو بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں ملی تھی، اور وہ بس میں کھڑی تھی۔ بیٹھا وہ بھی نہیں تھا۔

جب فریدہ اپنے مخصوص اسٹاپ پر اُتری تو وہ بھی اسے کی ساتھ اُتر پڑا۔

"سنئے......!"

اس نے فریدہ کو بے نیازی سے آگے بڑھتے دیکھ کر پکارا۔

فریدہ جو اسے ایک نیک آدمی سمجھتی تھی، اس کے مخاطب کرنے پر تیوریاں چڑھا کر بولی۔

"کیا بات ہے......؟"

"آپ شاید سروس کی تلاش میں ہیں......؟"

اس نے فریدہ کے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی......! آپ کو کوئی اعتراض......؟"

فریدہ نے جھلا کر سختی سے کہا۔

"آپ تو ناراض معلوم ہوتی ہیں۔"

فریدہ کے جھلانے پر اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی ...کو زہر لگی۔ وہ بدستور تلخی سے بولی۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں......؟"

"میں کیا کہنا چاہتا ہوں......؟"

اس نے فریدہ کی جھلاہٹ پر مسکرا کر کہا، مگر پھر فوراً سنجیدگی سے

"میرا مطلب ہے اگر آپ سروس کی تلاش میں ہیں تو میں آپ کی ...لتا ہوں۔"

"کیا......؟"

فریدہ کے چہرے پر اُمید کی کرن پھوٹی تو وہ سر کو خم کر کے ...تے ہوئے بولا۔

"میرے ایک دوست کی فرم میں ایک سکریٹری کی جگہ خالی ہے۔ ...کہیں تو میں اس سے بات کروں......؟"

"ہاں ہاں......!"

فریدہ نے زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر چونکتے ہوئے

"لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں سروس کی تلاش میں ....؟"

"آپ کو پریشان دیکھ کر......! میں نے سوچا شاید آپ سروس کرتی ...کیونکہ ہمارے معاشرے میں جب کوئی لڑکی پابندی سے بس میں سفر

کرے تو یا وہ سروس کر رہی ہوتی ہے یا سروس کی تلاش میں ہوتی ہے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ......!"

فریدہ نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ کل کرشن نگر اسٹاپ پر میرا انتظار کیجئے گا۔ میں نو بجے کے قریب پہنچ جاؤں گی۔"

کہتے ہوئے فریدہ واپسی کے لئے مُڑی تو وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"اپنا تعارف تو کراتی جایئے......!"

"مجھے فریدہ کہتے ہیں۔"

فریدہ نے آہستہ سے کہا تو وہ زیر لب مسکرا کر بولا۔

"بندے کو نوید کہتے ہیں۔"

اور وہ تیزی سے ہجوم میں گم ہوگیا۔

دوسرے دن فریدہ مقررہ وقت پر گھر سے نکلی اور جب کرشن نگر اسٹاپ پر بس رُکی تو وہ فریدہ کا منتظر تھا۔ فریدہ کو دیکھ کر اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک رکشہ رُکنے کا اشارہ کیا اور پھر مزید فریدہ کو ساتھ لے کر رکشے میں بیٹھ گیا۔

رکشہ تیزی سے سڑکوں پر دوڑ رہا تھا اور فریدہ سوچ رہی تھی۔

"کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی، ایک اجنبی پر اتنا بھروسہ کچھ ٹھیک نہیں......!"

مگر اب کیا ہوسکتا تھا......؟ وہ خاموش بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔

رکشہ ایک جھٹکے سے رُکا تو فریدہ اُچھل پڑی۔

"آیئے......!"

نوید نے رکشے کا بل ادا کرتے ہوئے کہا۔

فریدہ رکشے سے اُتر آئی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو وہ ایک خوب صورت

سی عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔

فریدہ جھجکتی ہوئی نوید کے ساتھ عمارت میں داخل ہوگئی۔ نوید کی معیت میں جب وہ آفس میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لئے اس کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ بڑا ہی شاندار آفس تھا۔

اسی وقت سامنے فائلوں پر جھکا ہوا شخص ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"ارے نوید......! تم......؟ کہو یار......! کیسے آنا ہوا......؟"

"چند دن پہلے تم نے بتایا تھا کہ تمہیں ایک سکریٹری کی ضرورت ہے۔"

"ہاں ہاں......! کیوں نہیں......؟ تشریف رکھئے محترمہ......!"

قاسم نے فریدہ سے کہا۔

"ان کا انٹرویو لے لو......!"

نوید نے فریدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاسم سے کہا۔

"آپ کا نام......؟"

قاسم نے فوراً انٹرویو شروع کیا۔

"فریدہ......! تعلیم میٹرک۔"

فریدہ نے اس کے پوچھنے سے قبل ہی تعلیم کا بھی بتا دیا۔

"اس سے قبل سروس کرنے کا کوئی تجربہ......؟"

قاسم نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"اور ہاں......! آپ رہتی کہاں ہیں......؟"

گھر کا ایڈریس بتا کر فریدہ آہستہ سے بولی۔

"اس سے پہلے مجھے سروس کرنے کا کوئی تجربہ نہیں......!"

"خوب......!"

قاسم طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تعلیم میٹرک اور اس سے قبل سروس کا بھی کوئی تجربہ نہیں......؟

آئی ایم سوری......! آپ جا سکتی ہیں۔"

فریدہ نے ایک نظر قاسم کی طرف اور دوسری نظر نوید پر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

گھر آ کر اس کا کھانا کھانے کو بھی جی نہ چاہا۔

دوسرے دن جب کنیز اخبار اس کے سامنے پھینکتے ہوئے بولی۔

"یہ ایک جگہ سکریٹری کے لئے اشتہار ہے۔"

فریدہ نے اخبار اُٹھا کر دیکھا تو نفرت سے ناک سکیڑ کر رہ گئی۔ اشتہار قاسم کی فرم کا ہی تھا۔

ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ فریدہ نے اب سروس کی تلاش چھوڑ دی تھی۔

وہ اس دن بیٹھی دوپہر کا کھانا کھا رہی تھی جب کنیز ہاتھ میں ایک خط لئے اس کے پاس آئی۔ فریدہ نے حیرت سے خط چاک کیا۔ خط کو پڑھتے ہی اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور وہ خوشی سے چیخی۔

"باجی......! مجھے نوکری مل گئی۔"

دوسرے دن فریدہ آفس پہنچی تو دروازے میں ہی نوید مل گیا۔ فریدہ کو دیکھتے ہی خوشی سے بولا۔

"کیسی ہیں آپ......؟"

"اس دن تو میری چھٹی ہو گئی تھی، مگر آج یہ سب کیا ہے......؟"

فریدہ نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ بس......! قسمت کی بات ہے۔ مجھے قاسم نے بتایا تھا کہ آپ کو سروس مل گئی۔"

اس نے کیا کیا تھا......؟ وہ اس بات کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔

فریدہ نے اس پرخلوص انسان کو دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

"نوید صاحب......! میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔ آپ نے اگر

کچھ بھی نہیں کیا، تب بھی میں آپ کی معرفت ہی اس فرم میں آئی تھی۔ کیا ہوا اگر مجھے سکریٹری کی جگہ نہیں ملی......؟ کام تو مل گیا۔ چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو......؟ میں سخت ضرورت مند تھی۔"



فریدہ کو آج دوسری تنخواہ ملی تھی۔ پہلی تنخواہ میں سارا قرض چکا دیا تھا اور اب گھر کے حالات پہلے سے کہیں زیادہ پرسکون تھے۔ نوید اس دن کے بعد سے فریدہ کو کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

نہ جانے کیوں فریدہ ہر روز اس کی منتظر رہتی......؟

ایک دن سب لوگ چھٹی کر کے جا چکے تھے۔ مگر اس کا ابھی کچھ کام باقی تھا۔ کام مکمل کر کے جب وہ باہر آئی تو نوید، قاسم کے پاس کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ فریدہ کو دیکھ کر وہ زیر لب مسکرایا۔ مگر فریدہ منہ پھیر کر پاس سے گزر گئی تو وہ تیزی سے فرید کے پیچھے آتے ہوئے بولا۔

"کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی......؟"

"مجھ سے بات مت کیجئے......!"

فریدہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

نوید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ فریدہ نگاہوں میں پیار کی جوت لئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"فریدہ......!"

نوید کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ جی چاہا آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں بھر لے مگر ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے تبھی نوید نے آگے بڑھ کر اس کا سرد ہاتھ تھام لیا۔

"کیا کر رہے ہیں آپ......؟"

فریدہ کے رُخسار تپ اُٹھے۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ نوید

نے دھیرے سے ہاتھ چھوڑ دیا اور اسے لے کر قریب ہی ایک ریسٹورنٹ میں آ گیا۔ کیبن میں بیٹھتے ہی بیرا مینیو لے کر آ گیا۔ فریدہ نے صرف چائے کے لئے کہا مگر نوید نے ساتھ کھانے کا بھی آرڈر دے دیا۔

بیرے کے آنے تک دونوں میں خاموشی رہی اور پھر جیسے ہی بیرا ان کے آرڈر کی چیزیں رکھ کر گیا، نوید نے فریدہ کی طرف دیکھا اور اس کا ضدی ہاتھ تھام کر بولا۔

"میری تڑپ کا تمہیں اندازہ کیسے ہو گیا......؟ تم نہیں جانتیں، میں نے تمہارے اس اقرار کا کتنا انتظار کیا ہے۔"

"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے......!"

فریدہ نے اس کی نظر خود سے ہٹانی چاہی تو نوید زور سے ہنس دیا اور پھر کھانا کھاتے ہوئے اس نے بتایا۔

"میری صرف ایک ماں ہے جو گاؤں میں رہتی ہے۔ وہ اس اُمید کے سہارے جی رہی ہیں کہ میں کب ڈاکٹر بن کر ان کی خواہش پوری کروں۔"

"اب تم بتاؤ......! تمہاری فیملی میں کون کون ہے......؟"

کھانا کھانے کے بعد نوید نے فریدہ سے پوچھا۔

"والدہ کا انتقال بہت پہلے ہو چکا ہے۔ مجھ سے بڑی باجی ہیں، جن کی منگنی ابو جان اپنی زندگی میں کر چکے تھے۔ ایک بہن مجھ سے چھوٹی ہے اور اس سے چھوٹا ایک بھائی ہے۔ بس......! یہ میری فیملی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، اپنی فیملی کی سربراہ تم ہو......؟"

"یہی سمجھ لیجئے......!"

فریدہ مسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

دوسری صبح وہ آفس آئی تو ریاض اس کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ فریدہ کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے بولا۔

"کل آپ مسٹر نوید کے ساتھ کہاں گئی تھیں......؟"

"تمہیں کیسے پلا چلا......؟"

فریدہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"مجھے......؟"

ریاض شوخی سے مسکرایا۔

"میں اس وقت دیکھ رہا تھا۔"

"اُف......!"

فریدہ نے گھبرا کر سوچا۔

"اب تو یہ بات سارے آفس میں پھیل جائے گی۔"

"آپ گھبرائیں نہیں......! میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

ریاض نے کہا اور پھر دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تو دُور کھڑی

ا۔

"کیا بات ہے......؟ یہ صبح ہی صبح قہقہوں کی بوچھاڑ......! خیریت ں......؟"

"بالکل بالکل......!"

ریاض نے ہنس کر کہا تو سب لوگ معنی خیز انداز میں انہیں دیکھتے پنی سیٹوں پر جا بیٹھے۔

پھر تو ہر دوسرے تیسرے دن نوید سے ملاقات ہونے لگی۔

"آج باجی کی ساس آئی تھیں۔"

کنیز نے روٹی کھاتے ہوئے اسے اطلاع دی۔ نادرہ آپی روٹیاں تھی۔ کنیز کی بات پر کچھ بولی نہیں۔ بس خاموشی سے روٹیاں پکاتی

"کیا کہتی تھیں......؟"

فریدہ نے پوچھا۔ کنیز کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نادرہ باجی بول

پڑیں۔

''کہیں گی کیا......؟ شادی کی بات پکی کرنے آئی تھیں۔''

فریدہ کے استفسار پر نادرہ توے پر روٹی ڈالتے ہوئے بولی۔

''تم خود ہی سوچو......! تم لوگوں کو چھوڑ کر میں بیاہ کیسے کر سکتی ہوں......؟ اور پھر ابا کو فوت ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا......؟''

''ابا کی بات چھوڑیں باجی......! مرنے والوں کے ساتھ دُنیا کے کام تو نہیں رُک جاتے......؟ اور پھر ہم بچے تو ہیں نہیں، جو آپ ہماری وجہ سے شادی سے انکار کر دیں......؟ کنیز اور عارف کے پاس میں جو ہوں، اب کے وہ لوگ آئیں تو آپ ان سے کہہ دیجئے گا کہ وہ بیاہ کی تیاری کر لیں۔ میں کچھ ایڈوانس لے لوں گی۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہوگی کہ آپ اپنے گھر کی ہو جائیں......!''

باپ کی پہلی برسی ہوتے ہی نادرہ کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ فریدہ نے آفس سے پندرہ روز کی چھٹی لے لی۔ جب وہ آفس سے باہر آئی تو نوید اس کا منتظر تھا۔

''کیا بات ہے......؟ بہت خوش نظر آ رہے ہو......!''

فریدہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''بات ہی خوشی کی ہے۔''

نوید نے دلنشیں نظروں سے اسے تکتے ہوئے کہا۔

''تب تو جلدی سے بتا دو......!''

فریدہ بھی شوخ ہوگئی۔

''یہاں نہیں......!''

نوید نے کہا اور اسے قریب ہی ریستوران میں لے آیا۔

''اب بتا بھی دو......! کیا بات ہے......؟''

فریدہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''حکومت مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیج رہی ہے۔ معلوم نہیں کب بلاوا آ جائے......؟''

''اچھا......!''

فریدہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ مگر دل ایک دم اُداس ہوگیا۔ اس کے باوجود آہستہ سے بولی۔

''میری باجی کی شادی ہو رہی ہے۔''

''ارے......! کب......؟''

نوید نے اس کی اُداسی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''مگر میں تمہیں دعوت نہیں دے سکتی۔''

فریدہ نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تو نوید بولا۔

''وہ کیوں......؟''

''باجی کو تمہارے بارے میں کیا بتاؤں گی......؟''

فریدہ نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''کہہ دینا، میں تمہارے آفس میں کام کرتا ہوں۔''

''نہیں بھئی......! آفس سے تو میری سہیلیاں جائیں گی، ریاض بھی شرکت کرے گا اور ویسے بھی تم اپنے جانے کی تیاری کرو......! معلوم نہیں کب بلاوا آ جائے......؟ مگر بس سٹاپ پر ملی ہوئی اس لڑکی کو بھول مت جانا......!''

یہ کہتے ہوئے فریدہ کی آواز بھرا گئی اور وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم بھولنے والی چیز نہیں ہو فریدہ......!''

نوید اُٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

''میں جہاں بھی رہا، تمہیں یاد رکھوں گا۔ البتہ تم بھی مجھے بھول نہ جانا......؟''

نادرہ باجی کی شادی ہوتے ہی فریدہ کو بخار نے آن لیا۔ ایک ہفتہ بعد جب وہ آفس آئی تو سب لوگوں نے اس کا بھرپور انداز میں استقبال کیا اور جب وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی تو ریاض مسکراتا ہوا اس کے پاس آیا اور بڑی خاموشی سے ایک لفافہ اس کے آگے ڈال کر بولا۔

”یہ نوید صاحب دے کر گئے ہیں۔“

فریدہ نے فوراً لفافہ چاک کیا اور پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

”فریدہ ڈیئر......!

باجی کی شادی کے بعد بھی تم آفس نہیں آئیں۔

جبکہ میں جا رہا ہوں اور ریاض کو تمہارے لئے ایک خط دے کر جا رہا ہوں۔ وہاں پہنچتے ہی میں تمہیں اپنی خیریت کی اطلاع دوں گا۔ گھبرانا نہیں......! صرف چند سالوں کی بات ہے۔ میں لوٹ آؤں گا۔

خدا حافظ......!

تمہارا نوید......!“

”ارے......! تو کیا نوید چلا گیا......؟“

فریدہ نے افسردگی سے کہا تو ریاض شوخی سے بولا۔

”گھبرایئے نہیں......! وہاں پہنچتے ہی خط لکھے گا۔“

ریاض کی بات سن کر فریدہ بے جان سی مسکراہٹ کے ساتھ فائل دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے ریاض......؟ آج کام کرنے کا ارادہ نہیں......؟“

حسنہ نے اپنی جگہ سے ہانک لگائی تو ریاض دھیرے سے مسکرا دیا۔

آفس میں سب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ریاض، فریدہ سے محبت کرتا ہے۔ جب بھی ریاض، فریدہ کے پاس جاتا، وہ لوگ ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگتے۔ فریدہ نے کبھی اس بات کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی

نوید کو گئے تین مہینے ہو چکے تھے مگر اس کے بارے میں فریدہ کو
ـ کوئی اطلاع نہیں ملی تھی کہ وہ کہاں ہے......؟ اور کس حال میں
..؟

کنیز اور عارف کے لئے اس نے اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا

کنیز کا میٹرک کا رزلٹ آؤٹ ہوتے ہی جب ریاض نے اس
ئے فریدہ سے بات کی تو فریدہ ششدر سی اسے دیکھتی رہ گئی اور جب
نے یہ کہا کہ تم نے کنیز کے بارے میں یہ فیصلہ کیوں کیا تو وہ سادگی
ـ

”تمہاری باجی کی شادی پر میں نے اسے دیکھا تھا، تب ہی فیصلہ
تھا۔“

”ٹھیک ہے......!“

فریدہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

”تم اپنی ماں کو بھیجنا، وہ بات پکی کر جائیں۔ میں خود بھی آج
ـ بات کروں گی۔“

”میری ماں نہیں ہے فریدہ......! بس ایک بہن ہے اور وہ بھی
ہدہ۔ اگر تم ہاں کر دو تو میں انہیں بھیج دوں گا۔“

”انکار کی گنجائش کہاں ہے......؟ تم میرے دوست ہو۔ انہیں بھیج
ں انتظار کروں گی۔“

دوسرے دن ریاض کی بہن آئی تو فریدہ کی باجی بھی موجود تھیں۔
کے بارے میں فریدہ انہیں تفصیل سے بتا چکی تھی۔ اس لئے نادرہ
ہاں کر دی۔

کچھ دن بعد ہی کنیز کی شادی نہایت ہی سادگی سے ریاض کے

ساتھ ہوگئی۔ اب فریدہ کے سر پر صرف عارف کا بوجھ تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر ایک اچھا آدمی بن جائے۔

نادرہ اپنے گھر میں خوش تھی اور کنیز بھی اچھے گھر گئی تھی۔ عارف فرسٹ ائیر میں داخلہ لے چکا تھا۔ شادی کے بعد ریاض نے بہت کوشش کی کہ فریدہ اور عارف اس کے گھر آجائیں، مگر فریدہ نے یہ منظور نہیں کیا۔ وہ کسی پر بوجھ بن کر زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی۔

بی۔اے کرتے ہی عارف کو بینک میں اکاؤنٹنٹ کی جگہ مل گئی اور اس کے مجبور کرنے پر فریدہ نے سروس چھوڑ دی۔ فریدہ کے سروس چھوڑتے ہی ریاض بھی زیادہ تنخواہ کی آفر پر دوسری فرم میں چلا گیا۔

عارف کو سروس کیا مل گئی تھی، کنیز اور نادرہ اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں کہ شادی کرو۔ عارف نے بھی بڑے سعادت مند بچے کی طرح بڑی بہنوں کے آگے سر جھکا دیا۔ عارف کی شادی ہوگئی اور فریدہ یہ سوچتی رہی۔

''کیا واقعی دُنیا مطلب پرست ہے......؟''

باجی اور کنیز نے ایک بار بھی تو اس کی شادی کا ذکر نہیں کیا۔

عارف کی شادی کے بعد گھر کا سارا کام فریدہ نے خود سنبھال لیا۔

دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔ ایک سال اس طرح گزر گیا کہ پتا بھی نہ چلا۔ عارف ایک خوب صورت بچے کا باپ بن گیا۔ وہ فریدہ کو اپنے بچے سے بھی زیادہ پیار کرتا جو فریدہ کی بھابی کو ناگوار گزرتا۔

پھر رفتہ رفتہ گھر میں کشیدگی جنم لینے لگی۔ دونوں میاں بیوی کی اس کشیدگی کو فریدہ نے بھی محسوس کیا اور جب عارف کا آفس سے آنے کا وقت ہوتا تو اس کی زیادہ تر یہی کوشش ہوتی کہ وہ اپنے کمرے میں چلی جائے۔

عارف کی بیوی نے اسے عارف کے سامنے اور ہی رنگ میں پیش کیا اور کہنے لگی۔

''سارا دن اسی طرح کمرہ بند کر کے پڑی رہتی ہیں۔ میں گھر کا
کروں، مُنّا سنبھالوں یا کہ ہنڈیا روٹی کروں......؟ آپ سمجھایئے ناں جا
پنی لاڈلی بہن کو......!''

''راشدہ......! وہ تمہاری نوکر نہیں، میری بڑی بہن ہے۔ اس کے
پر بہت سے حسانات ہیں جنہیں میں اُتار نہیں سکتا۔ تم گھر کے کام کاج
لئے کوئی نوکر رکھ لو۔ خدا کا دیا بہت کچھ ہے۔''

''گھر میں ایک نوکر کے ہوتے ہوئے میں دوسری نوکر کیوں
ں......؟''

راشدہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی تو عارف غصے سے بڑبڑاتا ہوا اُٹھ
چلا گیا۔

کشیدگی کم ہونے کی بجائے بڑھنے لگی۔ قبل اس کے کہ کشیدگی
ہ بڑھتی، نادرہ ان لوگوں سے ملنے آئی اور فریدہ کو اپنے ساتھ لے گئی۔

فریدہ بھی نادرہ کے گھر آکر کچھ بہل سی گئی۔ نادرہ اسے کام نہ
نے دیتی۔ شاید اسے احساس تھا کہ اس نے ہمارے لئے بہت کچھ کیا
۔ فرید سارا دن نادرہ کی اکلوتی بیٹی چھ سالہ ہما کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ مگر
ا اس کی قسمت میں سکون نہیں تھا۔

نادرہ کا میاں جب بھی اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتا تو وہ
را سی جاتی۔ نادرہ کا میاں ضرورت سے زیادہ اس کے قریب رہنے کی
ش کرتا۔ شاید وہ جانتا تھا۔ یہ خزاں رسیدہ پتے کی مانند ہے، جسے جس
ی چاہے اُٹھا لے۔

فریدہ زیادہ تر نادرہ کے ساتھ لگی رہتی۔ مگر نادرہ کا میاں ہمیشہ
، یہ کہہ کر کمرے سے باہر بھیج دیتا۔

''بھئی......! یہ تو مہمان ہے، تم خود اُٹھو اور کام کرو۔''

ایسے میں فریدہ بھی فوراً اُٹھ کر نادرہ کے ساتھ ہو لیتی۔ آخر جب

پانی سر سے گزرنے لگا تو وہ واپس بھائی کے گھر لوٹ آئی۔

راشدہ، جس نے اس کے جانے کے بعد سکھ کا سانس لیا تھا، پھر بڑبڑانے لگی۔ فریدہ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر کام کاج میں مصروف ہو جاتی۔ مگر ایسے میں نوید اسے شدت سے یاد آتا اور وہ کہتی۔

''کاش نوید......! میں نے تم سے محبت نہ کی ہوتی۔ تمہارا اعتماد نہ کیا ہوتا۔''

سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بھر آتیں۔

رات اسے معمولی سی حرارت ہوگئی تھی جس نے بعد میں تیز بخار کی شکل اختیار کر لی۔ مگر وہ اس کے باوجود گھر کا سارا کام کاج کر رہی تھی۔

جگ صاف کر کے اس نے جیسے ہی الماری میں رکھنا چاہا، وہ ہاتھ سے گرا اور وہ ٹوٹ گیا۔ کرچیاں زمین پر بکھر گئیں۔ راشدہ کو تو بولنے کے لئے بہانہ چاہیئے تھا۔ اس نے جو بولنا شروع کیا تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیا۔

ابھی وہ اول فول بک ہی رہی تھی کہ کنیز اپنے دونوں بچوں کے ساتھ آن پہنچی اور راشدہ کو بڑبڑاتے دیکھ کر برقعہ اُتارتے ہوئے بولی۔

''بھابی......! شرم کرو......! تمہاری بڑی نند ہے۔''

''تم چپ رہو جی......!''

راشدہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔

''نند نہ ہوئی میری سوکن ہوگئی......؟''

''زبان سنبھال کر بات کرو......!''

کنیز بدتمیزی پر اُتر آئی۔

''اگر زیادہ ہمدردی ہے تو اسے اپنے ساتھ لے جاؤ......!''

راشدہ تیوریاں چڑھا کر بولی۔

''میری تو زندگی عذاب بنا دی ہے اس نے۔''

''تم گھبراؤ نہیں......! اب میں انہیں تمہارے پاس نہیں رہنے

دوں گی۔ مگر عارف کو تو آ لینے دو۔ اس سے دو دو باتیں کر کے جاؤں گی کہ اس دن کے لئے پڑھایا لکھایا تھا......؟''

کنیز کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ عارف جلد ہی گھر آ گیا اور جب کنیز نے فریدہ کے بارے میں بات کی تو عارف یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر کمرے میں چل گیا۔

''کنیز......! اب میں تم لوگوں کی خاطر اپنا گھر تو برباد نہیں کر سکتا......؟ میں گھر سے ایک بچے کی ماں کو نکال دوں......؟ بہتر یہ ہوگا کہ تم انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ......!''

کنیز نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور فریدہ کو اپنے ساتھ لے آئی۔

کنیز کے گھر آ کر فریدہ کی صحت پہلے سے کافی بہتر ہوگئی۔ کنیز کے دونوں بچے اس سے چپکے رہتے۔ آفس سے واپس آنے کے بعد ریاض کی بھی یہی کوشش ہوتی کہ اس کا دل بہلائے۔ وہ جانتا تھا نوید نے جانے کے بعد ایک بار بھی اس کی خیریت دریافت نہیں کی۔ اس نے فریدہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ نوید کو ڈھونڈ کر اس کے پاس ضرور لائے گا۔

کنیز گھر کا سارا کام خود کرتی۔ فریدہ کو ہاتھ ہلا کر پانی بھی نہ پینے دیتی۔ ریاض کو فریدہ بہنوئی کی بجائے آج بھی اپنا دوست ہی سمجھتی تھی اور پھر وہ تھا بھی تو اس کا دوست ہی۔

کنیز نے کئی بار مذاق ہی مذاق میں ریاض کو کہا تھا کہ فریدہ کا نام نہ لیا کرے، اسے باجی کہا کرے۔ کیونکہ کنیز کا کہنا تھا کہ فریدہ مجھ سے بڑی ہے۔ اس لئے اس کا نام اسے نہیں لینا چاہیئے۔ مگر ریاض کنیز کی اس بات کو ہنس کر ٹال دیتا۔

تین مہینے پلک جھپکتے گزر گئے۔ فریدہ بھاوج کی تلخ باتیں بھول چکی تھی۔ فریدہ کا کام بس یہ تھا مطالعہ کرتی، وقت پر اسے ناشتہ اور کھانا مل

جاتا۔ مگر اچانک یہاں بھی فریدہ نے ایک تبدیلی محسوس کی۔ بات کوئی ایسی بڑی نہ تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس بات کو معمولی انداز میں لیتا مگر چونکہ فریدہ ایک بار ایسے حالات سے گزر چکی تھی۔ اس لئے فوراً سنبھل گئی۔

بات صرف اتنی تھی کہ فریدہ کمرے میں پڑھ رہی تھی۔ کنیز اس وقت دوپہر کا کھانا پکا رہی تھی، اور دونوں بچے برآمدے میں کھیل رہے تھے۔ کھیلتے کھیلتے دونوں بچے آپس میں لڑ پڑے اور پھر جب دونوں نے رونا شروع کیا تو سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔

فریدہ چونکہ مطالعہ میں مستغرق تھی، شور پر متوجہ نہ ہو سکی۔ وہ تو اس وقت چونکی جب کنیز دونوں بچوں کو پیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تم دونوں کو کوئی میرے سوا سنبھال بھی نہیں سکتا۔ گھر کا کام کروں، کھانا وغیرہ پکاؤں یا تم دونوں کو سنبھالوں......؟ مر کیوں نہیں جاتے آخر تم دونوں......؟''

''ارے ارے......! کیا ہوا......؟ کیوں مار رہی ہو بچوں کو......؟''

فریدہ نے آکر دونوں بچوں کو کنیز سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ دونوں بچے فریدہ کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئے۔

''کچھ نہیں ہوا......!''

کنیز غصہ برساتی نگاہوں سے بچوں کو گھورتے ہوئے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی اور پھر بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ فریدہ دونوں بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

دوپہر کے کھانے پر جب ریاض گھر واپس آیا تو فریدہ دونوں بچوں کو لے کر اس کی طرف گئی اور پھر دروازے پر ہی رُک گئی۔ ریاض کہہ رہا تھا۔

''بچے کہاں ہیں......؟ اور ہاں......! فریدہ نے کھانا کھا لیا......؟''

جواب میں اسے کنیز کی تلخ آواز سنائی دی تھی۔

''وہ کیا بچی ہے جو میں اسے کھانا دینے جاؤں......؟ پکا کر رکھ تو ٹھ کر کھا بھی نہیں سکتی......؟''

فریدہ دونوں بچے دروازے پر ہی چھوڑ کر چپکے سے چلی آئی اور سوچ کر تلخی سے ہنس دی۔

''ایک دن مہمان، دو دن مہمان، تیسرے دن بلائے جان ہوتا مگر میری بہن نے تو میری تین مہینے خدمت کی ہے۔ میں یہ کیوں گئی ہوں کہ یہ میرا اپنا گھر نہیں، میری بہن کا گھر ہے۔ میں نے بہت کیا ہے۔ اب مجھے کام کرنا چاہئے۔''

کھانا کھانے کو تو اس وقت فریدہ کا جی نہیں چاہا۔ البتہ جب اس یہ دیکھا کہ کنیز کھانا کھانے کے بعد برتن باورچی خانے میں رکھ گئی ہے خاموشی سے اُٹھی اور باورچی خانے میں جا کر برتن دھونے لگی۔

ریاض کے جانے کے بعد جب کنیز باورچی خانے میں آئی تو اس نکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''شاید اس نے میری ساری باتیں سن لی ہیں......؟''

سب سے پہلا خیال کنیز کے ذہن میں یہی آیا۔ اور وہ کھسیانی سی بولی۔

''ارے فریدہ......! تم برتن دھو رہی ہو......! خیریت تو ہے......؟ ہاں......! کھانا کھا لو۔ آج ریاض کو بڑے زور کی بھوک لگی تھی، اس پہلے اسے دینے چلی گئی۔ اُٹھو اُٹھو......! میں خود برتن صاف کرتی ۔ تم کھانا کھا لو......!''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ ویسے بھی پڑے پڑے طبیعت اُکتا سی گئی ۔ کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

''اچھا......! پھر جیسے تمہاری مرضی......!''

کنیز نے آہستہ سے کہا جیسے فریدہ ابھی برتن چھوڑ کر اُٹھ نہ

جائے۔ وہ فوراً باہر چلی گئی اور فریدہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

دوسرے دن جب ریاض دوپہر کا کھانا کھانے آیا تو سیدھا باورچی خانے کی طرف گیا اور فریدہ کو روٹیاں پکاتے دیکھ کر ششدر سا رہ گیا۔

''ارے ارے......! یہ تبدیلی کیسی......؟''

پھر وہ بے تکلفی سے فریدہ کی طرف جھکا اور اسے بازو سے پکڑ کر کنیز کی طرف لے آیا۔

''کمال ہے بھئی......! تم یہاں بچوں کے پاس بیٹھی ہو اور سالی صاحبہ روٹی پکا رہی ہیں......؟''

ریاض کا فریدہ کے ساتھ بے تکلفی اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ مگر اس کے باوجود خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

''میں نے تو بہت روکا، اب آپ روک کر دیکھ لیجئے......!''

قبل اس کے کہ ریاض پلٹ کر فریدہ کو کچھ کہتا، فریدہ اپنا بازو چھڑا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

رفتہ رفتہ فریدہ نے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا۔ پہلے پہل تو کنیز نے برائے نام فریدہ کو دبے دبے لہجے میں منع کیا۔ مگر پھر کہنا چھوڑ دیا۔ فریدہ جانتی تھی کہ یہ ایک فرض ہے جو پورا کرنا وہ جانتی ہے۔ دن تو سارا کام کاج کی نذر ہو جاتا، مگر رات کی سیاہی پھیلتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگتا اور پھر وہ گھبرا کر سوچتی۔

''اتنی طویل رات کیسے کٹے گی......؟''

دو سال بڑی خاموشی سے گزر گئے۔ ان دو سالوں میں وہ مستقل کنیز کے گھر رہی تھی۔ اس کی حیثیت ایک نوکرانی جیسی تھی مگر پھر بھی بھاوج کی طرح کنیز باتیں نہیں کرتی تھی۔

ریاض آج بھی اس کا خیال ایک دوست کی طرح رکھتا۔ عارف کبھی کبھار اپنی بیوی کے ساتھ کنیز کو ملنے آتا اور چند رسمی باتیں کر کے چلا

ا۔ نادرہ بھی اپنے میاں کے ساتھ آتی مگر فریدہ کو کبھی ساتھ لے جانے لئے اس نے اصرار نہیں کیا تھا۔ البتہ اس کا میاں زور دیتا مگر فریدہ وں، ہاں'' کر کے ٹال دیتی۔

چھٹی کا دن تھا جب ریاض نے خاص طور پر کنیز کے ہاتھ کا کھانا انے کی فرمائش کی تھی اور خود فریدہ کے ساتھ لوڈو کھیلنے بیٹھ گیا تھا۔ کنیز خوشی خوشی دو قسم کے کھانے تیار کئے۔ کھانا پکانے کے بعد اچھی طرح ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کیا اور پھر دری بچھا کر کھانا رکھنے کے بعد ریاض اطلاع دی اور ساتھ میں فریدہ کو بھی لے آئی۔

ریاض نے حسب معمول کھانا کھایا اور کنیز جو یہ سوچ رہی تھی کہ ل کا پہلا چمچ منہ میں ڈالتے ہی اس کی تعریف میں ساتوں آسمان زمین کر دے گا، اس کی خاموشی پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی اور ریاض تو یہ ل ہی چکا تھا کہ اس نے فرمائش کر کے آج کھانا پکوایا ہے۔ اس نے تو ں اس لئے کنیز سے کھانے کا کہا تھا کہ فریدہ مسلسل کام کر کے تھک چکی ی۔

ریاض جلدی سے کھانا کھا کر اُٹھ گیا تو کنیز نے بھی کھانے سے ر کھینچ لیا اور غصے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا کھانا اچھا نہیں لگا......؟''

کنیز نے بڑے پیار سے ریاض سے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟''

اس نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کی فرمائش پر تو میں نے اتنے پیار سے کھانا پکایا اور آپ تعریف بھی نہیں کی۔''

''میں نے فرمائش کی تھی......؟''

ریاض سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بے خیالی میں بڑبڑایا اور پھر

بڑے زور سے چونکا۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ پھر وہ اپنی خفت مٹانے کے لئے تیزی سے کنیز کی طرف پلٹتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

''کھانا تم نے بہت اچھا پکایا ہے ڈیئر......! مگر میں کچھ سوچ رہا تھا۔ اس لئے کھانا کھاتے ہوئے کچھ کہہ نہ سکا۔''

کنیز کوئی بچی نہ تھی جو ریاض کی اس بات سے بہل جاتی۔ کچھ سوچ کر ریاض سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔

''میں سوچ رہی ہوں فریدہ کو نادرہ باجی کے گھر بھیج دیں۔ نادرہ کا میاں بھی کئی بار مدعو کر چکا ہے۔''

''نہیں کنیز......! یہ ناممکن ہے۔ باجی کے میاں کے آثار مجھے کچھ اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ ویسے بھی وہ کوئی ٹھیک آدمی نہیں، اور پھر فریدہ کے یہاں رہنے میں کیا حرج ہے......؟''

''آپ تو ٹھیک ٹھاک آدمی ہیں ناں......؟''

کنیز نے دبے دبے لہجے میں طنز کیا جسے سمجھتے ہوئے بھی ریاض اس کی طرف پیار سے جھکتے ہوئے بولا۔

''کیا ہم پر اتنا اعتماد بھی نہیں......؟''

اس دن کے بعد سے کنیز کافی محتاط ہوگئی۔ یوں تو فریدہ سارا دن کام میں مصروف ہوتی، پھر بھی جب کبھی کنیز اسے ریاض کے ساتھ باتیں کرتا دیکھتی تو فوراً سب کام چھوڑ کر ان کے سر پر پہنچ جاتی۔

پھر اس کا شک رفتہ رفتہ یقین میں بدلنے لگا۔ اکثر وہ دیکھتی کہ ریاض اور فریدہ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں اور جب کنیز پاس جاتی ہے تو یوں خاموش ہو جاتے جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گی اور بڑبڑاتے ہوئے واپس چلی آتی۔

گھر کی فضاء ایک دم تلخ ہوگئی۔ اب کنیز، فریدہ سے تو کچھ کہنے

رہی، مگر ریاض کو دبے دبے الفاظ میں جتانا شروع کر دیا کہ وہ اس کی ف سے لاپرواہ ہوتا جا رہا ہے۔ ریاض اس کے شک کو اچھی طرح سمجھتا اور اکثر دُکھ سے سوچتا۔

''کیا یہ وہی بہن بھائی ہیں جن کے لئے اس نے اپنی زندگی داؤ لگائی......؟ راشدہ تو چلو غیر ہے، مگر یہ سگی بہن ہو کر کتنا غلط سوچ رہی ہے......؟''

اور پھر اس دن تو حد ہی ہوگئی۔ فریدہ باورچی خانے میں شام کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ دونوں بچے ساتھ والے گھر میں ٹیوشن پڑھنے گئے ہوئے تھے اور کنیز اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے کچھ سوچ رہی تھی۔ ریاض کا سکوٹر آ کر رُکا اور کنیز کا دل خوشی سے اُچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ کھڑکی میں کھڑی یہی سوچ رہی تھی کہ کاش آج ریاض جلد آجائے اور کوئی فلم دیکھیں۔

مگر اچانک اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ جب ریاض اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا تیزی سے باورچی خانے میں داخل ہوگیا۔ کنیز کا مارے غصے کے خون کھول کر رہ گیا۔

ادھر ریاض کو باورچی خانے میں دیکھ کر فریدہ گھبرا سی گئی۔ کنیز کے خیالات اس پر عیاں تھے۔ اس لئے ریاض کو دیکھتے ہی بولی۔

''آج کیا بہت زور کی بھوک لگی ہے......؟ تم چلو، میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔''

''کھانے کو چھوڑو فریدہ......! آج میری بھوک یقیناً ایک مہینے کے لئے اُڑ گئی ہے۔ اب تم جی بھر کر کھایا کرنا۔''

ریاض نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات مکمل کی تو فریدہ بولی۔

''خیریت تو ہے......؟''

"خیریت اب کہاں......؟"

ریاض ایک طرف رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تمہارے لئے خوش خبری ہے۔ ذرا دل تھام کر بیٹھو......!"

ریاض نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اونہہ......! خوش خبری اور میرے لئے......؟"

فریدہ تلخی سے ہنسی۔

"میں نے خوشی کا انتظار کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

"تم تو پاگل ہو مگر میں تو ہوش میں ہوں۔"

ریاض سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"کبھی میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا۔ میں نے تم سے کہا تھا جب تک میں زندہ ہوں، نوید کی تلاش جاری رکھوں گا اور اسے تمہارے پاس لاؤں گا۔"

"تو کیا......تو کیا......نوید مل گیا......؟"

جذبات کی شدت سے فریدہ کی آواز بھرا گئی۔

"ہاں......! نوید مل گیا۔"

ریاض پرسکون انداز میں کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"نوید مل گیا......؟ مگر...... مگر کب......؟ کیسے......؟ کہاں......؟ مجھے اس کے پاس لے چلو......!"

فریدہ نے ریاض کا بازو پکڑ لیا۔

"صبر کرو......! تم نے ایک ساتھ اتنے سوال کئے ہیں، جواب کیسے دوں......؟"

ریاض اس کی آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر دھیرے سے بولا۔

"بہرحال سنو......! آج میں کرسچین اسپتال میں اپنے ایک دوست

عیادت کے لئے گیا۔ جب میں اس کی عیادت کر کے باہر نکلا تو نوید
، ڈاکٹر سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا مگر
ے پہنچنے سے پہلے ہی وہ قریب کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا۔ میں
جلدی سے اس ڈاکٹر سے اس کا ایڈریس پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلاتے
ے بولا۔

"آئی ایم سوری......! مجھے ان کا ایڈریس معلوم نہیں......!"

میرے زیادہ اصرار کرنے پر کہنے لگے۔

"پہلے یہ کسی اور اسپتال میں تھے۔ آج ان کا یہاں پہلا دن تھا۔
ں کل آکر ان سے مل لیجئے گا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ نوید تمہیں مل جائے گا......؟"

فریدہ نے خوشی سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"ارے بھئی......! نہ ملنے والی بات کون سی ہے......؟ میں صبح
ں سے چھٹی کروں گا اور نوید کو فوراً تمہارے پاس لے آؤں گا۔ مگر یہ
......؟ خوشی کے موقع پر بھی تم رو رہی ہو......؟"

کنیز جب باورچی خانے کے پاس آئی تو اندر سے دھیمی دھیمی
یوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کھولتی ہوئی اس وقت واپس کمرے میں چلی
۔

اور جب ریاض تھوڑی دیر بعد کمرے مین آیا تو اس نے پلٹ کر
ں کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ ریاض نے بھی اس بات کو
نداز کر دیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔

صبح ریاض کافی دیر سے اُٹھا۔ اس نے ناشتہ کیا اور پھر کپڑے
ل کر کے باورچی خانے کی طرف چلا آیا۔ کنیز اسے باورچی خانے کی
ے بڑھتے دیکھ کر فوراً اس کے پیچھے لپکی اور جب وہ باورچی خانے کے
ب پہنچ گئی تو اندر سے ریاض کی آواز آئی۔

"میرے جانے کے بعد گھبرانا نہیں، بس یہ سمجھو، میں گیا اور آیا......!"

"مگر ریاض......! کنیز......"

"کنیز کی بات کو تم اس وقت چھوڑ دو......!"

ریاض اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"اس کو بعد میں دیکھ لوں گا۔ اس وقت مجھے تمہاری فکر ہے۔ اچھا خدا حافظ......!"

اتنا کہہ کر ریاض باہر نکلا اور کنیز کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر ایک لمحے کے لئے چونکا اور پھر مسکراتا ہوا اسکوٹر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی کنیز غصے میں کھولتی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی اور فریدہ کے بازو کو جھٹکا دے کر کھینچتے ہوئے بولی۔

"یہ سب میں کیا دیکھ رہی ہوں......؟"

"کیا دیکھ رہی ہو......؟"

فریدہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو......؟ بڑی بھولی ہو ناں......؟"

کنیز زہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"بھولی بننا چھوڑ دو......! میں سب کچھ جان چکی ہوں۔ سب کچھ سمجھتی ہوں۔"

کنیز زور زور سے بولتی ہوئی باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔ فریدہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے آئی اور اسے جھنجوڑتے ہوئے بولی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو......؟"

"یہ بکواس ہے......؟"

کنیز پاؤں پٹخ کر دھاڑی۔

"اور وہ کیا تھا جو تم ریاض سے کر رہی تھی......؟"

"کنیز......! ہوش میں رہ کر بات کرو......!"

فریدہ غصے سے کانپتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں......! اب تو یہی کہو گی۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنے کانوں سے سنا ہے۔ کسی اور کی کہی ہوئی بات ہوتی تو اور بات تھی۔ میں پوچھتی ہوں، تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہ آئی......؟"

فریدہ بولی۔

"کنیز......! تم نہیں جانتیں، تم اس وقت کیا کہہ رہی ہو......؟"

"میں سب جانتی ہوں۔ تم مجھے اب چپ نہیں کروا سکتیں۔ ریاض پر ڈاکا ڈالنے سے پہلے تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ یہ تمہاری بہن کا گھر ہے۔ کوئی اور نہ ملا......؟ اگر زیادہ ہی شوق تھا تو بیاہ کر لیا ہوتا......؟ میرے بچوں کو باپ کے ہوتے ہوئے یتیم کرنا چاہتی ہو......؟"

"کنیز......! یہ تو مجھ سے کہہ رہی ہے......؟ میں تیری بہن ہوں۔ میں ایسا کیسے کر سکتی ہو......؟ میرا اپنا گھر ہوتا تو مجھے تم لوگوں کے گھر آنے کی کیا ضرورت تھی......؟ میں نے اپنے ہاتھوں سے تیرا بیاہ ریاض کے ساتھ کیا ہے۔ پھر میں یہ نیچ حرکت کیسے کر سکتی ہوں......؟"

"کیوں نہیں کر سکتیں......؟ ولیمہ والے دن میں نے تمہاری دوستوں کے منہ سے سنا تھا کہ پیار تو یہ خود ریاض سے کرتی ہے اور بیاہ بہن سے کیسے کر دیا......؟ اور میں یہ سوچ کر چپ رہی کہ میری بہن ایسی نہیں ہو سکتی۔ مگر آج تم نے بتا دیا کہ تم واقعی نیچ ہو۔"

"کنیز......! اب تم سے کچھ کہنا بے کار ہے۔"

فریدہ نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ کنیز اس کے جانے کے بعد اسے اونچی اونچی آواز میں کوستی رہی مگر اچانک اسے خاموش ہو جانا پڑا۔ کیونکہ ریاض کے ساتھ ایک اسمارٹ سا

آدمی گھر میں داخل ہوا تھا۔

''کنیز......! فریدہ کہاں ہے......؟''

ریاض نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا تو کنیز، نوید کا خیال کئے بغیر بولی۔

''کیوں......؟ بڑی محبت ہے فریدہ سے......؟''

قبل اس کے کہ کنیز کچھ اور کہتی، ریاض نوید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ نوید صاحب ہیں، فریدہ کے دوست......!''

ریاض نے مختصر طور پر اسے نوید کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

''اچھا، اب یہ بتاؤ، فریدہ کہاں ہے......؟''

فریدہ کا نام لیتے ہوئے کنیز کی رنگت زرد پڑ گئی اور وہ نوید کو گھورتے ہوئے بولی۔

''اچھا پیار کیا ہے میری بہن سے تم نے......؟ اتنا عرصہ اسے خط کیوں نہ لکھا......؟ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس نے ایک ایک لمحہ تمہاری یاد میں گزارا ہوگا......؟ مگر تم لوگوں کو کیا......؟ تم لوگ تو وقت گزاری کے لئے دل لگی کرتے ہو......؟''

''مجھے معاف کر دو کنیز بہن......! میں نے تو یہ سوچ کر خط نہ لکھا کہ آج کل کون کسی کا انتظار کرتا ہے......؟ صرف وہی وقت ہمارا ہوتا ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہو۔ یہی سوچ کر میں نے فریدہ کو خط نہ لکھا اور پھر روانگی کے وقت وہ مجھ سے ملی بھی تو نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود میں نے واپسی پر اسے تلاش کیا۔ اگر میں بے وفا ہوتا تو اب تک شادی کر چکا ہوتا۔ پلیز......! آپ مجھے فریدہ کے پاس لے چلیں۔''



فریدہ جیسے تیسے اپنے وجود کو گھسیٹ کر کمرے تک تو لے آئی تھی مگر اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے کو تھیں۔ اس نے اپنے وجود کو بے دردی چارپائی پر گرا دیا اور بڑبڑائی۔

''اس دُنیا میں ماں، بہن، بھائی کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ آج کنیز کو ے گھر کا مان ہے، وہ یہ بھول گئی ہے کہ کبھی ان لوگوں کی خاطر میں نے گھر اپنے ہاتھوں سے چکنا چور کر دیا اور آج مجھے احساس ہوا ہے کہ اپنا ر اپنا ہوتا ہے۔

مگر نہیں......! شاید اس دُنیا میں عورت کا اپنا گھر کوئی نہیں ہے۔ ید نے بھی مجھے کھلونا سمجھا۔ چند دن میرے ساتھ گزارے اور پھر بھول یا۔''

اتنے میں کنیز، ریاض اور نوید کے ہمراہ کمرے میں آ گئی۔

فریدہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے گرتے ہوئے گھر کو دونوں وں سے تھام لیا ہو...... وہ مضبوط ہاتھ۔

وہ بے ساختہ نوید سے لپٹ گئی۔



اور خواب بکھر گئے

ان کے سروں پر اگر ایٹم بم بھی گرتا تو وہ لوگ اتنے حیران نہ ہوتے جتنے اس وقت ہو رہے تھے۔ بات جس نے بھی سنی، دانتوں میں اُنگلی دبا کر رہ گیا۔

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟"

"لو بھلا......! کبھی ایسا بھی ہوا ہے......؟"

مگر ایسا ہو چکا تھا۔ خاندان بھر اور محلے میں جو لوگ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکا کرتے تھے، وہی جو اپنی بہو بیٹیوں کو اس کی مثال دیا کرتے تھے، اس وقت وہی لوگ گم سم بیٹھے معافی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ بہت سوچنے کے بعد بھی جب کبھی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہی لوگ جو اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے، لگے رنگ برنگی باتیں کرنے۔

ایک نے کہا۔

"اے لو......! اس لئے تو گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ ارے......! جب اندر ہی اندر یہ گُل کھلایا ہے تو سوچو......! اگر باہر نکلتی تو پتہ نہیں کیا کیا ستم ڈھاتی......؟"

دوسری نے کہا۔

"پر یہ بھی تو دیکھو......! شکل سے کتنی معصوم لگتی تھی۔ ارے......! کبھی دروازے میں بھی کھڑی نہیں ہوئی جو لوگوں کو شک ہوتا۔"

تیسری نے کہا۔

"ارے......! کند ذہن تو ہم خود تھے، جو خواہ مخواہ اس کی تعریف کرتے رہے۔ بھلا آج کے دور میں بھی کوئی لڑکی ایسی ہو سکتی ہے......؟ اب دیکھو، ماں باپ اور بھائیوں کو کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔"

یعنی جتنے منہ اتنی باتیں یہ لوگوں کا دستور ہے بلکہ فطرت ہے وہ وقت بدلنے کے ساتھ خود بھی بدل جاتے ہیں۔

معافی ستائیس، اٹھائیس برس کی ایک عام سی شکل و صورت کی دوشیزہ تھی۔ بہت خوب صورت نہیں تھی۔ مگر اب ایسی گئی گزری بھی نہیں تھی۔ وہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ مگر وہ کہتے ہیں ناں کہ لڑکی نیم کا پیڑ ہوتی ہے، سو وہ بھائیوں سے بھی پہلے جوان ہو گئی تھی۔ فرق ہی کتنا تھا......؟ صرف پانچ سال کا۔ ماں باپ کو رات دن اس کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اکثر سوچتے۔

"کاش......! یہ ایک بیٹی نہ ہوتی......؟"

شاید اسی لئے انہوں نے اس کی پیدائش پر اس کا نام معافی رکھا تھا کہ کہیں کوئی اور بیٹی نہ چلی آئے۔ اب معافی جوان ہوئی تو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ مگر بچارے غریب ماں باپ بھی کیا کرتے......؟ جہاں بھی رشتے کی بات چلتی، لوگ پہلے منہ پھاڑ کر لمبے چوڑے جہیز کا مطالبہ کرتے اور کہتے۔

"بھئی......! لڑکی تو بعد میں دیکھنے کی چیز ہے۔ پہلے یہ بتائیے......! جہیز میں کیا کیا دے رہے ہیں آپ لوگ......؟"

اور جہیز تو ان غریب لوگوں کے پاس تھا ہی نہیں۔ دونوں بھائی

اگرچہ کماتے تھے مگر ایک تو ماں باپ کو پیسے کم دیتے تھے، دوسرا وہ اگر کوشش کرتے بھی تو اتنا جہیز نہ بنا پاتے۔

بہت سوچ کر ماں باپ نے فیصلہ کیا۔ پہلے لڑکوں کی شادی کر دی جائے۔ ان کی دُلہنیں جو سامان لے کر آئیں گی، کچھ وہاں اور باقی جو خود بنا کر رکھا ہوا ہے، ملا کر معافی کی شادی کر دی جائے گی۔

مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ یہاں بھی سب کچھ ان کی سوچ سے اُلٹ ہوا تھا۔ اب تو بیٹے جو تھوڑے بہت پیسے دیتے تھے، وہ بھی باقاعدگی سے نہ دے پاتے اور بہو کی اگر کسی چیز کو ہاتھ لگ جاتا تو گھر میں گویا قیامت سی آجاتی۔ ایک ہنگامہ سا مچ جاتا۔

بیٹی کی فکر نے ماں باپ کو وقت سے پہلے یہ بوڑھا کر دیا تھا۔ کوئی ایسی چیز اور زمین بھی نہ تھی، جسے بیچ کر ہی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دیتے۔

کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اگرچہ گزرتے ہوئے وقت نے اس محاورے کو غلط ثابت کر دیا ہے مگر اب بھی کچھ بے وقوف قسم کے انسان صرف اس لئے صبر کرتے ہیں کہ شاید کبھی ان کو پھل مل ہی جائے۔ جبکہ عقل مند انتظار کی بجائے عمل کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی عمل کرنے کے بجائے اس انتظار میں تھے کہ کب خدا ان کے صبر کا پھل دیتا ہے......؟

اور رہی بیٹی کی بات تو وہ معافی پر ان کو پورا بھروسہ تھا، یہ فکر نہ تھی کہ وہ اِدھر اُدھر تانک جھانک کرے گی۔ وہ آنکھیں بند کر کے بیٹی پر اعتبار کرتے تھے۔ جوں جوں معافی کی عمر بڑھ رہی تھی، لوگوں کے سوال بھی بڑھ رہے تھے۔

''اے بہن......! کب کرو گی بچی کی شادی......؟ خیر سے اٹھائیس کی ہو رہی ہے۔ دُلہن بننے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔''

لوگوں کی انہی باتوں سے تنگ آکر انہوں نے کہنا شروع کر دیا۔

''معافی کہتی ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ ہم اسے رضامند کر

رہے ہیں۔''

جب کہ اندر ہی اندر وہ رشتے کی تلاش میں مصروف رہتے۔

مگر یہ اچانک یکایک آج کیا ہوگیا تھا......؟ پل بھر میں ان کی برسوں کی بنائی ہوئی عزت خاک میں مل گئی تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کبھی ایسی انہونی ہوگی......؟ معافی پر ان کو اعتبار تھا کہ وہ کوئی غلط کام کبھی نہیں کرے گی۔

''مگر آج......؟''

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے بڑے مزے سے ٹی وی پر ایک مشہور پروگرام دیکھ رہے تھے۔ معافی ان سب گھر والوں میں شامل تھی۔

اچانک پروگرام روک کر خصوصی بلیٹن میں بتایا گیا۔

''کچھ دیر قبل لندن جانے والا جہاز پرواز کے کچھ دیر بعد ہی حادثے کا شکار ہوگیا۔ عملے سمیت تمام مسافر بھی ہلاک ہوگئے۔ کوشش کے باوجود بھی کسی مسافر کی جان نہ بچائی جا سکی۔''

معافی کی ماں اور سب دوسرے گھر والے افسوس کرنے لگے۔ حادثہ بھی تو بہت بڑا تھا اور معافی سر جھٹک کر آنکھیں پھاڑتے ہوئے غور سے ٹی وی کو دیکھنے لگی۔ اچانک اس نے ایک درد بھری زوردار چیخ ماری اور زور زور سے رونے لگی۔

''ہائے میرے بچے......! میرا پرویز......! اُف ماں......! یہ سب کیا ہوگیا ہے......؟ میں نے کتنا منع کیا، کتنی بار کہا۔ آج آپ نہ جائیں، پر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ ہائے اللہ......! اب میں کیا کروں گی......؟''

وہ پھر رونے لگی۔

سب گھر والے اس نئی افتاد پر گھبرا گئے۔ حیران ہو کر اس کو دیکھنے لگے کہ یہ کیا واہی تباہی بک رہی ہے......؟ کیا ہوا اس کو......؟ کیا اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے......؟ یا یہ پاگل ہوگئی ہے......؟ مگر کچھ سمجھ میں نہ

آیا۔

''معافی......! کیا بکواس کر رہی ہو......؟ کیا بک رہی ہو......؟''

بڑے بھائی نے غصے سے پوچھا۔

معافی نے آنسو بھری آنکھوں سے بھائی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر کرب تھا۔ سسکتی ہوئی آواز میں بولی۔

''بھیا......! تمہاری بہن بیوہ ہوگئی۔ ہائے بھائی جان......! میرے معصوم بچے...... اور...... اور...... ان کا باپ...... میرا سہاگ...... یہ سب کیا ہوگیا......؟ کیوں ہوگیا......؟''

وہ اور شدت سے رونے لگی۔ گھر والوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس ناگہانی آفت پر کریں تو کیا کریں......؟ اگر کسی نے سن لیا تو کیا ہوگا......؟ خواہ مخواہ بدنام ہو جائیں گے۔ وہ لوگ ڈانٹ کر اسے چپ کروانے لگے۔

''معافی......!''

ماں اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

''ارے نامراد......! بے شرم......! کیا بکواس کر رہی ہے بھائیوں کے سامنے......؟ کمبخت......! چپ کر جا ورنہ گدی سے زبان کھینچ لوں گی۔ بے حیا......! تیری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور تو بچوں کی بات کر رہی ہے......؟ تیرا دماغ چل گیا ہے۔ خدا کے لئے چپ ہو جا......!''

''ماں......! تیری بیٹی پر قیامت گزر گئی اور تو کہتی ہے میں چپ رہوں......؟ ہائے......! میں کیسے چپ رہوں......؟ میری تو کوکھ اُجڑ گئی۔ میری گود خالی ہوگئی۔ مانگ سونی ہوگئی اور...... ہائے لوگو......! میں کیا کروں......؟ وہ اور بھی زور وشور سے رونے لگی۔

''اری......! چپ کر جا بے غیرت......!''

ماں دانت پیس کر بولی۔

''غضب خدا کا......! کیا سمجھتی تھی میں تجھے اور تو کیا نکلی......؟

دیکھو اگر کسی نے تمہاری کرتوت سن لی تو بھائی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔

اری کمبخت......! نامراد......! تو پیدا ہوتے ہی مرگئی ہوتی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو اس عمر میں ہمیں بدنام کرے گی تو پیدا ہوتے ہی تجھے زندہ گاڑھ دیتی۔''

مگر معافی بجائے چپ ہونے کے اور بھی اونچی آواز میں رونے لگی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ محلے والے اس کے رونے کی آواز سن کر چلے آئے۔

''کیا ہوا بہن......! کیوں رو رہی ہے معافی......؟''

معافی کی ماں کیا جواب دیتی......؟ معافی خود ہی بار بار اپنی داستان بیان کر رہی تھی۔ پہلے تو محلے والے حیران ہوئے۔

''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟ ایک سیدھی سادھی لڑکی جو سال بھر ند کہیں جا کر گھر سے باہر قدم نکالتی ہے، وہ ایسی کیسے ہوسکتی ہے......؟''

مگر کب تک......؟

آخر وہ لوگ تے اور لوگوں کا کام ہے باتیں کرنا۔ وہی لوگ جو اس کی مثال دوسروں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ کہنے لگے۔

''اے لو......! کتنی نیک پاک بنتی تھی۔ آج حقیقت سامنے آگئی۔''

''ارے......! چاند نکلے تو سبھی دیکھتے ہیں۔ پھر یہ کیسے چھپی رہتی......؟''

''ارے دیکھو تو ماں باپ کتنے مظلوم بن کر کہتے تھے، کوئی اچھا رشتہ ہی نہیں ملتا......؟ معافی شادی کے لئے رضامند نہیں......؟''

''ارے......! اندر ہی اندر تو یہ گل کھلایا تھا بیٹی نے۔ دیکھو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور دو بچے بھی ہوگئے۔ شاید اسی لئے ماں باپ شادی نہیں کرتے تھے۔''

یعنی جتنے منہ اتنی باتیں۔

لوگ اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر معافی کو ان باتوں کا ہوش کہاں تھا......؟ وہ تو رونے سے ہی باز نہ آ رہی تھی۔ اسے رونے سے فرصت ملتی تو لوگوں کی باتیں سنتی۔ لوگ اپنی اپنی رائے کا اظہار کر کے چلے گئے۔ سب گھر والے شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔

اور پھر معافی بے ہوش ہوگئی اور سب گھر والوں نے یوں اطمینان کا سانس لیا جیسے وہ سوگئی ہو، آرام کی نیند۔ مگر یہ سکھ، یہ اطمینان بھی عارضی ثابت ہوا۔ وہ ایسی بے ہوش ہوئی کہ ہوش میں آنے کا نام ہی نہ لیا۔ بھائی پریشانی کی حالت میں اسے لے کر ہسپتال آگئے مگر ساری رات گزر گئی اور معافی کو ہوش نہ آیا۔

صبح ہوئی، محمود نے اخبار لیا تو اور بھی حیرت ہوئی۔ کیپٹن کا نام جمیل تھا اور اس کے بیوی بچوں کی تصویریں بھی آئی تھیں۔ حد تو یہ ہے، مسافروں میں سے بھی کسی کا نام پرویز نہ تھا۔ گھر والے اور بھی حیران و پریشان ہوئے۔

ویسے بھی معافی کبھی گھر سے باہر تو گئی نہ تھی۔ پھر یہ سب کیسے ہو سکتا تھا......؟ اگر وہ لوگ فرض کر بھی لیتے کہ صرف اتنا کہ چلو، وہ کبھی بازار گئی اور کورٹ میرج کر لیا، حالانکہ یہ ناممکن سی بات تھی۔ مگر بچے اور وہ بھی دو......؟ اتنا عرصہ تو معافی کبھی گھر سے باہر نہ رہی تھی۔ محمود پریشان تھا۔

ڈاکٹر اسد اس کیس پر خاصی توجہ دے رہے تھے، کیونکہ محمود نے انہیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا اور ڈاکٹر اسد اس کیس کو سمجھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے خود اپنے طور پر بھی یہ معلوم کیا تھا کہ نہ صرف یہ کہ پرویز نامی کوئی کیپٹن فلائٹ لے کر نہیں گیا تھا۔ بلکہ نہ ہی اس نام کا کوئی کیپٹن جانے والا تھا۔ وہ اس کیس کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ نرس نے اطلاع دی۔

''مریضہ ہوش میں آگئی ہے۔''

وہ فوراً کمرے میں داخل ہوئے تو معافی سوگوار سی لیٹی چھت کو رہی تھی۔ ڈاکٹر اسد بیڈ کے قریب رکھی بنچ پر بیٹھ کر اس کا جائزہ لینے صاف پتہ چلتا تھا وہ اس حادثے سے دوچار ہوئی ہے۔ گویا حقیقت ں کا شوہر مر گیا ہو۔ ڈاکٹر اسے دیکھتے رہے اور سوچتے رہے۔ آخر وچنے کے بعد انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

''آپ پرویز کو کب سے جانتی تھیں......؟''

معافی بدستور چھت کو گھورتی رہی۔ جیسے بات ہی نہ سنی ہو۔

''معافی صاحبہ......! آپ پرویز کو کب سے جانتی تھیں......؟''

ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔

''میں...... میں......''

معافی نے اُلجھی اُلجھی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

''میں اس کو کب جانتی تھی......''

معافی اُدھوری بات کہہ کر چپ ہوگئی۔

''میرا مطلب ہے آپ کی شادی کب ہوئی تھی......؟ آپ نے ے پہلے پرویز کو کہاں دیکھا تھا......؟ میرا مطلب ہے آپ شادی لے بھی ملی ہوں گی ناں......؟''

ڈاکٹر اسد بات کرتے کرتے خود بھی اُلجھ گئے اور معافی ان کو وئے کچھ سوچنے لگی۔ گویا کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔



زوبی نے گھور کر اس کو دیکھا اور منہ بنا کر اپنے شولڈر کٹ بالوں کو ئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''سوری......! آئی ایم ویری سوری......!''

وہ کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولا۔

''اب اور کیا چاہتے ہیں آپ......؟''

زوبی نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

''صرف یہ کہ آپ مجھے معاف کر دیں......! ویسے قصور آپ کا بھی اتنا تھا، جتنا میری گاڑی کا۔ سپیڈ آپ کی گاڑی کی بھی کافی تیز تھی۔''

''چلئے......! آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ جائیے......! ہم نے آپ کو معاف کیا۔''

زوبی نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''لیکن جناب......! میں بھکاری تو نہیں۔''

وہ شوخی سے مسکرایا تو زوبی بھی ہنس دی۔

یہ تھی ان کی پہلی ملاقات، دوسری ملاقات اتفاق سے نہیں بلکہ باقاعدہ وعدہ وفا کرتے ہوئے ہوئی اور اس ملاقات میں پرویز بہت سارے لفظوں کی صورت میں اسے حالِ دل سناتا رہا اور وہ کچھ کہنے کی بجائے مسکراتی رہی۔

تیسری ملاقات ہوئی تو زوبی نے محسوس کیا تھا جیسے پرویز ہی وہ ہستی ہے جس کی تلاش میں وہ اب تک بھٹک رہی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ مل کر پرویز بچھڑ جائے۔ جلد ہی دونوں نے شادی کر لی۔

پرویز اس دُنیا میں بالکل اکیلا تھا اور زوبی بھی اپنے چچا کے گھر رہتی تھی۔

شادی کے فوراً بعد وہ لوگ ہنی مون کے لئے ملک سے باہر چلے گئے۔ پرویز خود انٹرنیشنل پروازوں کا کیپٹن تھا۔ وہ ہر جگہ زوبی کو ساتھ لئے ہواؤں کے دوش پر اُڑتا رہا اور زوبی کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کتنے ملک گھومی تھی......؟

البتہ چھ ماہ بعد جب وطن واپس آئی تو اُمید سے تھی۔ پرویز ایک

شوہر تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتا اور یہی زوبی چاہتی تھی صرف اور صرف اسی کے بارے میں سوچتا رہے۔

ڈلیوری کے دن جوں جوں قریب آ رہے تھے، وہ پریشان ہو کر ۔ کاش آج ساس یا ماں ہوتی تو کتنا سہارا ہوتا۔ مگر کچھ دن بعد وہ ان ں کے بغیر ہی دو جڑواں بچوں کی ماں بن گئی۔

پرویز کو بے انتہاء خوش دیکھ کر وہ اپنی تکلیف کا احساس بھی بھول اس کو دُنیا میں ہی جنت مل گئی تھی۔ اپنا گھر اسے جنت کا نمونہ ہی لگتا جہاں ایک پیار کرنے والا شوہر تھا، بچے تھے اور وہ تھی۔

وقت کب ایک جگہ ٹکا ہے......؟ پانچ سال کا طویل عرصہ یوں گزر ور اسے پتہ بھی نہ چلا۔ اور آج کل وہ پرویز سے سخت خفا تھی۔ وجہ یہ تھی کہ پرویز نے ایک غیر ملکی سکول میں بچوں کے ایڈمیشن کا انتظام ا۔ جبکہ وہ بچوں کو ایک پل بھی خود سے جدا رکھنے کو تیار نہ تھی۔

''کچھ بھی ہو پرویز......! آپ کو اپنا یہ فیصلہ بدلنا ہوگا۔''

رات سونے سے قبل وہ پھر اس مسئلے پر ڈسکس کر رہی تھی۔ آج ٹھتے بیٹھتے اس کے لئے یہی ایک موضوع رہ گیا تھا۔

''یار......! تو سمجھتی کیوں نہیں......؟ بچوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے میں انہیں باہر بھیج رہا ہوں۔ یہ تو تمہارے لئے فخر کی بات ہونی ئے۔''

پرویز نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے سمجھایا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں آپ کی حماقتوں پر فخر کرنے کی۔ آپ ذرا بن کر سوچئے......!''

''کیوں بھئی......! کیا باپ اپنے بچوں کا دُشمن ہوتا ہے......؟ کو بھی ان سے اتنی ہی محبت ہوتی ہے جتنی کہ ماں کو۔ البتہ یہ بات اور ۔ مرد ہونے کی حیثیت سے وہ کچھ لئے دیئے رہتا ہے۔''

"آپ کی بات ٹھیک ہے......! لیکن اپنے ملک میں بھی اچھے ا
اسکول موجود ہیں۔ اپنے ملک کو چھوڑ کر باہر جانا کہاں کی دانش م
ہے......؟"

"یار......! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں......؟ تم نے وہ حدیث تو
ہوگی۔

"علم کو میں نے بھوک اور سفر میں چھپا رکھا ہے۔"
یار......! علم کے لئے سفر بہت ضروری ہے۔"

"اچھی بات ہے، جو آپ کے جی میں آئے کریں۔ مجھ
پوچھنے کی ضرورت نہیں......!"

زوبی نے منہ بنا کر کہا اور پرویز ہنس پڑا۔

"یار......! تم کیوں فکر کرتی ہو......؟ تمہارا شوہر انٹرنیشنل پرواز
کا کیپٹن ہے۔ جب تمہارا دل ہوا کرے گا، اسی وقت بچوں کے پاس
جایا کرنا۔ اوکے......!"

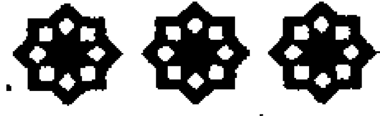
پرویز نے رُک کر پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

وہ دن اس کے لئے بہت اہم تھا۔ اس کے دونوں بچے اعلیٰ تعل
کے لئے اس سے جدا ہو کر لندن جا رہے تھے۔ وہ خوش بھی تھی اور اُدا
بھی۔ پرویز نے کہا بھی تھا کہ تم بھی ساتھ چلو مگر اپنی ایک دوست کی شاد
کی وجہ سے اسے رُکنا پڑا۔ پرویز بار بار اسے تسلی دے رہا تھا اور وہ دونو
بچوں کو چوم چوم کر پاگل ہو رہی تھی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے جہاز بلندیوں میں پرواز کر گیا اور وہ گھر چل
آئی تھی کہ یہ بھیانک خبر کہ جہاز کریش ہو گیا ہے، سن کر اس پر بجلی سی گ
پڑی۔

"نہیں نہیں......!"
وہ چیخ اُٹھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا......! پرویز مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ انہوں نے تو
ساری زندگی ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا...... وہ مجھے چھوڑ کر......"



"ہوش میں آیئے مس معافی......! آپ زوبی نہیں، معافی ہیں،
صرف معافی۔"

ڈاکٹر اسد نے فوراً کہا مگر اس نے سنا کب تھا......؟ وہ ایک بار
پھر بے ہوش ہو چکی تھی۔ اب ڈاکٹر اسد اس کیس کو کچھ کچھ سمجھ گئے تھے۔
وہ باہر چلے آئے کیونکہ اب وہ معافی کی والدہ سے تفصیل سے باتیں کرنا
چاہتے تھے۔

کچھ دیر بعد جب معافی کی والدہ ان کے پاس آئی تو ڈاکٹر اسد
نے ان سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"جس روز یہ حادثہ ہوا، معافی گھر سے باہر گئی تھی کیا......؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب......! وہ گھر تو کیا، اپنے کمرے سے بھی
بہت کم نکلتی تھی۔ اس دن تو اسے گھر سے باہر گئے ہوئے چار پانچ ماہ ہو گئے
تھے۔"

معافی کی والدہ نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتایئے......! وہ گھر میں کس طرح رہتی تھی......؟ میرا
مطلب ہے، ان کی کوئی ایسی بات یا حرکت جو آپ کو عجیب لگتی ہو......؟"

معافی کی والدہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کچھ دیر بعد بولیں۔

"پتہ نہیں، یہ بات آپ کے کام کی ہو یا نہ ہو، تاہم میں آپ کو بتا
ہی ہوں۔ ایک بار میں اس کے کمرے میں گئی تو وہ کرسی پر بیٹھی ہائے
ائے کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"معافی کیا بات ہے......؟"

اس پر وہ چونک پڑی۔ کچھ دیر حیرانی سے مجھے دیکھتی رہی پھر کہا۔

''کچھ نہیں ماں......!''

مگر مجھے شک ہوگیا کہ شاید اس کی طبیعت خراب ہے اور وہ مجھے بتانا نہیں چاہتی۔ میں کچھ دیر بعد پھر اس کے کمرے میں گئی تو وہ مسکرا رہی تھی اور یوں سر ہلا رہی تھی جیسے کوئی بہت پیار سے اس کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہو۔ میں ابھی حیران ہو ہی رہی تھی کہ اچانک وہ زور سے ہنس پڑی۔ پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں......؟ خواہ مخواہ مجھے ستاتے ہیں۔ میں ٹھیک ہی تو کہتی ہوں۔ آج اگر میری ساس یا امی ہوتی تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔''

میں پریشان ہوگئی کہ یہ آج معافی کو کیا ہوگیا ہے......؟ کبھی ہائے ہائے کرتی ہے اور کبھی خود سے باتیں۔

اتنے میں وہ اچانک اپنی جگہ سے اُٹھی اور دیوار کے قریب جا کر ہاتھ منہ کے قریب لاتے ہوئے بولی۔

''جی ہاں......! میں زوبی بول رہی ہوں۔ ہاں ہاں......! صاحب گھر پر ہی ہیں۔ میں ان کو بلاتی ہوں۔''

یہ سن کر میں گھبرائی ہوئی اس کے پاس گئی اور پوچھا۔

''معافی......! یہ تجھے کیا ہو رہا ہے......؟ کیا تو پاگل ہوگئی ہے......؟''

کچھ دیر تو وہ کچھ بھی نہ سمجھی۔ پھر یک دم چونک پڑی۔ پہلے خود کو غور سے دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑی۔ میں نے پوچھا۔

''معافی......! تم پر کسی چیز کا سایہ ہوگیا ہے۔''

اس پر وہ بولی۔

''ماں......! میں تو بس یوں ہی......''

وہ کوئی بات نہ بنا سکی۔ تاہم اس کے بعد وہ کافی بدل گئی۔ وہ ہاں کہیں بیٹھتی یا تو خلاؤں میں گھورتی رہتی یا پھر آنکھیں بند کیے سوچتی ہتی۔''

معافی کی ماں چپ ہوگئی۔

ڈاکٹر اسد کچھ سوچنے لگے۔ اب وہ اس کیس کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے سر اُٹھایا۔ ایک نظر اس کی ماں اور سری بھائیوں پر ڈالی۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''سب سے پہلا ظلم ماں باپ نے اس کی ذات پر کیا۔ لڑکوں کو لی تعلیم دلائی اور اس کو صرف مڈل تک پڑھنے دیا اور پھر نام بھی اس کا یسا سیدھا سادہ اور عجیب سا رکھا۔

معافی......!

بھلا یہ کوئی نام ہے......؟ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح جینا چاہتی ی۔ مگر اپنے گھریلو حالات کے سامنے بے بس اور مجبور تھی۔

دوسرا ظلم خود بھائیوں نے اس پر کیا۔ پہلے خود شادیاں کر لیں اور ن کا خیال تک نہ آیا۔ حالانکہ باپ کے بعد بہن، بھائیوں کی ذمہ داری تی ہے اور غیرت مند بھائی پہلے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں۔ لیکن پ عجیب بھائی تھے......؟

ذرا سوچیے......! جب آپ اپنی بیویوں کے ساتھ گھر سے باہر تے ہوں گے اور وہ گھر پر اکیلی رہتی ہوگی، ایسے میں اس کے دل پر کیا ں گزرتی ہوگی......؟ آپ کی غلطیوں کا نتیجہ اب آپ کے سامنے ہے۔ نفسیاتی مریضہ ہوگئی ہے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے اپنی ایک ب تصوراتی دُنیا بنا لی ہے۔ جہاں وہ معافی کی بجائے ایک ماڈرن لڑکی کی یت سے داخل ہوئی۔''

"لیکن ڈاکٹر صاحب......! آپ ان سب باتوں کو کیسے جانتے ہیں......؟ یقین کیجئے، ہم معافی کے لئے اچھا رشتہ تلاش کر رہے ہیں۔ مگر افسوس......! لمبے چوڑے جہیز کے بغیر کوئی لڑکی کو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

محمود نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"آپ چاہتے تو کیا نہیں ہو سکتا تھا......؟ اچھی خاصی آمدنی ہے آپ دونوں بھائیوں کی۔ خیر......! مجھے اس بات سے کوئی انٹرسٹ نہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس تصوراتی دُنیا میں ماڈرن لڑکی کی حیثیت سے داخل ہوئی۔ جہاں اس نے اپنا نام معافی کی بجائے زوبی رکھا اور اسی دُنیا میں اس نے اپنے لئے ایک محبوب تخلیق کیا، جو زمانے بھر سے لاپرواہ صرف اور صرف اسی کو پیار کرتا تھا۔

حقیقت میں اس کی دُلہن بننے کی آرزو پوری نہ ہوئی اور تصوراتی دُنیا میں نہ صرف اس نے شادی کی بلکہ دو بچوں کی ماں بھی بن گئی۔ حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے۔ اس تلخ حقیقت سے نظریں چرا کر وہ جب بھی دُکھ محسوس کرتی تو اپنی اس خوب صورت اور تصوراتی دُنیا میں چلی آتی۔

معافی کی ماں نے یوں آنکھیں پھاڑ کر ڈاکٹر کو دیکھا، جیسے وہ کوئی انہونی بات کہہ رہا ہو۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اتنے میں ڈاکٹر اسد دوبارہ بولے۔

"ہاں تو اس رات جب یہ حادثہ ہوا، وہ تصور میں اپنے شوہر اور بچوں کو الوداع کہہ کر واپس حقیقت کی دُنیا میں آنا ہی چاہتی تھی کہ یہ خبر سن کر وہ تصوراتی اور حقیقی دُنیا میں گڈمڈ ہوگئی۔ وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ حقیقت کیا ہے......؟ اور تصور کیا ہے......؟

اسی حالت میں وہ بے ہوش ہوگئی اور اب ہوش میں آکر بھی وہ اپنی تصوراتی دُنیا میں گم ہے۔"

"پلیز ڈاکٹر صاحب......! آپ کچھ کیجئے......! اب کیا ہوگا......؟"

محمود نے بے چینی سے پوچھا۔ مقصود تو تب سے اب تک خاموش بیٹھا اپنے جرم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک ہی بہن تھی، لیکن وہ کتنے بے حس تھے اس کے لئے۔ کچھ کرنے کی بجائے وہ اپنے گھر بسا کر بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر اسد کچھ دیر محمود کو دیکھتے رہے پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔

"اب اگر وہ تصوراتی دُنیا میں رہتی ہے تو اس کے پاگل ہونے کا خطرہ ہے اور اگر وہ حقیقت کی دُنیا میں آتی ہے تو اس کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ اور ہو سکتا ہے وہ حقیقت سے ایڈجسٹ نہ ہو سکے اور......"

"نہیں نہیں......! ڈاکٹر صاحب......!"

محمود چیختے ہوئے کھڑا ہوگیا۔

"ایسا مت کہئے......! وہ تو ہمارے گھر کی رونق ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے لیکن وہ ایک بار اچھی تو ہو جائے۔ پھر آپ دیکھیں گے ڈاکٹر صاحب......! میں کس دُھوم دھام سے اس کی شادی کرتا ہوں۔ میں خود کو بیچ دوں گا ڈاکٹر صاحب......! لیکن اس کے لئے اچھے جہیز کا انتظام ضرور کروں گا۔"

"ہاں ڈاکٹر صاحب......!"

مقصود بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ اس کی زندگی بچا لیجئے......! آپ نہیں جانتے، ہم اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"میری تو پوری کوشش ہے۔ آگے جو خدا کو......"

ڈاکٹر کی بات اُدھوری رہ گئی۔ نرس بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور کہا۔

"ڈاکٹر صاحب......! معافی کو ہوش آگیا ہے۔"

ڈاکٹر اسد فوراً اس کے پاس گئے اور وہ اس کے قریب ہی بیٹھ

گئے۔ معافی نے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

''ہاں تو زوبی صاحبہ......! جب آپ پرویز صاحب کو سی آف کر کے واپس آئیں تو یہ خبر سنی......! آپ کو یاد ہے آپ نے یہ خبر کہاں سنی......؟''

معافی کچھ اُلجھی اُلجھی سی لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر اسد بولے۔

''دیکھئے محترمہ......! آپ اپنے ماں باپ کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں اور آپ کا نام زوبی نہیں، معافی ہے۔''

معافی جیسے سوتے میں جاگ پڑی۔ چونک کر ڈاکٹر اسد کو دیکھا اور یوں آنکھیں جھپکائیں جیسے کچھ سمجھنا چاہتی ہو۔ ڈاکٹر اسد اسی ایک لمحے کے منتظر تھے، جب وہ حقیقت اور تصور کے بیچ آئے۔ فوراً بولے۔

''وہ سب خواب تھا مس معافی......! جو ختم ہو گیا۔ چونکہ آپ اس وقت خواب میں گم تھیں، جب یہ خبر سنی۔ اس لئے حقیقت کی دُنیا سے آپ کا رشتہ کٹ گیا، ورنہ آپ تو معافی ہیں۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی اور دو بھائیوں کی اکلوتی بہن......!''

''تو کیا وہ سب خواب تھا......؟''

معافی جیسے غنودگی میں بڑبڑائی۔

''مگر وہ خواب ...... وہ خواب......نہیں پرویز......!''

وہ ایک دم زور سے چیخی۔

''ہوش میں آیئے مس معافی......! خواب تو کب کا بکھر گیا۔ اب آپ خود کو سنبھالئے اور اس خواب کو بھول جایئے......!''

مگر وہ ڈاکٹر کی کہاں سن رہی تھی......؟ وہ بولی۔

''اور خواب بکھر گیا......! اگر خواب بکھر جائے تو کیا ہوتا ہے......؟ نہیں ڈاکٹر صاحب......!''

وہ کرب سے چیخ پڑی۔

''میں پھر سے معافی نہیں بن سکتی۔ میں معافی نہیں بن سکتی۔ آپ نے معافی کی زندگی نہیں دیکھی۔ وہ بڑی اذیت ناک تھی۔ اسی اذیت سے بچنے کے لئے معافی نے زوبی کا روپ دھارا تھا۔ زوبی بڑی خوش حال تھی۔ ڈاکٹر صاحب......! اس پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ وہ بہت امیر تھی۔ جہیز اس کا مسئلہ نہ تھا۔''

''لیکن میں اب اگر زوبی نہیں بن سکتی......؟ پھر جی کر کیا کروں گی......؟''

''معافی......؟ زوبی......؟ زوبی......؟ معافی......؟''

وہ بڑبڑائی۔

''معافی......؟ زوبی......؟ نہیں......!''

''معافی......! خواب بکھر گیا......!''

''تمہارا خواب بکھر گیا......!''

یہ سب کہتے ہوئے وہ اوندھے منہ تکیئے پر گر گئی۔ ڈاکٹر اسد نے گھبرا کر اسے دیکھا اور جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر نبض دیکھتے ہوئے اسے سیدھا کیا اور انہیں یوں لگا جیسے پرویز کی تلاش میں وہ بہت دُور نکل گئی ہو۔

معاشرے کی ایک بری رسم نے اس کی جان لے لی تھی۔ اس کے بھائی اور ماں بھاگتے ہوئے اندر آئے تو ڈاکٹر اسد نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔

پھر ماں ہی نہیں، بھائی بھی اس سے لپٹ کر رونے لگے اور ڈاکٹر اسد کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ وہ کر ہی کیا سکتے تھے، اپنے معاشرے کے اس المیے پر سوائے دو آنسو بہانے کے......؟



سزا

جی میں آتا ہے بنالوں میں بھی اِک شیشے کا گھر
تم بھی اپنے ہاتھ میں پتھر اُٹھانا سیکھ لو

وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ جو کچھ بھی ہوا تھا، ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اور اب جب محشر کی گھڑی سر پر آ پہنچی تھی تو وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب بھی جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک نہیں ہو رہا۔ مگر آخر یہ سوچ کر اس نے چپ رہنے کا فیصلہ کیا۔

”جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر یہ تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے......؟ مرنے سے پہلے مجھے بھی تو کچھ اندازہ ہو۔ اپنی بھیانک غلطیوں کا خمیازہ تو مجھے بہرحال بھگتنا ہے۔ لیکن ایسے میں کچھ لوگوں کو اگر آزما لیا جائے تو کیا حرج ہے......؟“

وہ انہی سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ کب آنے والا آ کر اس کے قریب بیٹھ گیا......؟ وہ تو اس دم چونکی جب اچانک گھونگھٹ اُٹھایا تو اس نے گھبرا کر منہ ہاتھوں میں چھپا لیا تو

خوب صورت انداز اور آواز میں کہا گیا۔

”آپ ایسی کیا بات سوچ رہی تھیں جو ہماری آمد کا احساس تک نہ ؟ ورنہ ہم نے تو سنا ہے، لڑکیاں اس جگہ بیٹھ کر صرف ایک آہٹ ے میں سوچتی ہیں۔“

شمع کا جی چاہا، کہہ دے۔

”میں ایسی لڑکی نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب......! میں تو......“

مگر وہ چپ رہی۔ بھلا اپنا بھید اپنے منہ سے کس طرح ......؟

”محترمہ......! اتنا مت شرمایئے......! ہمیں معلوم ہے کہ ......“

”کیا......؟“

شمع نے گھبرا کر ہاتھ ہٹا دیئے۔

”خوب......!“

وہ اس کا چہرہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

”آپ کے حسن کی تعریف تو خوب سنی تھی مگر اس وقت لگ رہا بہت کم تھی۔ لیجئے اپنا حق، اور آنکھیں کھول دیجئے......!“

شمع نے سوچا۔

”آخر کب تک میں اس گھڑی کو روکوں گی......؟ اور کب تک یہ ی رُکے گی......؟ اگر حادثات اس موڑ پر لے ہی آئے ہیں تو مجھے ت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔“

یہ سوچ کر اس نے آنکھیں کھول دیں تو اس کا خوبرو ہم سفر ہاتھ ڈائمنڈ کا سیٹ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ شمع نے سیٹ پکڑ کر ایک طرف تو انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”کیا بولنے کا موڈ نہیں......؟“

پھر خود ہی ہنس کر بولے۔

"مجھے معلوم ہے آج کے دن لڑکی "ہوں، ہاں" کے سوا کچھ نہیں بولتی کیونکہ وہ اپنے میاں کو لفظ حفظ کرا دیتی ہے۔ پھر ساری عمر وہ بولتی ہے اور میاں بے چارہ "ہوں، ہاں" کے سوا کچھ نہیں کہہ پاتا۔"

ان کی بات ختم ہونے پر شمع بے ساختہ ہنس پڑی اور وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔

"اچھا بھئی......! میں ذرا لباس تبدیل کر آؤں۔"

وہ چلے گئے تو شمع نے جلدی جلدی تمام زور اُتار کر رکھے اور جب وہ دوبارہ کمرے میں آئے تو وہ دریچے کے قریب کھڑی تھی۔ ان کو دیکھتے ہی بغیر کسی تمہید کے بولی۔

"ڈاکٹر صاحب......! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"شکر ہے، کچھ بولیں تو......! دیکھئے تو......!"

وہ دریچے سے باہر آسمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"آج پورے چاند کی رات ہے۔ دھرتی پر نور سا پھیلا ہوا ہے۔ کتنا خوب صورت ہے یہ سہانا سماں۔ لگتا ہے جیسے تمہاری آمد کی خوشی نیں چاندنی زمین پر اُتر آئی ہو اور......"

"ڈاکٹر صاحب......!"

شمع گھبرا کر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

"اس رات ہر شوہر اپنی بیوی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے، آپ کچھ نہیں پوچھیں گے......؟"

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، شمع کو ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

"بھئی......! یہ باتیں تو پھر بھی ہوتی رہیں گی۔ آج کی رات جو لوگ یہ کام کرتے ہیں، غلط کرتے ہیں۔ آج کی رات تو صرف پیار کے لئے ہوتی ہے۔"

وہ اس کے قریب آئے۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب......!"

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"آپ کو پہلے میری زندگی کی کہانی سننا ہوگی۔ اس کے بعد آپ یصلہ کریں۔"

انوار نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ انہیں اُلجھن سی ہوئی۔ تاہم ں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھی بات ہے......! سن لیتے ہیں آپ کی کہانی......! مگر کیا کھڑے کھڑے کہانی بیان کرنے کا ارادہ ہے......؟ چلئے وہاں بیٹھتے

اور شمع چلی آئی۔

"چلئے......! اب شروع ہو جایئے......!"

وہ اس کے روبرو بیٹھتے ہوئے بولے تو شمع سر جھکا کر کچھ سوچنے گویا ماضی کو یاد کر رہی ہو۔



بی اے کے بعد شمع کی بس ایک ہی ضد تھی کہ ایم اے ضرور کروں خواہ اس کے لئے چاند پر جانا پڑے۔ پہلے تو گھر والوں نے سمجھایا کہ ایم اے، ڈبل ایم اے کر کے کیا لینا......؟ تمہیں کون سی نوکری کرنی ......؟ اور اگر کچھ زیادہ یہ شوق ہے پڑھنے کا تو پرائیویٹ ایم اے کر لو۔

لیکن شمع کی ضد تھی کہ وہ یونیورسٹی میں داخلہ لے گی۔ اس کی ضد آگے سب کو جھکنا پڑا۔ ان کے اپنے شہر میں تو کوئی یونیورسٹی تھی نہیں، باپ کے پاس پیسوں کی کمی نہ تھی۔ پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہ خوشی خوشی ہاسٹل میں رہنے لگی۔

ذیشان سے اس کی پہلی ملاقات اپنی کلاس میں ہوئی تھی۔ وہ بھی ایک بڑے زمیندار گھرانے کا لڑکا تھا مگر ہاسٹل کی بجائے اس نے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ لے رکھا تھا۔ شمع سے اس کی دوستی ہوگئی۔ وہ بے تکلفی سے ایک دوسرے سے اپنی بات کہتے اور اگر کوئی اُلجھا ہوا مسئلہ ہوتا تو ایک دوسرے کے تعاون سے حل کرتے۔

رفتہ رفتہ یہ دوستی محبت میں بدل گئی۔ شمع جو بہت ضد کر کے پڑھنے کے لئے آئی تھی، اب پڑھائی سے بالکل بے پرواہ ہو چکی تھی۔ اس کو درس گاہ کے تقدس کا بھی خیال نہ رہا تھا۔ وہ دونوں سارا دن گھومتے، قسمیں کھاتے، وعدے کرتے کہ ساری زندگی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ پھر اکثر ایسا ہونے لگا کہ چھٹی کے روز شمع ذیشان کے گھر چلی آتی۔ سارا دن وہاں رہتی اور شام کو ہاسٹل چلی آتی۔ ذیشان خود اسے چھوڑنے آتا۔

دونوں کا گھر کی تنہائی میں ملنا رنگ لایا اور ان کے درمیان کوئی بھی حجاب نہ رہا اور شمع کو اس بات کی فکر بھی نہ تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ تعلیم ختم ہوتے ہی وہ دونوں شادی کر لیں گے۔ شمع کو پختہ یقین تھا کہ اس کے ماں باپ اس رشتے سے انکار نہیں کریں گے کیونکہ ذیشان بھی ایک اعلیٰ خاندان کا بیٹا تھا۔ ان کی تعلیم کا آخری سال تھا اور شمع کو اُمید نہ تھی کہ وہ امتحان میں کوئی خاص کامیابی حاصل کرے گی۔

اچانک ہی ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔ یہ شمع کا ذاتی خیال تھا۔ وہ ذیشان سے ملنے جا رہی تھی کہ وارڈن نے اس کے گھر سے آنے والا خط اسے دیا۔ شمع نے پہلے تو سوچا کہ واپس آکر پڑھ لے گی، مگر خط ہلکا پھلکا سا تھا۔ اس نے سوچا۔

’’ابھی پڑھ لینے میں کیا حرج ہے......؟‘‘

خط پڑھتے ہی اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوگئی۔ لکھا تھا۔

’’فوراً چھٹی لے کر آجاؤ کیونکہ تمہارے سسرال والے تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ تمہارا رشتہ تقریباً طے ہو چکا ہے۔ لڑکا سرجن ہے، ابھی کچھ ماہ قبل ہی امریکہ سے آیا ہے۔ وہ لوگ شادی جلدی کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان لوگوں نے کہہ دیا ہے تم اگر اپنی تعلیم جاری رکھنا ہو تو رکھ سکتی ہو۔ بس فوراً ہی آجاؤ ورنہ تمہارا بھائی تمہیں لینے آجائے گا۔‘‘

’’ہونہہ......! لینے آجائے گا......؟‘‘

شمع نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

’’تم لوگوں نے بغیر مجھ سے پوچھے یہ سب کیوں طے کر دیا......؟ یہ شادی ہرگز نہیں کروں گی۔‘‘

وہ خط ساتھ لئے ذیشان کے گھر چلی آئی۔ جب وہ ذیشان کے ے میں داخل ہوئی تو وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

شمع خاموشی سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ذیشان نے حیران ہو کر اور پوچھا۔

’’کیوں بھئی......؟ خیریت تو ہے......؟‘‘

شمع نے بغیر کچھ کہے گھر سے آیا ہوا خط اسے دے دیا۔ خط پڑھ کر نے اسے دیکھا۔

’’اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے......؟‘‘

’’تمہارے لئے پریشانی کی کوئی بات نہیں......؟ بھئی......! وہ لوگ شادی کر رہے ہیں......؟‘‘

’’تو ٹھیک ہے......! کرنے دو......!‘‘

ذیشان اسی لہجے میں بولا۔

"ذیشان......! پلیز......! قبل اس کے گھر والے میری شادی کہیں اور کر دیں، تم اپنے گھر والوں کو لکھو کہ وہ جلدی میرے گھر آئیں......!"

"وہ کس لئے......؟"

ذیشان نے انجان بن کر پوچھا۔

"بھئی......! رشتے کے لئے......! میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔"

شمع نے اس کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

"پاگل مت بنو شمع......! تمہارے گھر والے تمہاری شادی کر رہے ہیں۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ تمہیں ان کا کہا مان لینا چاہئے......!"

"دیکھو ذیشان......! میں مذاق کے موڈ میں قطعی نہیں ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم میری زندگی ہو۔ اور پھر یہ بھی سوچو......! میں اپنا سب کچھ تمہیں دے چکی ہوں۔ اب تمہارے ہوتے ہوئے میں کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

شمع نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"سنو شمع......!"

ذیشان اسی سکون بھرے لہجے میں بولا۔

"میرے گھر والے بھی میرا رشتہ میرے خاندان میں یہ طے کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ تم اپنے ماں باپ کے آگے سر جھکا دو اور میں اپنے ماں باپ کے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو ذیشان......؟ تمہیں یاد ہے تم نے کہا تھا کہ ہم جئیں گے تو ایک ساتھ، مریں گے تو ایک ساتھ......! تم میری زندگی ہو اور میں اپنی زندگی سے جدا ہو کر......"

"ختم کرو یہ سب بکواس......!"

ذیشان سخت لہجے میں بولا۔

"دیکھو......! لڑکے جذباتی ہوتے ہیں اور لڑکیاں بے وقوف......! ـے جو کہتے ہیں، لڑکیاں اس پر یقین کر لیتی ہیں۔ اور جو وقت گزر گیا تو ـو گیا۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہم ـی ماں باپ کے فیصلوں کے آگے سر جھکا دیں۔

باقی جہاں تک ایک ساتھ وقت گزارنے کا تعلق ہے تو کافی وقت ایک ساتھ گزار چکے ہیں۔ تم علم جیسی مقدس چیز کے حصول کے لئے ـں آئی تھیں مگر کیا تم نے علم حاصل کیا......؟ سارا وقت ہم نے ایک ـرے میں کھو کر ضائع کر دیا اور اب کوئی خواہش، کوئی ارمان اور کوئی ـزو باقی نہیں رہی۔

رہے وعدے اور قسمیں......؟ تو یہ سب فضول بکواس ہوتی ہے۔ ـن کرو شمع......! تم میرے بغیر زندہ رہو گی۔ رہی محبت کی بات تو وہ تم ہم ـتے ہی رہیں گے۔"

ذیشان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ذیشان......! یہ تم کہہ رہے ہو......؟"

شمع نے دُکھ سے اسے دیکھا۔

"مجھے اس راستے پر لانے والے تم ہو...... صرف تم......! تم ہی ـے مجھے اتنا بے غیرت اور بے حس بنا دیا کہ میں اپنی عزت آبرو کا خیال نہ ـسکی اور اب تم کہتے ہو......"

"ہاں شمع......! اب میں کہتا ہوں کہ ہم جدا ہو جائیں۔ کیونکہ میں ـتا ہوں کہ اگر ہم نے شادی کر لی تو بہت جلد ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ـجائے گا۔ ہم چھ ماہ بھی ٹھیک سے نہ گزار پائیں گے اور ایک دوسرے کی ـوں سے بے زار ہو جائیں گے، اُکتا جائیں گے......"

"کچھ بھی ہو ذیشان......! اب تو تمہیں مجھ سے ہی شادی کرنا ـی۔ میری کوشش ہوگی کہ کبھی تمہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔ مگر میں کسی

دوسرے سے شادی کر کے اسے دھوکہ نہیں دے سکتی۔"

"شمع......! تم سمجھتی کیوں نہیں......؟ ذرا یہ سوچو کہ شادی کے بعد آخر ایسی کون سی بات ہے جو مجھے تمہاری طرف متوجہ کرے گی......؟ ایسی کون سی بات ہوگی جس کے لئے میں تم سے پیار کروں گا......؟ نہیں......! میں یہ سب نہیں کرسکوں گا۔ میرے دل میں تو یہی ہوگا کہ یہ وہی تو ہے جو شادی سے پہلے ہی......"

شمع جو اب تک صرف اس وجہ سے ضبط کر رہی تھی کہ ذیشان کسی طرح مان جائے، چیخ پڑی۔

"خاموش رہو......! ذیشان......! تم انتہائی کمینے اور گھٹیا انسان ہو۔ تم نے میری محبت کی توہین کی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

شمع غصے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ محبت نہیں تھی شمع......! اگر یہ محبت تھی تو کیا لوگ محبت میں وہی کچھ کرتے ہیں جو ہم نے کیا......؟ محبت ایک عظیم اور مقدس جذبہ ہوتا ہے۔ سنو......! اگر ہم محبت کرتے تو اس کے تقدس کا ضرور خیال کرتے مگر......

خیر......! جو ہوا، غلطی میری بھی تھی اور تمہاری بھی، اور اب ہمارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ ہم دونوں اپنے لئے اس ہستی کا انتخاب کریں جو ہمارے لئے بالکل اجنبی ہو۔ اس طرح ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا جو کہ بھرپور زندگی ہوگی۔"

ذیشان نے اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی۔

"تم...... ذیشان......! تم جیسا ذلیل انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کمینے......! اتنا عرصہ تم نے کیا سمجھ کر......"

"سنو شمع......!"

ذیشان بھی کھڑا ہوگیا۔

"جب تک کوئی عورت نہ چاہے، مرد اس کے قریب نہیں آ سکتا۔ خود ہی میری طرف بڑھی تھیں۔"

"کمینے......! ذلیل......!"

شمع نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال نوچ ڈالے۔ ذیشان نے غصے سے اسے دیکھا اور زور سے دھکا دیا۔ شمع میز پر سے ہوتی ہوئی دوسری طرف گر گئی۔ مگر فوراً دیوانگی کے عالم میں اُٹھ کر ذیشان کی طرف لپکی۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی کمینے انسان......! میں تمہیں بھی ڈالوں گی اور خود بھی مر جاؤں گی۔"

"بکواس بند کرو......!"

ذیشان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے چار تھپڑ رسید کئے۔ پھر اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لایا اور دانت پیستے ہوئے لا۔

"اپنا ناپاک وجود لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ......! ورنہ......"



شام کو اس کے سسرال والے آئے اور پسند کر گئے۔ نہ پسند کرنے والی اس میں کوئی بات نہ تھی اور یوں شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ شمع کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے......؟

جی تو چاہ رہا تھا کہ کچھ کر مر جائے مگر جب گھر والوں کو دیکھتی تو پریشان ہو جاتی۔ بہت سوچ کر اس نے یہی فیصلہ کیا۔

"شادی کے بعد جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ مگر اس وقت انکار کر کے اپنے گھر والوں کو کیوں دُکھی کروں......؟"

یوں چپ چاپ اس کی شادی ہوگئی۔

انوار جو اب تک بڑے صبر و تحمل سے سب کچھ سن رہے تھے، غصے

اور نفرت سے اُٹھتے ہوئے بولے۔

''تم کس قدر مکار لڑکی ہو......! ذلیل عورت......! اس غلاظت کے ساتھ تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی......؟ تم اس قدر غلیظ ہو کہ مجھے تمہارے وجود سے گھن آ رہی ہے۔ جب عزت نام کی کوئی چیز تمہارے پاس نہ تھی، تو یہاں کیا لینے آئی ہو......؟ آخر مجھے کیوں قربانی کا بکرا بنایا تم نے......؟

تم ایک امیر ترین باپ کی بیٹی ہو۔ تم کسی بھی تیسرے درجے کے آدمی سے شادی کر سکتی تھیں، جو تمہاری دولت کے ساتھ اس غلاظت کو بھی برداشت کر لیتا۔ مگر میں اتنا بڑا سرجن، اتنا مشہور آدمی اور تم نے مجھے ہی چن لیا اس امتحان کے لئے......؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے......! دُور ہو جاؤ میری نظروں سے......! میں تمہارے ناپاک وجود کو برداشت نہیں کر سکتا۔''

وہ چیختے ہوئے بند دریچے کے پاس گئے اور پورے کا پورا کھول دیا۔

شمع نے نظر اُٹھا کر ان کو دیکھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ تیز ہوا کی وجہ سے بال منتشر ہوگئے تھے۔ شمع کتنی دیر گم سم سی بیٹھی سوچتی رہی۔

''اب مجھے کیا کرنا چاہئے......؟''

آخر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''ڈاکٹر صاحب......! میں آپ کی کیفیت کو سمجھ رہی ہوں۔''

''تم......''

انوار نے پلٹ کر اسے گھورتے ہوئے کہا۔ پھر رُخ موڑ لیا۔

''میں آپ کی مجرم ہوں ڈاکٹر صاحب......! میں جانتی ہوں، یہ جو کچھ بھی ہوا، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ میں چاہتی تو آپ کو کچھ نہ بتاتی، مگر میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ آپ جو سزا دیں گے،

منظور ہوگی۔ مگر میری ایک درخواست ہے۔ مجھے اپنے قدموں میں ینے دیں۔ آپ کچھ عرصے بعد دوسری شادی کر لیں، مجھے کوئی اعتراض نہ ۔ مگر......''

''بکواس مت کرو......!''

انوار نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''میں کسی ناول یا افسانے کا کردار نہیں ہوں۔ ایک جیتا جاگتا ان ہوں۔ سمجھیں تم......؟''

''جی ہاں ڈاکٹر صاحب......! میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔ مگر وری ہے۔ آپ کو کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔''

شمع نے حسرت سے اپنے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......! میں ضرور کچھ کروں گا۔ محترمہ......! میں یہ کروں گا کہ سب کی موجودگی میں تمہیں طلاق دے دوں گا تاکہ میرے ساتھ یہ امہ کرنے کی سزا ملے......''

''پلیز ڈاکٹر صاحب......! یہ سب کرنے سے تو بہتر ہوگا کہ آپ ے زہر دے دیں......!''

''اگر ایسی ہی غیرت والی ہوتیں تو شادی سے پہلے زہر کھا کر مر نہ جاتیں......؟ مگر تم نے یہ سوچا ہوگا، چلو عیش بھی کر لئے اور شادی بھی ہوگئی......؟ لیکن میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میں تمہیں اس مذاق کی بھیانک زا دوں گا، جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے۔''

انوار غصے سے کانپ رہے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب......! مجھے آپ کی ہر سزا قبول ہے مگر یہ ظلم مت کیجئے......! آپ یقین کریں، کچھ عرصے بعد میں خود ہی یہاں سے چلی اؤں گی۔''

''تاکہ لوگ کہہ سکیں کہ ڈاکٹر انوار کی بیوی اپنے کسی آشنا کے

ساتھ بھاگ گئی ہے۔ نہیں......! یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے، وہی ہوگا۔"

انوار غصے سے باہر نکل گئے۔ شمع سوچنے لگی۔

"آخر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔"

"ایک عورت بلکہ ہر عورت آوارہ مرد کو قبول کر لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ذیشان کی بیوی نے اسے قبول کیا ہوگا۔ مگر ایک مرد عورت کی بھول کو قبول نہیں کرتا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے......؟ ہر جرم کی سزا عورت ہی کو کیوں ملتی ہے......؟ مردوں کے لئے عام معافی کا اعلان کیوں ہے......؟ کیا دُنیا میں کوئی ایسا فرد ہوگا جو اس تضاد کی وجہ مجھے بتا سکے......؟"

"تاہم یہ تو طے ہے کہ غلطی میری تھی۔ پھر سزا سے میں کیسے بچ سکتی ہوں......؟ سزا میرا مقدر ہے۔ خدا نہ کرے، جو کبھی کوئی لڑکی میرے جیسی غلطی کرے۔ مگر اب کیا ہوگا......؟ صبح سب کی موجودگی میں طلاق کا داغ میری پیشانی پر سجے گا۔ میرا عزت دار باپ اور غیرت مند بھائی اس وقت کیا سوچیں گے......؟ کیا کریں گے......؟ کیا میں ان کی حالت دیکھ سکوں گی......؟"

"اگر میں ان کی یہ حالت نہیں دیکھنا چاہتی تو کیا کروں......؟"

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتی رہی اور اس مسئلے کا حل سوچتی رہی۔ اور بالآخر ایک حل اس کی سمجھ میں آ گیا۔



صبح انوار کمرے میں آئے تو شمع سو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے باتھ روم میں گئے اور جب لباس تبدیل کر کے باہر آئے تو وہ ابھی بھی اسی

حالت میں پڑی سو رہی تھی۔ انوار نے نفرت سے اسے دیکھا اور لب بھینچ کر بولے۔

"اب اُٹھ جاؤ محترمہ......! تمہارے انجام کا وقت قریب آ گیا ہے۔"

مگر شمع پر تو ان کی بات کا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔

"تم نے سنا نہیں......؟"

وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے اس کے قریب آئے اور پہلی ہی نظر میں پہچان گئے کہ وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہے۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟"

انہوں نے گھبرا کر شمع کو سیدھا کیا تو انگوٹھی کا ہیرا غائب تھا اور شمع کے قریب ہی کاغذ کا ایک پرزہ پڑا تھا جس پر لکھا تھا۔

"جناب ڈاکٹر صاحب......!

میں جانتی تھی میرا جرم بہت بڑا ہے۔ میں اس قابل ہرگز نہ تھی کہ آپ کی زندگی برباد کرتی۔ مگر کیا کرتی......؟ میں اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو دُکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے شادی سے انکار نہ کرسکی۔ مگر میں جانتی تھی، میری غلطی معمولی نہیں۔ لیکن پھر میں نے سوچا۔ ہوسکتا ہے آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنے مقام کو اچھی طرح پہچانتی تھی اس لئے میں آپ کی بیوی بن کر نہیں، ایک نوکر بن کر اس گھر میں رہنا چاہتی تھی۔ مگر یہ سب آپ کو قبول نہ تھا۔

خیر......! جو ہوا، سو ہوا۔ مگر ایک بات تو بتائیں......! قصور میرا بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ ذیشان کا۔ پھر سزا مجھے ہی کیوں ملی......؟ کیا اس لئے کہ میں ایک

عورت تھی......؟ اور وہ مرد تھا......؟ بہت شور ہے عورت کو آزادی دینے کا......؟ حق دینے کا......؟

اگر یہ سب صحیح تھا تو آپ مجھے معاف کر سکتے تھے، مگر نہیں......! آپ بھی تو ذیشان جیسے مرد ہیں۔ ذیشان مرد تھا، اس لئے سزا سے بچ گیا اور عورت ہونے کے ناطے مجھے یہ سزا ملنی ہی تھی۔ میں اس ذلت کو گوارہ نہیں کر سکتی جو صبح سب کی موجودگی میں مجھے ملے گی۔

چونکہ جرم میں نے خود کیا تھا، اس لئے سزا بھی خود کو میں ہی دے رہی ہوں۔ اُمید ہے آپ خوش ہو جائیں گے۔''

انوار نے خط بند کر کے ایک نظر اس کو دیکھا۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اپنے روّیے کا افسوس ہوا مگر وقت گزر چکا تھا۔



تقدیر کا چکر

سالِ نو کی پارٹی اگرچہ اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ عروج پر تھی مگر اس کے باوجود پارٹی میں شامل ہر شخص ان رنگینیوں سے بے نیاز ایک جوڑے کا منتظر تھا۔ ہنسنے ہنسانے اور باتوں میں مشغول ہوتے ہوئے بھی وہ سب اپنے دل میں سوچ رہے تھے۔

''نہ جانے کیا بات ہے......؟ وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے......؟''

مگر وہ ایک دوسرے پر بالکل ظاہر نہیں کر رہے تھے کہ وہ کسی کے منتظر ہیں۔

یہ جوڑا جس کی آمد کے سب منتظر تھے، شہر کی معروف اور معزز ہستی مسٹر و مسز راحیل کا جوڑا تھا۔ شہر کی ہر تقریب ان کے بغیر اُدھوری تصور کی جاتی تھی۔ جس پارٹی میں خوب صورت سحر نہ ہوتی، اس پارٹی میں تمام مرد حضرات خود کو بے جان تصور کرتے۔ یہی حال عورتوں کا بھی تھا۔

دفعتہً سب کی نگاہیں صدر دروازے کی جانب اُٹھ گئیں۔ خوب صورت سحر جسے دیکھتے ہی ہر کسی پر ایک سحر سا طاری ہو جاتا تھا۔ اپنے وجاہت نظر شوہر راحیل آج معمول سے کچھ زیادہ ہی وجیہہ لگ رہے تھے،

اور سحر سلک کے پاجامہ قمیص پہ ستاروں بھرا دوپٹہ اوڑھے اپنی عمر سے کئی برس کم دکھائی دے رہی تھی۔ ان پر نظر پڑتے ہی کلب کی چیئرمین مسز رضا آگے بڑھتی ہوئی بولیں۔

''کیا بات ہے بیگم راحیل......؟ آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی......؟''

''بس......! کیا بتائیں......؟ راحیل صاحب ہی کچھ دیر سے آئے، ورنہ میں تو مقررہ وقت پر تیار ہوگئی تھی۔''

سحر نے مسکرا کر راحیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ نیکلس آپ نے کب لیا......؟''

بیگم احمد جو بغور ان کا معائنہ کر رہی تھیں، پوچھنے لگیں۔

''یہ تو راحیل صاحب کی مہربانی ہے۔ اس بار جب وہ ڈنمارک گئے تھے تو واپسی پر میرے لئے یہ نیکلس لائے تھے۔''

سحر نے راحیل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو بیگم ہما، مسز رضا اور مسٹر آفاق کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ مگر نظر اُٹھا کر سحر کو بھی دیکھ لیتے تھے۔

''ارے سحر......! یہ سوٹ سلک کا ہے ناں......؟''

یہ مسز طارق تھیں۔

''ہاں......! یہ سلک ہے مگر چونکہ بہت اعلیٰ کی قسم کی ہے اس لئے ٹشو سے زیادہ چمک دے رہی ہے۔''

سحر نے اپنی طرف آتے ہوئے رضا خان کو دیکھا۔

''آج تو آپ نے بہت انتظار کرایا۔''

رضا خان سر سے لے کر ایڑی تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

''اچھا ہے ناں......! انسان دیر سے آئے۔''

سحر نے مسکرا کر کہا اور کرسی گھسیٹ کر اپنی مخصوص میز کے پاس ھ گئی۔

اسے بیٹھے ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ دفعتہً اس کی نظر سائیڈ کی ز پر بیٹھے ہوئے امبر اور عمران پر پڑی، اور ایک دم ہی سحر کو وہاں وحشت ی محسوس ہونے لگی۔ پھر جتنی دیر بھی وہ وہاں رہی بے دلی سے باتیں کرتی سنتی رہی۔ لیکن جب معاملہ برداشت سے باہر ہوگیا تو وہ جانے کے لئے ٹھ کھڑی ہوئی۔ راحیل کو تو اس کی کسی بات سے کبھی انکار ہی نہ ہوا تھا۔ ر سب کے روکنے کے باوجود وہ چلے آئے۔

''کیا بات ہے......؟ تم کچھ بے چین سی لگ رہی ہو......؟''

ڈرائیو کرتے ہوئے راحیل نے ایک اُچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔

''ایسی کوئی بات نہیں......!''

سحر نے بے مقصد باہر کی روشنیوں کو تکتے ہوئے آہستہ سے جواب یا اور دل میں سوچا۔

دولت میں لاکھ خرابیاں سہی، مگر بہت سی اچھائیاں بھی دولت سے ی وابستہ ہیں۔ ایک سب سے بڑی اچھائی تو یہ تھی، آج سب ان کی ولت کو دیکھتے تھے ماضی کو نہیں اور دولت پر ہی بات کی جاتی تھی، ماضی پر ہیں۔ دولت ہی اب ان کی شناخت تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی شہر کی معزز ہستیوں میں شمار ہوتے تھے۔

حالانکہ ان کے ماضی سے ہر ایک واقف تھا مگر ان کے منہ پر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ جس محفل میں بھی جاتے، وہاں موجود ہر شخص ان سے بات کرنے کا متمنی رہتا۔ اور سحر یہ سوچتی کہ اگر آج وہ دولت مند نہ ہوتی تو لوگ اس کا نام کبھی اچھے لفظوں میں نہ لیتے اور راحیل کو بجائے ایک صنعت کار کے ایک قاتل کہا جاتا۔ وہ اکثر خدا کا شکر ادا کرتی کہ اگر تقدیر نے اس پر ستم ڈھائے تھے، تو دولت کی فراوانی نے اس کے ہر دُکھ

درد کا مداوا بھی کر دیا تھا۔

پارٹی سے واپسی پر وہ کچھ زیادہ ہی اُداس تھی۔ اس کی وجہ شاید عمران کی وہاں موجودگی تھی، جسے اس نے اپنایا بھی جلدی میں تھا اور ٹھکرایا بھی جلدی میں تھا۔ اس نے جس تیزی سے محبت کی تھی، اتنی ہی تیزی سے نفرت بھی کی تھی۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی چپ چاپ زیور اُتارنے لگی۔ لیکن سوچوں کا دھارا عمران ہی کی طرف تھا۔

"بہت چپ چاپ ہو......! پوچھ سکتا ہوں، کیوں......؟"

راحیل نے ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"راحیل......! میں سوچتی ہوں، اگر ہمارے پاس دولت کی فراوانی نہ ہوتی تو میں لوگوں کی نوکیلی اور طنزیہ باتیں سنتے سنتے کب کی مر چکی ہوتی......؟"

"تم سے کتنی بار کہا ہے کہ ایسی باتیں مت سوچا کرو۔ جو گزر گئی تو گزر گئی۔"

راحیل نے تادیباً کہا۔

"ہاں......! گزرنے والی گزر گئی۔ مگر نہ جانے کیوں میں اب بھی اس کی چبھن محسوس کرتی ہوں۔"

"چھوڑو ڈیئر......! ماضی یاد کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ خاص کر وہ ماضی جس میں دُکھوں کے سوا کچھ نہ ہو۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو......! مختصر عرصہ کے دُکھ کے بعد تمہیں دائمی راحتیں نصیب ہوئی ہیں اور ان سب کے ہوتے ہوئے اُداس ہونا یا افسردہ ہونا، ناشکری کی بات ہے۔ چلو ماضی بھول کر مسکرا دو......!"

راحیل نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر، اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور سحر بے ساختہ مسکرا دی۔

مگر میں اپنے ماضی کو کیسے بھول سکتی تھی......؟



عمران اس کا پھوپھی زاد تھا۔ عمران سے اس کی منگنی ماں، باپ کی ند سے ہوئی تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سحر ناخوش تھی۔ وہ بہت ش تھی۔ کیونکہ عمران کے ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئی تھی۔ شاید اس سے و سال ہی چھوٹی تھی۔ عمران تعلیم ختم کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ کمپنی ں اچھے عہدے پر فائز ہوگیا تھا۔

سحر کا بچپن صرف عمران ہی کے ساتھ نہیں گزرا تھا، بلکہ اس کا یک اور ساتھی بھی تھا اور وہ تھا راحیل۔ مگر اس نے راحیل کی کبھی زیادہ رواہ نہ کی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب عمران نے اسے پرپوز کیا تو وہ فوراً ضامند ہوگئی۔

بظاہر عمران میں کوئی بھی برائی نہیں تھی۔ مگر منگنی کے روز ہی ایک یب واقعہ ہوگیا۔ منگنی کی رسم کے وقت جب پھوپھو اس کی اُنگلی میں نگوٹھی ڈال رہی تھیں تو اچانک سحر کی نظر سامنے اُٹھ گئی۔ جہاں راحیل کھڑا ی محویت سے اسے تک رہا تھا۔ دیکھ کر تو خیر سب ہی اس کو رہے تھے، مگر احیل کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ بے چین سی ہوگئی......؟ اور ظریں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد اس نے غیر ارادی طور پر راحیل کو دیکھا تو وہ رُخ موڑ ر چل دیا۔ سب لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے اور سحر، جو ہلے عمران کے بارے میں سوچ رہی تھی، اب راحیل کے بارے میں وچنے لگی۔

"اللہ......! یہ راحیل بھائی کو اچانک کیا ہوگیا......؟ کیسے گھور گھور کر ہ کو دیکھ رہے تھے......؟ کیا وہ مجھ سے ناراض ہیں......؟ مگر میں نے تو

آج تک ان سے کوئی جھگڑا نہیں کیا۔"

وہ منگنی کی خوشی بھول کر راحیل کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔

"نہ جانے وہ کیوں پریشان ہیں......؟"

اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی اُٹھ کر اس کے پیچھے چل دے۔ مگر محفل کے خیال سے وہ ضبط کئے بیٹھی رہی۔ لیکن جیسے ہی ہنگامہ کچھ مدہم ہوا اور مہمان رُخصت ہوئے تو وہ اپنے کمرے میں لی آئی۔ اور پھر یہ دیکھ کر چونک پڑی کہ راحیل اس کے کمرے میں موجود تھا، جیسے اس کا منتظر ہو۔

"منگنی مبارک ہو......!"

سحر کو دیکھتے ہی راحیل نے بظاہر مسکرا کر کہا۔ مگر سحر کو اس کی یہ مسکراہٹ مصنوعی لگی۔ وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"راحیل......! کیا تم کچھ پریشان ہو......؟"

"میرے پریشان ہونے سے کیا ہوتا ہے......؟ تم تو خوش ہو ناں......؟"

راحیل مسکرایا تو سحر شرما سی گئی۔ پھر بولی۔

"کیا تم خوش نہیں ہو راحیل......؟"

"میں......؟"

راحیل اسے چونک کر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر طویل سانس لے کر بولا۔

"کیا تم خوش ہو......؟"

"ہاں......! میں خوش ہوں۔"

سحر مسکرائی۔

"پھر تو بات ہی ختم ہوگئی۔"

راحیل نے ایک دم رُخ موڑ کر کہا۔

"کیا مطلب......؟"

سحر نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب...... مطلب بتانے کا تو اب کچھ فائدہ نہیں......!"

وہ مزید کچھ کہنے کی بجائے باہر نکل گیا اور سحر کچھ نہ سمجھتے ہوئے عمران کے بارے میں سوچنے لگی۔

"کتنا چاہتا ہے مجھ کو......! میں خوش نصیب ہوں جو مجھے عمران جیسا جیون ساتھی ملا۔"

مگر نہ جانے کیوں وہ زیادہ عمران کے بارے میں نہ سوچ سکی۔ خیال میں راحیل کا چہرہ آگیا۔

"پتہ نہیں وہ کیوں اُداس تھا......؟"

راحیل اس کے ابو کے دوست کا بیٹا تھا۔ راحیل کے ماں باپ ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ مرتے ہوئے راحیل کے والد نے راحیل کو اپنے عزیز دوست سحر کے والد زمان صاحب کے سپرد کیا تھا اور اس طرح راحیل سحر کے ہاں ہی رہنے لگا تھا۔ اس کی پرورش کی تمام ذمے داری زمان صاحب نے خود پوری کی۔ اعلیٰ تعلیم دلائی اور سحر تو راحیل کی بہت اچھی دوست تھی۔ کبھی کبھار تو عمران بھی اس سے دوستی کر لیتا۔ ورنہ زیادہ تر وہ سحر کو بھی منع کیا کرتا کہ راحیل کے ساتھ مت کھیلو۔ مگر سحر نے کبھی عمران کی بات نہیں مانی تھی۔

یوں ہی ہنستے کھیلتے وہ جوان ہوگئے اور پھر جیسے ہی عمران کو ملازمت ملی، اس نے فوراً سحر کو پروپوز کیا۔ راحیل ان دنوں اپنے آفس کے کام کے سلسلے میں ٹیکسلا گیا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہی بات پکی ہوئی تھی اور منگنی کا دن مقرر ہوگیا۔

اتفاق سے راحیل اسی دن آگیا جس دن منگنی تھی اور راحیل جو بچپن سے ہی سحر کو پسند کرتا تھا، یہ سب دیکھ کر نہ صرف حیران ہوا بلکہ اپنی حیثیت کا بھی احساس ہوگیا۔ وہ تو سحر پر اپنا پہلا حق تصور کرتا تھا۔ لیکن گھر

والوں نے تو اس کا کوئی حق نہ سمجھا تھا۔ ان سے مشورہ کرنا بھی گوارہ نہ کیا تھا۔ اس کو پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ وہ تنہا ہے۔ خاموشی سے اس نے منگنی کی رسم میں حصہ لیا تھا اور گہرے دُکھ کا احساس لئے اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ اب سحر سے بھی کچھ کہنا فضول ہی تھا۔

سحر رات دیر تک جاگتی رہی تھی۔ پھر کھلی اور بند آنکھوں سے اپنے حسین مستقبل کے سپنے دیکھتے ہوئے وہ سو گئی تھی۔ شاید اس لئے صبح آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ وہ ضروریات سے فارغ ہو کر یہ سوچتی ہوئی جلدی سے باہر آئی کہ راحیل ناشتے پر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی، اس کے بغیر راحیل نے کبھی ناشتہ نہیں کیا۔ مگر جب وہ ناشتے کی میز پر آئی تو وہاں صرف امی اور ابو تھے۔ راحیل نہیں تھا۔

”راحیل ابھی نہیں آیا کیا......؟“

سحر نے جلدی سے پوچھا۔

”وہ تو ناشتہ کر کے جا چکا ہے۔“

بیگم زمان نے اخبار دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا......؟“

سحر حیران سی رہ گئی۔ کیونکہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

”تم کیا سوچنے لگیں......؟“

بیگم زمان نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔

”امی جان......! آپ کو پتا ہے رات سے راحیل بہت پریشانی ہیں......؟“

سحر نے فکرمندی سے پوچھا۔

بیگم زمان تو چپ رہیں مگر زمان صاحب بولے۔

”میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔“

”مگر ابو جان......! وہ پریشان کیوں ہے......؟“

”میں جانتا ہوں وہ کیوں پریشان ہے......؟“

زماں صاحب نے یوں کہا جیسے وہ واقعی سب کچھ جانتے ہوں۔

سارا دن گزر گیا مگر راحیل واپس گھر نہ آیا۔ سحر بہت پریشان تھی ب رات گزرنے پر بھی راحیل گھر نہ آیا تو سبھی لوگ پریشان ہوگئے۔ ن بھی آگیا تھا اور وہ سحر کو پریشان دیکھ کر بولا۔

”تم کیوں پریشان ہو......؟“

”پریشانی کی تو بات ہی ہے......!“

سحر فکرمندی سے بولی۔

”تم اس کے آفس جا کر معلوم کرو ناں......!“

سحر نے منت بھرے لہجے میں عمران سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے......! میں اس کے آفس سے معلوم کرتا ہوں۔“

عمران نے کہا اور ناگواری سے باہر چلا گیا۔ مگر راحیل اپنے آفس ں بھی نہ ملا۔ معلوم ہوا وہ کل سے آفس ہی نہیں پہنچا تھا۔

کچھ دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔ مگر راحیل کی کہیں سے بھی لاع نہ ملی۔ سب لوگ اس کے لئے فکرمند تھے۔ کیونکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ا تھا کہ وہ بغیر اطلاع کے ایک دن بھی باہر رہا ہو۔

سحر کتاب لئے لان میں بیٹھی تھی مگر دھیان راحیل ہی میں تھا کہ چانک کوئی اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ سحر نے سر اُٹھایا اور راحیل پر نظر ڑتے ہی چیخی۔

”ہائے راحیل......! تم کہاں چلے گئے تھے......؟ ہم سب تمہارے لئے بہت پریشان تھے۔“

”میں جانتا ہوں۔“

راحیل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”مگر تم گئے کہاں تھے......؟“

سحر نے اسے غصے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بس......! ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا۔''

''تم بہت برے ہو۔ ضروری کام تھا تو کیا ہوا......؟ کم از کم اطلاع تو دے جاتے۔''

''بس......! خیال ہی نہ رہا۔ تم کہو......! کیسی گزری میرے بعد......؟''

''یہ پوچھو کہ کیا نہیں گزری......؟ سب لوگ تمہارے لئے پریشان تھے اور مجھے تو ہر دم تمہارا ہی خیال رہتا تھا۔ پتہ نہیں تم خیریت سے ہو بھی یا......''

سحر اُدھوری بات کہہ کر چپ ہوگئی۔

''اچھا......؟''

راحیل نے حیرت سے دیکھا۔

''امی ابو بھی بہت پریشان تھے۔''

''میں جانتا ہوں۔''

راحیل نے آہستہ لہجے میں کہا اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔

''یہ تم مجھے اتنا غور سے کیوں دیکھ رہے ہو......؟''

سحر پوچھ بیٹھی۔

''آں......! کچھ نہیں......!''

راحیل نے چونک کر جواب دیا اور کچھ سوچنے لگا۔

''اب کیا سوچ رہے ہو......؟''

سحر نے اس کے اُداس چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں، جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو میں تنہا رہ جاؤں گا۔''

راحیل کے لہجے میں ایک عجیب سا کرب تھا۔

''مگر تم تنہا نہیں رہو گے۔''

سحر مسکرا کر بولی۔

''کیا مطلب......؟''

راحیل نے چونک کر پوچھا۔

''مطلب صاف ہے......!''

سحر اسی لہجے میں بولی۔

''میں امی سے کہوں گی، وہ پہلے تمہاری شادی کر دیں اور بعد ......''

''نہیں......! نہیں سحر......! ایسا ظلم مت کرنا۔ میں شادی نہیں کر ''

''مگر کیوں......؟''

سحر نے حیران ہو کر پوچھا اور جواب میں راحیل کچھ دیر تک کھڑا ے دیکھتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سحر اس کے روّیے کے ے میں سوچ ہی رہی تھی کہ عمران کی آواز سن کر چونک پڑی۔

''کیا کیا باتیں ہو رہی تھیں......؟''

عمران نے کچھ تلخی سے پوچھا۔

''کس سے......؟''

سحر نے بے ساختہ کہا۔

''ابھی یہاں راحیل ہی تھا، یا کوئی اور بھی تھا......؟''

''اچھا اچھا......!''

سحر جلدی سے بولی۔

''راحیل تھا، ابھی ابھی کہیں سے آیا ہے۔''

''میں نے تو تم لوگوں سے پہلے ہی کہا تھا، پریشان ہونے کی رت نہیں۔ وہ کوئی بچہ نہیں جو گم ہو جائے گا۔ مگر تم لوگ تھے کہ......''

"پریشانی تو قدرتی بات تھی......؟"

سحر نے کچھ ناگواری سے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عمران کچھ دیر بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور پھر وہیں سے واپس ہوگیا۔

رات کھانے پر زمان صاحب نے اسے دیکھا اور شکوے بھرے لہجے میں کہا۔

"بیٹا......! تم بغیر اطلاع دیئے کہاں چلے گئے تھے......؟"

"چچا جان......! ایک ضروری کام تھا، مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اطلاع نہ کرسکا۔"

"ایسا کیا کام ہے جس کے بارے میں تم کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتے......؟"

بیگم زمان نے پوچھا۔ پھر راحیل نے بھی بات کو چھپانا مناسب نہ سمجھا۔ پھر بولا۔

"چچی جان......! میں دراصل ویزے کے لئے کراچی اور اسلام آباد گیا ہوا تھا۔"

"ویزے کے سلسلے میں......؟ مگر تمہیں ویزے کی کیا ضرورت پڑ گئی......؟"

زمان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"ضرورت اس لئے پڑ گئی کہ میں ملک سے باہر جا رہا ہوں۔"

راحیل نے کہا۔

"مگر اس سے پہلے تو تمہارے باہر جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا......؟"

راحیل نے نظر بھر کر سحر کو دیکھا اور طویل سانس لے کر بولا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں چچا جان......! اس سے پہلے میرا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ بس یہ سب اچانک ہی ہوگیا۔ اس لئے میں آپ کو کوئی

اطلاع نہ کرسکا۔ ویسے بھی اب مجھے یہاں رہ کر کیا کرنا ہے......؟"

"کیوں......؟ اچانک ایسی کیا بات ہوگئی جو تم نے جانے کی تیاری کر لی......؟"

"بات کیا ہوسکتی ہے......؟ بس میں ذرا باہر کی دُنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے......! جیسی تمہاری مرضی......!"

زمان صاحب نے گویا یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے راحیل کیوں جا رہا ہے......؟ اس کا تمام وقت بچپن سے لے کر جوانی تک سحر کے ساتھ گزرا تھا اور سحر کو پسند کرنا قدرتی امر تھا۔ زمان صاحب راحیل کی اس خواہش کو جانتے تھے۔ خود ان کا اپنا ارادہ بھی راحیل کو داماد بنانے کا تھا مگر سحر کی امی کی ضد کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور رشتہ عمران سے ہوگیا۔

اور پھر سحر کی مرضی دیکھ کر وہ خود بھی چپ ہوگئے مگر اب راحیل کی حالت دیکھ کر انہیں دُکھ ہو رہا تھا۔ انہیں خود بھی یہ مناسب لگا کہ راحیل باہر چلا جائے۔

اور اِدھر راحیل گویا عید کا چاند ہوگیا تھا۔ سارا دن گھر سے باہر رہتا۔ اگر بھولے سے کبھی گھر میں ہوتا بھی تو اپنے کمرے میں بند رہتا۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بند تھا۔ کیونکہ وہ سحر کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سحر اسے دیکھتے ہی اُلٹے سیدھے سوال کرنے لگتی۔ جن کا جواب وہ کوشش کے باوجود بھی نہ دے سکتا تھا۔

بند کمرے میں بیٹھے بیٹھے وہ اُکتا گیا تو اُٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کھلتے ہی اس کی نظر سحر پر پڑی جو لان میں پھولوں کا گلدستہ بنا رہی تھی۔ راحیل کتنی دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر باہر آگیا اور بے آواز چلتا ہوا سحر کے قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔ مگر سحر گلدستہ بنانے میں ہی

مصروف رہی۔

"کیا عمران کے لئے گلدستہ بنا رہی ہو......؟"

وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"اوہ......! تم......؟ میں تو ڈر ہی گئی۔"

سحر اچانک اسے سامنے دیکھ کر بولی تو راحیل مسکرا دیا۔ مگر چہرے پر چھائی ہوئی اُداسی دُور نہ ہو سکی۔

"کیا بات ہے راحیل......؟ تم بہت اُداس لگ رہے ہو......؟"

"تم اتنی عقل مند کب سے ہوگئی ہو کہ چہرہ پڑھ سکو......؟"

راحیل کے لہجے میں دُکھ کے ساتھ ساتھ ہلکا سا طنز بھی تھا۔

"کیوں......؟ کیا میں پہلے عقل مند نہ تھی......؟"

سحر کے لہجے میں شکوہ مچل گیا۔

"اگر پہلے عقل مند ہوتیں تو مشکل ہی کیا تھی......؟"

راحیل گہری گہری نظروں سے اسے دیکھ کر بولا۔

"اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ تم سے شکوہ فضول ہے۔"

"کیا مطلب......؟"

سحر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں......!"

راحیل ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچنے لگا۔

"مجھے یقین ہے تم کچھ کہنا چاہتے ہو......؟"

سحر نے تیزی سے کہا۔

"کیا واقعی تم کچھ نہیں سمجھتی تھیں......؟"

راحیل نے دُکھ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بتاؤ گے تو سمجھ بھی جاؤں گی۔ بغیر بتائے میں کیسے سمجھ سکتی ہوں......؟"

"مگر اب بتانے سے کیا حاصل......؟"

راحیل کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر باہر چلا گیا اور سحر وہیں بیٹھ کر اس کی بے معنی اور اُلجھی ہوئی باتوں پر غور کرنے لگی۔

"یہ راحیل کو اچانک کیا ہوگیا......؟ آخر وہ کیا کہنا چاہتا ہے......؟ کیا سمجھانا چاہتا ہے......؟"

دفعتاً ایک خیال بجلی کی مانند اس کے ذہن میں کوندا۔

"کہیں راحیل مجھ سے محبت تو نہیں کرتا......؟"

"نہیں......! نہیں......! یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے......؟ اگر وہ مجھ سے محبت کرتا تو اسے اتنا جھجکنے کی کیا ضرورت تھی......؟ اتنے سالوں سے ہم ایک ساتھ ہیں۔ کبھی تو وہ مجھ سے کچھ کہتا......؟"

"نہیں......! اسے مجھ سے محبت نہیں......!"

یہ سب وہ خود کو تسلی دینے کے لئے سوچ رہی تھی۔ مگر دل اب قابو میں نہیں رہا تھا۔

"ہائے راحیل......! اگر ایسی ہی بات تھی تو تم چپ کیوں رہے......؟"

وہ اُدھورا گلدستہ لئے اپنے کمرے میں آگئی۔ پھر رات کو کھانے پر بھی وہ باہر نہیں آئی۔ وہ راحیل کا افسردہ چہرہ مزید دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ خود ہی اسے بلانے آگیا۔

"کیوں بھئی......؟ تم کھانے کے لئے کیوں نہیں آئیں......؟ خیریت تو ہے ناں......؟"

"اب خیریت کہاں......؟ وہ باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں جو اتنا عرصہ سمجھ نہ سکی۔"

راحیل نے اسے حسرت سے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"اب سمجھ کر کیا کرو گی......؟ وقت تو گزر گیا......؟"

کچھ دیر دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر سحر بولی۔

"گویا میرا خیال درست نکلا......؟"

راحیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموش رہا۔

"راحیل......! کیا تم مجھے بتاؤ گے نہیں کہ تم چپ کیوں رہے......؟ تم نے کچھ کہا کیوں نہیں......؟"

"محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی سحر......! تم ہی نہ سمجھ سکیں۔ میں نے تو خاموشی کی زبان سے ہزاروں بار سمجھانے کی کوشش کی مگر افسوس......! خیر اب بھول جاؤ اس بات کو۔ چلو کھانا کھائیں......!"

راحیل پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"نہیں......! پہلے میری ایک بات کا جواب دو۔ کیا تم اسی وجہ سے باہر جا رہے ہو......؟"

سحر نے پوچھا اور راحیل جواب دینے کی بجائے باہر نکل گیا۔

سحر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مگر اب کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

ٹھیک تین دن بعد راحیل جا رہا تھا اور سحر اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اب مزید راحیل کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

راحیل کے جانے میں ایک روز باقی تھا کہ اچانک قسمت نے پانسہ پلٹا اور منگنی ٹوٹ گئی۔

ہوا یوں کہ عمران کئی بار سحر کو راحیل کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ چکا تھا۔ بلکہ ان کی آخری گفتگو اپنے کانوں سے سن چکا تھا۔ یہی وجہ تھی، اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ سحر کی امی کو اس بات کا پتا چلا تو وہ بہت زیادہ پریشان ہوئیں اور منگنی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ ٹوٹ بھی گئی......؟

مگر زمان صاحب بہت خوش تھے۔ جب راحیل کو اس بات کا علم تو وہ خوشی سے بھاگتا ہوا سحر کے کمرے میں گیا اور بولا۔

"دیکھا......! میری محبت کی طاقت......!"

سحر کے جواب دینے سے قبل ہی زمان صاحب کمرے میں داخل ئے۔

"راحیل بیٹے......! ذرا میرے ساتھ آنا......! مجھے تم سے ایک ڑی بات کرنی ہے۔"

اور راحیل خاموشی سے ان کے ساتھ ہولیا۔

"دیکھو بیٹے......! یہ بات مجھے تم سے بہت پہلے کرنی چاہئے تھی۔ تمہاری آنٹی کی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔ مگر خیر......! اب معاملہ ختم یا ہے۔ اگرچہ تم میرے ہی بیٹے ہو مگر میں چاہتا ہوں، سحر کا ہاتھ تھام کر ہیشہ کے لئے میرے بیٹے بن جاؤ......!"

"چچا جان......! میں آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے ن ہے کہ آپ جو بھی کریں گے، میری بھلائی کے لئے کریں گے اور پھر پ میرے بزرگ بھی ہیں۔"

راحیل نے بہت سعادت مندی سے جواب دیا۔

"شکریہ بیٹا......! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔"

اور پھر اسی شام بجائے دُھوم دھام کے بڑی سادگی سے راحیل اور ر کا نکاح ہو گیا۔ سارے کام راحیل نے خود ہی کیئے۔ اسی وجہ سے اس کا ے سامنا بھی نہ ہو سکا۔

اور پھر جیسے ہی نکاح ہوا، راحیل لڑکیوں کی طرح مسکراتا ہوا اپنے رے میں آ گیا۔ قسمت کا پانسہ یوں بھی پلٹے گا، اسے خیال تک نہ تھا۔ وہ بڑے مسرور انداز میں سحر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیونکہ نکاح بعد سحر اس کے سامنے جلوہ گر نہیں ہوئی تھی اور راحیل سوچ رہا تھا کہ

اب نہ جانے وہ کس روپ میں اس کے سامنے آئے گی......؟

اور پھر رات کو جب سب لوگ سو گئے تو وہ چپکے سے سحر کے کمرے میں آ گیا۔

سحر بھی جاگ رہی تھی۔ آہٹ پر سر اُٹھایا اور راحیل کو دیکھ کر شرما گئی۔

''سنو......! بات چیت بعد میں ہوگی، پہلے دُلہن والا لباس پہن کر دکھاؤ......!''

سحر خاموشی سے اُٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ دُلہن بنی راحیل کے سامنے تھی۔

راحیل والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا اور کاندھوں سے تھامتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

''سحر......! خدا نے میری سن لی۔ آج کا دن اور رات کس قدر حسین ہے۔ آج سے تم میری ہو اور ہمیشہ میری رہو گی۔''

سحر چپ رہی تو راحیل بولا۔

''تم خوش تو ہو ناں......؟''

''یہ شاید میری ہی دُعاؤں کا اثر ہے راحیل......! اگر یہ سب نہ ہوتا تو میری ساری زندگی دُکھوں کی صلیب پر گزرتی رہتی۔ جہاں کوئی میرا دُکھ سمجھنے والا بھی نہ ہوتا مگر تقدیر ہم پر مہربان ہوگئی۔ اور اب تم باہر بھی نہیں جاؤ گے۔''

راحیل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بیٹھتے ہوئے بولا۔

''باہر تو بہرحال جانا ہوگا۔''

''تم میری وجہ سے جا رہے تھے ناں......؟''

''جا تو تمہاری وجہ سے رہا تھا، اسی لئے اب اگر رُک گیا تو چچا جان کیا سوچیں گے......؟''

راحیل نے اس کے خوب صورت چہرے کو نظر بھر کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں میرا بھی خیال نہیں......؟ میرے کہنے سے رُک جاؤ۔ پلیز راحیل......!''

''دیکھو ڈیئر......! مجھے ہر حال میں جانا ہے۔ البتہ یہ بات اور ہے کہ میں وہاں صرف تین ماہ رہوں گا۔ کیونکہ تمہارے بغیر خود میرا بھی وہاں دل نہ لگے گا۔ مگر جانا تو ہوگا۔ دُعا کرنا میں جلدی لوٹ آؤں......!''

''آمین......!''

سحر نے جلدی سے کہا مگر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''نہیں سحر......! رومت......! اگر تم روتی رہیں تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔''

اور سحر اُداس ہوگئی۔ تاہم وہ خوش تھی کہ اب وہ راحیل کے نام سے منسوب ہے۔

راحیل کی اہمیت کا احساس تو اس کے جانے کے بعد ہوا تھا۔ وہ اکثر سوچتی۔

''اگر میری شادی عمران سے ہو جاتی تو کیا میں وہاں خوش رہتی......؟ کبھی نہیں......!''

عمران نے جتنی جلدی منگنی توڑی تھی، اتنی ہی جلدی ایک دوسری لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔ اِدھر راحیل کو باہر گئے دو ماہ ہو چکے تھے اور وہ بڑی باقاعدگی سے سحر کو خط لکھتا۔ اس کے آنے میں پندرہ روز باقی تھے۔ قسمت نے پھر پانسہ پلٹا اور سحر کی خوشیاں اُدھوری رہ گئیں۔

اصل میں کچھ لوگوں کی قسمت میں خوشیاں ہوتی ہیں مگر کم......! اور پھر ان کو راس نہیں آتی ہیں۔

یو کے، کے ایک ہوٹل میں ڈنر کرتے ہوئے راحیل کا ایک یہودی

نے جھگڑا ہوگیا جو اسلام کے بارے میں نازیبا کلمات کہہ رہا تھا۔ طیش میں آکر راحیل نے اسے قتل کر دیا اور بجائے پاکستان آنے کے وہ جیل چلا گیا۔ پاکستان میں جب سب لوگوں کو پتہ چلا تو کسی کو یقین ہی نہ آیا کہ راحیل قتل بھی کر سکتا ہے۔ مگر وہ قتل کر چکا تھا۔

سحر کے ابو اس سے ملاقات کرنے لندن گئے۔ وہ تین مہینے وہاں رہے مگر مقدمے کا ایک ہی فیصلہ سب کی زبان پر تھا۔

"عمر قید یا پھانسی......؟"

سحر کے ابو بڑے بڑے وکیلوں سے ملے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ راحیل کو سزائے موت ہوگئی۔ راحیل عدالت کا فیصلہ سن کر یوں مطمئن ہوگیا گویا دُنیا میں آنے کا مقصد پورا ہوگیا ہو اور اِدھر پاکستان میں سحر خود کو ان سب باتوں کا قصوروار سمجھتی کہ اگر وہ پہلے ہی راحیل کی آنکھوں میں چھپا محبت کا پیغام پڑھ لیتی تو آج راحیل یہاں تک نہ پہنچتا۔

وہ دن رات رو رو کر راحیل کی رہائی کے لئے دُعائیں مانگتی۔ مگر خدا کو جو منظور تھا وہ ہوگیا اور سحر کے ابو طلاق کے کاغذات پر راحیل سے دستخط کروا لائے۔ راحیل نے بھی انکار نہ کیا اور یوں زمان صاحب واپس آگئے۔ سحر کو جب اس بات کا پتا چلا تو خوب روئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا......؟

سحر کی امی ایک بار پھر اس کے لئے رشتہ تلاش کرنے لگیں۔ مگر اب کوئی آسانی سے سحر کو اپنانے کے لئے تیار نہ تھا، آخر ایک رشتہ آیا۔ لڑکا دُبئی میں تھا۔ ان لوگوں نے ہاں کر دی۔ سحر کی ایک نہ چلی۔ لڑکے کے پاکستان آنے پر شادی ہوگئی اور سحر راحیل کی یاد کو سینے میں دبائے سسرال میں چلی آئی۔ اس کا شوہر ایک عام سا آدمی تھا اور سحر کو بھی اب صرف زندگی ہی گزارنی تھی۔ کہیں بھی گزر جاتی۔

امتیاز اسے بے تحاشا چاہتا تھا۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مگر وہ

ل کو فراموش نہ کر سکی۔ دو مہینے جھٹ پٹ گزر گئے۔ امتیاز کی چھٹی ختم ی اور وہ سحر کو اپنے ساتھ لئے دُبئی چلا آیا۔ دُبئی آکر سحر پر یہ حقیقت کھلی اس کا شوہر نہ صرف پہلے سے شادی شدہ تھا بلکہ اس کے چار بچے بھی ۔ بچوں کی وجہ سے بیوی بڑی عمر کی دکھائی دینے لگی تھی اور امتیاز کو ایسی ی کی ضرورت تھی جو اس کا باہر آنے جانے میں ساتھ دے سکے۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے دوسری شادی کی۔ سحر یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ب رہی۔ ماں باپ کو بھی وہ اب کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔ امتیاز نے اسے ں دیکھا تو کہنے لگا۔

"تم اُداس کیوں ہو......؟ میں تمہارا ہر حق ادا کروں گا اور پھر ت تو پاکستان میں ہے۔ میرے پاس صرف تم رہو گی، تمہیں اور کیا ہئے......؟"

"میں نے آپ سے شکایت تو نہیں کی۔"

سحر نے آہستہ سے کہا اور دل میں سوچا۔

"یہ سب قسمت کے کھیل ہیں......!"

اگر قسمت اچھی ہوتی تو وہ راحیل سے بچھڑتی ہی کیوں......؟

امتیاز صبح کام پر جاتا اور شام کو واپس آتا۔ پھر کھانے وغیرہ سے غ ہو کر سحر کو کبھی فلم دکھانے یا سیر کروانے لے جاتا اور سحر چپ چاپ ی کی ہر بات پر عمل کرتی۔ تاہم وہ کبھی کبھی زینت کے بارے میں چتی۔

"وہ جس نے اس کے بچوں کو جنم دیا۔ آج اگر اس کی وقعت نہیں کل میری کیا ہوگی......؟"

سحر کی شادی کو دو برس ہو چکے تھے مگر ابھی تک اس کی گود ہری ہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ امتیاز نہیں چاہتا تھا کہ اب کوئی اور بچہ اس کے گھر آئے۔

اچانک ایک دن امتیاز جلدی گھر آیا اور سحر کو دیکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے......؟ آج آپ بہت جلدی آ گئے......؟''

سحر کا اتنا پوچھنا تھا کہ وہ غصے میں آگ بگولہ ہو کر اسے گھورتے ہوئے چیخ کر بولا۔

''تم نے مجھے کبھی یہ نہیں بتایا کہ تمہاری شادی پہلے بھی ہو چکی تھی......؟''

''آپ نے پہلے پوچھا ہی کب تھا......؟''

سحر نے آہستہ سے کہا۔

''میں نے پوچھا نہیں تھا تو کیا تمہارا بھی یہ فرض نہیں تھا کہ تم خود مجھے بتاتیں......؟ اب تمہارے چپ رہنے کی وجہ سامنے آ گئی۔ پہلے شوہر کی یاد آتی ہوگی......؟''

''یوشٹ اَپ......!''

ر غصے سے چیخی۔

ابھی تو صرف نکاح ہوا تھا کہ وہ باہر چلا گیا، اور وہیں پر اس کے ہاتھوں ایک یہودی کا قتل ہو گیا۔ جس پر اسے سزائے موت ہوئی اور یوں مجھے گھر بیٹھے طلاق ہو گئی۔

''چلو، خس کم جہاں پاک۔ مگر یہ تو بتاؤ......! وہ تمہارا رشتہ دار تھا یا کوئی غیر......؟''

اس پر سحر نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا اور امتیاز اُٹھتے ہوئے بولا۔

''تو گویا پہلے رومانس کا چکر چلا......؟''

اس کے ساتھ ہی امتیاز کا روّیہ سحر کے ساتھ بدل گیا اور سحر تو ہر بات کو قسمت کا لکھا سمجھ کر چپ چاپ برداشت کر رہی تھی۔ ان ہی دنوں

نے خود کو اُمید سے محسوس کیا اور پھر خدا نے اسے چاند سا بیٹا دیا۔ جسے ر سحر اپنا سب دُکھ درد بھول گئی۔ اس کی تنہائی مٹ گئی۔

مگر قسمت ایک طرف کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہسپتال سے سحر گھر ۔ اُدھر پاکستان میں زینت مر گئی اور امتیاز ہمیشہ کے لئے پاکستان سیٹل ۔ سحر اپنے بچے کے ساتھ ساتھ زینت کے بچوں کی بھی دیکھ بھال کر ی۔ پانچ بچوں کی دیکھ بھال اور اس پر سارے گھر کا کام۔ سحر کی صحت ر گئی تھی۔ مگر وہ حالات سے سمجھوتہ کئے ہوئے تھی۔ ماں باپ کے بہت کم جاتی تھی۔ امتیاز کو اس کی پرواہ ہی نہ تھی۔ وہ تو یوں بھی دن بگڑا رہتا تھا۔ مگر جب کاروبار میں خسارے کا سامنا ہوا تو وہ بات بے ر کو مارنے لگا تھا۔

ایک دن سحر شام بچوں کو نہلا کر ان کے کپڑے دھو رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور دوسرے ہی لمحے راحیل اس کے سامنے تھا۔ سحر کتنی اسے آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی اور پھر بچوں کی آواز سن کر چونک ہاتھ دھو کر وہ جلدی سے اُٹھی اور راحیل کو لئے ڈرائنگ روم میں

''کیسی ہو......؟''

راحیل نے اس کی اور امتیاز کی شادی کی تصویر دیکھتے ہوئے

''جیسی بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔''

سحر آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''مگر تم یہاں کیسے......؟''

''تمہیں معلوم تو ہوگا کہ مجھے پھانسی کی سزا ہوئی تھی......؟ یہ بات کے مسلمانوں کے لئے تازیانہ تھی۔ انہوں نے سزائے موت کے ٹ کی۔ پھر سارا کیس انہوں نے خود لڑا اور آخرکار برٹش حکومت

مجھے رہا کرنے پر مجبور ہوگئی اور میں چلا آیا۔"

راحیل چپ ہوا ہی تھا کہ امتیاز اندر چلا آیا۔

"ان کی تعریف......؟"

امتیاز نے راحیل کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ راحیل ہیں......!"

سحر کے کانپتے ہونٹوں سے نکلا اور امتیاز نے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوری بھئی......! تم لوگوں کو تو باتیں کرنی ہوں گی، میں جاتا ہوں۔"

وہ چلا گیا تو سحر بولی۔

"پلیز راحیل......! تم چلے جاؤ۔ مائنڈ مت کرنا۔ میری زندگی کا معاملہ ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

راحیل نے مدہم لہجے میں کہا اور کچھ سوچتے ہوئے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی امتیاز اندر آیا اور سحر کو گھورتے ہوئے بولا۔

"یہ یہاں کیا لینے آیا تھا......؟"

"ملنے آیا تھا اور کیا لینے آیا تھا......؟"

سحر نے بھی ہمت کر کے کہہ دیا۔

"مگر آئندہ اسے یہاں نہیں آنا چاہئے......!"

امتیاز اسے تھپڑ مارتے ہوئے چیخ کر بولا۔ پھر گاڑی گیراج سے نکال کر باہر چلا گیا۔ اس کے بعد اسے گھر آنا نصیب نہ ہوا۔

ابھی راحیل گھر پہنچا ہی تھا کہ اچانک فون آگیا کہ امتیاز کا بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ راحیل گھر والوں کے ساتھ فوراً اسپتال پہنچا۔ سحر ایک طرف کھڑی رو رہی تھی اور امتیاز آخری سانسیں پوری کر رہا تھا

نے سے پہلے اس نے صرف راحیل سے بات کی۔

"مجھے یقین ہے میرے مرنے کے بعد تم سحر کو اپنا لو گے۔ مگر میں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے بچوں کو بے سہارا سمجھ کر چھوڑ مت ۔ خدا کے بعد انہیں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر امتیاز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ سحر کی تو دُنیا اُجڑ ۔ مگر قسمت کے سامنے کسی کا کیا بس چلتا ہے......؟ جو ہوتا ہے، سہنا ا ہے۔

سحر خاموشی سے اپنی بیوگی کے دن پورے کر رہی تھی اور راحیل ب چاپ اس کی ضروریاتِ زندگی پوری کر رہا تھا۔ یوں چھ ماہ گزر گئے پھر راحیل نے سحر سے شادی کی بات کی تو سحر نے صاف انکار کر دیا اور ۔

"نہیں راحیل......! اب مزید دُکھ سہنے کی مجھ میں ہمت نہیں......!"

"پاگل مت بنو سحر......! اتنے بچوں کی دیکھ بھال تم کیسے کرو ......؟ اگر میرا ساتھ ہوگا تو ہم دونوں مل کر ذمے داریاں اُٹھالیں گے۔ نہ دوسری صورت میں، میں ہمیشہ کے لئے پاکستان چھوڑ دوں گا۔"

یوں سحر مان گئی اور ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ قسمت شاید اب ئی دُکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ سحر جو دُکھ سہہ سہہ کر مرجھا چکی تھی، شادی ے بعد ایک دم نکھر گئی تھی اور ان دنوں تو وہ اور بھی خوب صورت ہوگئی تھی ر راحیل اپنے وعدے کے مطابق امتیاز کے بچوں کی بھی پرورش کر رہا تھا۔ اپنے بچے کو بعد میں دیکھتا تھا، پہلے امتیاز کے بچوں کو۔

سحر سوچتی۔

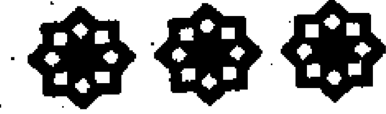
"اگر میں کسی متوسط یا چھوٹے طبقے میں ہوتی تو لوگ تین رنگ کی ولاد کہہ کر طعنوں سے میرا سینہ چھلنی کر دیتے۔"

مگر اس اونچی سوسائٹی میں جس کی وہ فرد تھی، انسان نہیں، دولت

پہچان تھی۔ راحیل اس کو خوش رکھنے کے لئے شہر میں ہونے والی ہر تقریب میں شامل ہوتا تھا اور لوگ ان کی جوڑی کو دیکھ کر مارے رشک کے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگتے۔ اس وقت راحیل مسکرا کر سحر سے کہتا۔

"مجھے ڈر ہے کہیں پھر ان لوگوں کی نظر نہ لگ جائے......؟"

سحر مسکرا دیتی۔



"کیا سوچ رہی ہو بھئی......؟ آج سونے کا پروگرام نہیں......؟"

راحیل کی آواز سن کر سحر چونک پڑی۔ پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔

"راحیل......! اتنے چکروں کے بعد بھی ہم مل گئے ہیں۔ اگر خدا نے ہمیں ملانا ہی تھا تو پہلی بار میں ہی کیوں نہ ملا دیا......؟"

"جناب......! ایک چیز ہوتی ہے قسمت......! دُنیا میں آنے والا ہر شخص قسمت سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ سب بھی قسمت کے چکر تھے۔ مگر تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ اس نے تمہارے ہر دُکھ کا مداوا کر دیا۔"

"ہاں......! یہ تو ہے......!"

سحر نے کہا اور دونوں مسکرا دیئے۔



انتظار

دھیمی دھیمی چلتی ہواؤں میں ہم گم ہو گئے تو
کچھ پتا نہ چلا اور رات بیت گئی
گھٹنوں میں سر دیئے تیری راہ تکتے ہوئے
تیرا انتظار کرتے رہے اور رات بیت گئی

سردی کا موسم تھا اور اس پر غضب یہ کہ ایک ہفتے سے مسلسل ساری رہی تھی۔ جس کی وجہ سے جہاں سردی کی شدت میں اضافہ ہوا تھا، وہاں روباری زندگی بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ دفاتر میں حاضری برائے تھی۔

اس شدید سری میں کسی کا بھی گھر سے نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر زیبہ باقاعدگی سے کالج جا رہی تھی۔ اگرچہ کلاس اسٹوڈنٹس کی حاضری بھی ئے نام تھی مگر شازیہ نے خود چھٹی کرنا گوارہ نہ کیا تھا۔

آج صبح جب وہ کالج سے آئی تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا

اور ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ مگر جب وہ کالج سے واپس آئی تو سورج تیزی سے چمک رہا تھا۔ آسمان بھی بالکل صاف و شفاف تھا۔ شازیہ کو کہیں بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہ آیا۔

شازیہ کھانا کھانے کے بعد نرم چمکتی دُھوپ کا لطف اُٹھانے لان میں چلی آئی۔ ویسے بھی کالج سے وہ ہوم ورک لائی تھی۔ ایک ہفتے کی بارش کے بعد نرم دُھوپ جسم کو حرارت پہنچا رہی تھی۔ کالج سے لائی ہوئی فائلیں سامنے رکھے، شازیہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندھ لگیں اور اسی لمحے بیگم جمال لان میں چلی آئیں۔ پہلے تو کچھ دیر کھڑی شازیہ کو دیکھتی رہیں پھر آہستہ سے پکارا۔

''شازیہ بیٹا......!''

''امی......! آپ......؟''

شازیہ نے فوراً آنکھیں کھول کر ان کو دیکھا پھر ان کو بیٹھنے کا کہتے ہوئے اس نے دل میں سوچا۔

''یقیناً امی جان کوئی نیا پرپوزل لے کر آئی ہوں گی۔''

''بیٹھنے کے لئے تو بیٹا......! وقت نہیں، آج ذرا دُھوپ نکلی ہے تو مجھے لازمی شاپنگ کے لئے جانا ہے۔ تمہاری پھوپھو کے آخری بیٹے طاہر کی شادی ہو رہی ہے۔''

وہ رُکیں تو شازیہ نے کہا۔

''اچھا......! شادی ہو رہی ہے......؟ لیکن کب......؟''

''ایک ہفتے بعد بارات ہے۔ کتنی خواہش تھی میری اور تمہاری پھوپھو کی کہ تمہاری شادی طاہر سے ہو......!''

''امی......! اس بات کو چھوڑیں۔''

شازیہ نے ناگواری سے ان کی بات کاٹی۔

''بات خود ہی چھوٹ گئی ہے، میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ تمہاری

پھوپھو کی خواہش ہے کہ تم سب کچھ بھول کر اس شادی کو اٹینڈ کرو۔''

''جی امی......! میں کوشش کروں گی۔''

شازیہ نے گویا ہامی بھری۔

''اور ہاں......! تمہارے لئے مسز جاوید نے اپنے بیٹے کا پرپوزل بھیجا ہے، تمہارے ڈیڈی کو بھی لڑکا پسند ہے۔''

''امی جان......! میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔''

''حالانکہ یہ بات تم نے خود ہی کہی تھی کہ تم پچیس برس کی عمر میں شادی کرو گی اور اب تم چھبیس برس کی ہو چکی ہو۔ بلکہ آئندہ ماہ ستائیس واں برس شروع ہو جائے گا۔ اچھی طرح سوچ لو۔ شادی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ وہ پہلے ہی نکل چکی ہے۔ اگر یہ عمر بھی نکل گئی تو بیٹھ کر گزرے وقت کو روتی رہو گی۔''

انہوں نے کچھ غصے میں کہا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا امی جان......! اور اگر ہوا بھی تو آپ سے شکایت نہیں کروں گی۔ آپ انکار کر دیجئے......!''

شازیہ نے بحث سے بچنے کے لئے خشک لہجہ اختیار اور بیگم جمال بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی گئیں اور شازیہ سوچوں کے بھنور میں ڈوب گئی۔



بھائی بڑا تھا، شازیہ چھوٹی تھی، باپ ایک بہت بڑا صنعت کار تھا۔ دونوں بہن بھائی والدین کی آنکھوں کا تارا تھے۔ خاص کر شازیہ کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گو کہ دونوں بھائی بہن بہت لاڈلے تھے مگر بیٹی ہونے کے ناطے شازیہ زیادہ پیاری تھی۔ شازیہ بھائی سے دس سال چھوٹی تھی اور بے حد شوخ و چنچل تھی۔

کالج جاتے ہی اس نے گاڑی لینے کے لئے ضد شروع کر دی تھی

کیونکہ میٹرک کے ایگزام کے بعد جو فارغ وقت اس کو ملا تھا، اس میں شازیہ نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ اس کی ضد سے تنگ آکر جمال صاحب نے اس کو گاڑی لے کر دی تھی۔

گاڑی ملتے ہی شازیہ اور آزاد ہوگئی تھی۔ فاسٹ ڈرائیونگ کرتی اور اکثر سہیلیوں کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل جاتی۔ جینز شرٹ اس کا فیورٹ ڈریس تھا۔ گھر کے اندر ہوتی یا باہر، ہمیشہ یہی لباس پہنتی اور ہمیشہ بال کھلے رکھتی، ہمیشہ شرارتیں کرتی اور ہنستی رہتی۔

مگر اچانک شازیہ کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب آیا جس نے اس شوخ اور چنچل لڑکی کو سنجیدہ بنا دیا۔

وہ تقریباً آٹھ سال سے ایسی ہی سنجیدہ زندگی گزارتی آرہی تھی اور اب چند سالوں سے تنہا بھی تھی۔ یہ سب کیسے ہوا......؟ کوئی بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

بیگم جمال کا خیال تھا، ان کی بیٹی پر کسی نے کچھ کر دیا ہے۔ جبکہ اصل بات تو صرف شازیہ ہی جانتی تھی کہ اس میں یہ تبدیلی کیسے آئی......؟

وہ کوئی عام سا دن نہیں تھا، ایک بے حد اہم دن تھا، جب شازیہ میں یہ تبدیلی آئی اور وہ دن تھا شازیہ کے بھائی ناصر کی شادی کا۔

آج سے آٹھ سال پہلے جب شازیہ کے بھائی ناصر کی شادی طے پائی تو شازیہ کی عمر 17 سال تھی۔ ان دنوں وہ فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ والدین ہی نہیں، خاندان بھر کے لوگ اس کو بے حد چاہتے تھے اور اس چاہت نے اس کو مغرور بنا دیا تھا۔ ناصر کی شادی پر سب نے خوب صورت چمکیلے ملبوسات بنائے تھے مگر شازیہ نے اس موقع پر بھی اپنے لئے پینٹ شرٹس اور بلاؤز ہی سلوائے تھے۔

مہندی کی رات جب وہ زندگی میں پہلی بار ماں کے مجبور کرنے پر اورنج لہنگا سوٹ پہن کر ہال میں آئی تو تمام کزنز اس کو پہلی بار کسی اور

ں میں دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

''ارے شازیہ......! تم اور اس لباس میں......؟''

فرحت اس کو دیکھ کر زور سے ہنسی۔ شازیہ نے ایک نظر اپنے پڑوں پر ڈالی اور پوچھا۔

''اچھا نہیں لگ رہا ناں......؟''

''ارے نہیں نہیں......! بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

فرحت نے جلدی سے کہا۔

''اونہہ......! خاک اچھا لگ رہا ہے......؟''

شازیہ نے برا سا منہ بنا کر کہا اور فوراً ہال سے باہر چلی گئی۔ کچھ ر بعد وہ واپس آئی تو سرخ پینٹ اور پیلی شرٹ میں ملبوس تھی۔ شرٹ کے لر اور کف پر سرخ ستاروں کا نفیس کام بنا ہوا تھا۔

''ارے......! یہ کیا......؟''

سب نے شازیہ کو گھورا مگر وہ ڈھٹائی سے ہنستی ہوئی بولی۔

''بابا......! مجھ سے نہیں وہ پیراشوٹ نما لباس پہنا جاتا۔''

''مگر آج تو مہندی تھی، اس موقع پر تو چمکیلے کپڑے ہی اچھے لگتے ہیں۔''

فرحت نے اس کو سمجھایا۔

''امی نے مجھے بچپن سے یہی لباس پہننا سکھایا ہے۔ اب مجھ سے دوسرا لباس نہیں پہنا جاتا اور نہ ہی کبھی پہنوں گی۔''

شازیہ نے نفرت سے ناک سکیڑی۔ تب ہی ہال میں خاندان بھر کے لڑکوں کی ٹولی گھس آئی۔ گانے ناچنے کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ ایسے میں شازیہ کا کزن طاہر اپنے دوست شرجیل کو گھسیٹ کر لے آیا اور چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔

''کوئی ہے جو شرجیل کا مقابلہ کرے......؟''

"یہ کیا تان سین ہیں......؟"

شازیہ نے ہنستے ہوئے چوٹ کی تو شرجیل بے ساختہ مسکرا دیا۔

"یار......! شروع کرو ناں......!"

طاہر شرجیل کو خاموش دیکھ کر چیخا تو شرجیل نے شوخ سی شازیہ کو دیکھتے ہوئے شوخ سا سانگ شروع کیا۔

"کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے

کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لئے

نغمہ گاتے ہوئے شرجیل کی آنکھیں صرف شازیہ کے چہرے پر مرکوز رہیں اور نغمہ ختم ہوتے ہی شرجیل نے سب کی موجودگی میں شازیہ کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

"کہیئے......! کیسے لگے آپ کو میرے یہ نغمے......؟"

"شٹ اَپ......! آپ نہ جانے کیا سمجھتے ہیں خود کو......؟"

شازیہ نے ناگواری سے کہا۔

"پہلے تو کچھ نہیں سمجھتا تھا، اب آپ کو دیکھا تو......"

شرجیل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات اُدھوری چھوڑ دی۔ سب ہی کزنز ہنسنے لگے اور شازیہ تلملا کر بولی۔

"مسٹر! ہوش میں رہ کر بات کریں۔ میں بدتمیزی پسند نہیں کرتی۔"

"اچھا......؟"

شرجیل نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ویسے، بائی دا وے......! آپ جو پسند کرتی ہیں، وہ سب بتا دیجئے۔ کیونکہ بندہ آپ کے بارے میں بہت سیریس ہو چکا ہے۔"

"بکواس مت کریں......! ابھی میرا ایسی خرافات سننے کا کوئی پروگرام نہیں۔"

شازیہ مارے غصے کے غرائی۔

"چلو خیر......! کوئی بات نہیں، ابھی نہیں تو پھر سہی......!"

شرجیل نے شوخی سے کہا۔

"پھر کیا میرے لئے آپ ہی رہ جائیں گے......؟"

شازیہ نے ہنس کر کہا اور ایسے ہی ہنسی مذاق میں رات کٹ گئی تھی۔

صبح بارات تھی، سب نے ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ لباس پہنا تھا۔ شازیہ نے کوئی غرارہ یا ساڑھی پہننے کے بجائے گرین پینٹ اور ریڈ بلاؤز پہنا تھا۔ جس پر بہت خوب صورت کام بنا ہوا تھا۔ میک اَپ کرنے کے بعد اس نے اپنے گھنے سیاہ بال کھلے چھوڑ دیئے اور جب وہ باہر آئی تو ہر ایک نگاہ اس کو پیار سے تک رہی تھی۔ شازیہ نے فخر سے گردن تان کر اپنی کزنز کی طرف دیکھا۔ پھر ناصر کی طرف بڑھ گئی۔

دُلہن کے گھر بھی وہ ہر ایک کی نظروں کا مرکز بنی رہی اور پھر بارات کی رُخصتی سے پہلے ہی وہ یہ سوچ کر کہ کہیں اس کی گاڑی میں کوئی دوسرا مہمان نہ بیٹھ جائے، اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

وہ طوفانی رفتار سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ فیروز پور روڈ سے وہ ابھی کچھ ہی دُور تھی کہ ایک سائیکل سوار اس کی گاڑی کی زد میں آتے آتے بڑی مشکل سے بچا۔

"بدتمیز......!"

بریک لگاتے ہوئے شازیہ زور سے چیخی کہ اپنی غلطی اس نے کبھی بھی تسلیم نہ کی تھی۔ ہمیشہ سے ضدی اور خودسر تھی۔ سائیکل سوار کی سائیکل تو سڑک پر گر ہی چکی تھی، وہ خود بھی بے چارہ اوندھے منہ گرا تھا۔ شازیہ کی باتیں سن کر وہ اُٹھا اور اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے شازیہ کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔

"دیدے پھاڑ کے کیا دیکھ رہے ہو......؟ راستہ چھوڑو......!"

شازیہ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"بکواس مت کرو......! ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ بجائے معذرت کرنے کے بکواس کر رہی ہو......؟"

وہ جو کوئی بھی تھا، بدتمیزی سے چیخا۔

"ایڈیٹ......! تمہیں لیڈیز سے بات کرنے کی تمیز نہیں......؟"

شازیہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آئی تھی۔

"لیڈیز......؟"

وہ حقارت سے ہنسا۔

"آخر خواتین کے احترام کو ہی کیوں اتنے واضح طور پر پیش کیا گیا......؟"

وہ زہر خند سے شازیہ کے لباس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

"تم جیسے جاہل، گنوار، جنگلی سے بات کرنا ہی فضول ہے۔"

شازیہ بڑبڑاتی ہوئی دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

"زبان کو لگام دو لڑکی......! ورنہ......"

بات اُدھوری چھوڑ کر وہ شازیہ کو گھورنے لگا۔

"میں کیا تم سے ڈرتی ہوں......؟ فول کہیں کا......!"

شازیہ نے اونچی آواز میں کہا اور زن سے گاڑی بڑھا لے گئی۔ مگر چند ہی قدموں کے فاصلے پر شادمان سے آنے والی گاڑی شازیہ کی گاڑی سے ٹکرا گئی۔ زور دار دھماکہ ہوا۔ شازیہ نے گاڑی کو ٹکراتے ہوئے دیکھ کر بریک لگاتے ہوئے دہشت سے آنکھیں بند کر لیں مگر بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے یہ ضرور دیکھا تھا کہ اس کے پیچھے آنے والا سائیکل سوار کھڑا طنز بھری نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا اور پھر شازیہ کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش آیا تو وہ گاڑی کے بجائے موٹے بان کی چارپائی پر لیٹی ہوئی

تھی۔ شازیہ نے نقاہت سے آنکھیں کھول کر اپنے چاروں سمت دیکھا۔ یہ اک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ وہی اکلوتی چارپائی تھی جس پر شازیہ لیٹی ہوئی تھی۔ چادر بچھی ہونے کے باوجود شازیہ کو بان چبھنے لگے تو شازیہ اُٹھ بیٹھی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

ایک طرف پرانی طرز کی دو کرسیاں اور میز پڑی تھی، جن پر گرد جمی ہوئی تھی۔ کمرے کی چھت پر جگہ جگہ جالا لگا ہوا تھا۔ لگتا تھا، جیسے برسوں سے یہاں کسی نے صفائی ہی نہ کی ہو۔ آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے اچانک اس کی نظر خود پر پڑی تو وہ حیران رہ گئی۔

اس کا آدھے سے زیادہ بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ماتھے پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پہلی بار شازیہ پریشان ہوئی اور اُلجھ کر سوچا۔

"نہ جانے کس کا گھر ہے......؟"

اس نے دروازے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک زور دار ٹھوکر کے ساتھ دروازہ کھلا اور وہی سائیکل والا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کی پیالی تھی۔

"تم......؟"

شازیہ نے اس کی طرف سہم کر دیکھا۔

"لو پکڑو......!"

اس نے ہاتھ میں پکڑی دودھ کی پیالی حقارت سے شازیہ کی طرف بڑھائی۔

"میں نہیں پیوں گی......!"

شازیہ نے مشکوک نظروں سے اس کو دیکھا۔

"ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق دودھ لایا ہوں ورنہ تم میری کچھ لگتی نہیں ہو۔ چلو پکڑو اور پی لو......!"

اس کی آنکھوں اور لہجے میں نفرت ہی نفرت بھری ہوئی تھی۔

"کہا ناں......! میں دودھ نہیں پیئوں گی۔"

شازیہ نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"تم دودھ نہیں پیئو گی......؟"

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"بالکل نہیں......! کوئی زبردستی ہے کیا......؟"

"اس لئے نہیں پینا چاہتیں کہ دودھ میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔ مگر یہ دودھ اب تمہیں پینا پڑے گا۔ چلو پیئو......!"

شازیہ کے انکار پر اس نے ایک بھرپور ہاتھ شازیہ کے گال پر رسید کیا۔

"جنگلی......! کمینے......!"

شازیہ نے اس کے ہاتھ سے دودھ کی پیالی لے کر زمین پر دے ماری۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو......؟"

آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو پینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ چیخی۔

"اس وقت سڑک پر میرے سوا کوئی دوسرا ہمدرد نہیں تھا اس لئے اُٹھا لایا۔ اپنے پاس سے پیسے دے کر تمہاری مرہم پٹی کروائی ہے اور تمہارے مزاج ہیں کہ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں......؟ تم سمجھتی کیا ہو خود کو......؟ تمہارے یہ نخرے، یہ آنسو یہاں کام نہ آسکیں گے۔ بہتر ہے بیٹھ جاؤ......! تمہاری گاڑی کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ ورکشاپ بننے کے لئے گئی ہے، ابھی آتی ہے تو چلی جانا......!"

شازیہ جو ابھی تک گالوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی، اس نے اس کی بات سن کر چارپائی سے اپنا پرس اُٹھایا اور ایک بڑا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے حقارت سے بولی۔

"زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں، یہ پیسے پکڑو اور مجھے میری ی کے پاس لے چلو......!"

"تم امیر لوگ خود کو سمجھتے کیا ہو......؟"

وہ شازیہ کے ہاتھ سے نوٹ پکڑ کر اس کے کئی ٹکڑے کرتے ئے غرایا۔

"میں ایسے کئی نوٹ تم جیسے کمینوں کے سامنے جلا سکتا ہوں۔"

"ہونہہ......! ہوں گے تو جلاؤ گے ناں......؟"

شازیہ نے طنز کیا۔

"بہت زبان چلتی ہے تمہاری......!"

وہ مارے غصے کے پاگل ہوگیا۔

"مجھے جانے دو......!"

اس کو شدید غصے میں دیکھ کر شازیہ دروازے کی طرف بھاگی۔

"رُک جاؤ......!"

اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر شازیہ کا راستہ روکا پھر تلخی سے کہا۔

"کیا سمجھ کر بھاگی تھیں......؟ لوفر ہوں، تمہارے خیال میں، اگرچہ ا نہیں، مگر اب تمہیں بن کر دکھاؤں گا۔"

"دیکھو......! میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔"

شازیہ گھبرا کر پھر دروازے کی طرف بڑھی۔

"مگر مجھے تو ایسا ویسا لڑکا سمجھا ہے ناں تم نے......؟"

نفرت سے شازیہ کی طرف بڑھا مگر قریب پہنچتے ہی شازیہ نے یک کراٹے کا وار کر کے اس کو چارپائی پر گرا دیا اور خود دروازہ کھول کر باہر ا گی۔ مگر جبار نے اس کو صحن میں ہی جا لیا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے آیا اور گھور گھور کر اس کو دیکھنے لگا۔

"دیکھو تم مجھے جانے دو......! تم مجھے جیسی لڑکی سمجھ رہے ہو، میں

ویسی نہیں ہوں۔ میں اچھی لڑکی ہوں۔"

شازیہ نے کہا اور اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی جس سے خون رِسنے لگا تھا۔

"اچھی لڑکی......؟ اپنی لباس کو دیکھا ہے تم نے......؟"

اس نے نفرت سے شازیہ کی ٹائٹ پینٹ، ہاف بازو کے بلاؤز کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارا یہ لباس بتاتا ہے کہ تم کیسی لڑکی ہو......؟ تم نے یہ بال کس لئے کھلے چھوڑے ہیں......؟ ہم لڑکوں کو دکھانے کے لئے ہی کھلے چھوڑے ہیں ناں......؟ ورنہ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے......؟ اور اس فیشن کا کیا کہنا......! اب اگر میں تمہارے ساتھ کوئی گستاخی کر بیٹھوں تو قصور کس کا ہوگا......؟ تمہارے اس حلیے کا......!"

"میرے بھائی جان کی شادی تھی، میں تو بارات کے ساتھ اس لباس میں بال کھلے چھوڑ کر گئی تھی۔"

شازیہ وضاحت کرتے ہوئے رونے لگی تو جبار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"بھائی کی شادی میں کیا ایسے کپڑے پہنے جاتے ہیں......؟ مائی ڈیئر گرل......!"

جبار کے منہ سے انگریزی کے الفاظ سن کر وہ حیران رہ گئی مگر وہ لاپرواہی سے کہہ رہا تھا۔

"تمہارا یہ لباس، یہ کھلے بال، یہ میک اَپ، اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ تم اچھی لڑکی نہیں ہو۔"

"اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں......؟"

شازیہ پریشانی سے اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی جس سے خون رِس رہا تھا۔ پھر اس کی توجہ خود سے ہٹانے کے لئے شازیہ نے پوچھا۔

"تم پڑھے لکھے ہو......؟"

"پڑھا لکھا ضرور ہوں مگر ڈگری دیکھنے کی میں نے کبھی ضرورت وس نہیں کی۔"

"کہاں تک پڑھا ہے......؟"

شازیہ نے اس کو باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔

"بی کام کیا ہے مگر ایک ورکشاپ میں ایک معمولی موٹر مکینک ں۔ لیکن تم مجھے اس طرح باتوں میں نہیں لگا سکتیں۔"

وہ شازیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے جانے دو......!"

شازیہ نے سچ مچ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ شازیہ کے تھوں سے رِستا ہوا خون دیکھ کر وہ چونکا مگر پھر لاپرواہی سے بولا۔

"جاؤ چارپائی پر بیٹھ جاؤ......!"

"مجھے جانے دو......! میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے......؟"

"روٹی کھاؤ گی......؟"

جبار نے اپنی کرخت آواز میں پوچھا۔

"نہیں......!"

شازیہ کا جواب مختصر تھا۔ جبار نے دوبارہ نہ کہا۔ باہر سے جا کر کھانا لے آیا۔ تنور کی دو روٹیاں، ساتھ آلو کی بھجیا تھی۔ وہ شازیہ کے امنے بیٹھ کر خاموشی سے کھانے لگا۔

"اس کھانے کی دعوت تو تم مجھے دے رہے تھے۔"

شازیہ کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ جبار نے زہر خند نظروں سے س کی طرف دیکھا۔

"غریب لوگ جانوروں کی طرح نہیں کھاتے، مائی ڈیئر گرل......! جتنا کھانا دو آدمیوں کے لئے تمہاری میز پر چنا جاتا ہے، اتنا کھانا دس آدمی

کھائیں تب بھی تھوڑا سا بچ جاتا ہے۔ تم لوگوں کو اتنا کھانا میز پر رکھ کر کبھی کسی غریب کا بھی خیال آیا ہے کہ دُنیا میں بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک ایک روٹی کے لئے بھی ترستے ہیں......؟ قیمتی ملبوسات پہنتے ہوئے کبھی یہ بھی سوچا ہے، غریب لوگ دس بیس روپے گز والے کپڑے کو بھی ترستے ہیں......؟ ماڈرن لباس پہن کر سڑکوں پر آوارہ گھومتے ہوئے کبھی یہ بھی سوچ لیا کرو کہ اگر غریب لڑکے تم کو اس روپ میں دیکھیں گے تو کیا ان کا دل نہیں مچلے گا......؟''

''تقریر کرنے کا بہت شوق ہے تو سیاست میں کیوں نہیں چلے جاتے......؟''

شازیہ نے اس کی باتوں سے اُکتا کر کہا۔ جبار کوئی تلخ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ......!''

جبار نے کہا تو ایک بارہ سال کا لڑکا کمرے میں داخل ہوا اور چابی جبار کے آگے پھینکتے ہوئے بولا۔

''گاڑی بن گئی اُستاد......!''

''تم جاؤ......!''

جبار نے چابی پکڑ کر شازیہ کے آگے پھینکتے ہوئے کہا۔ پھر پانی کا گلاس اُٹھاتے ہوئے اس نے شازیہ سے کہا۔

''مائی ڈیئر گرل......! اب تم بھی اپنے گھر کی راہ ناپو......!''

''تو کیا میں سچ مچ چلی جاؤں......؟''

شازیہ نے خوشی سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔ جبار نے ایک گہری نظر اس کے حلیے پر ڈالی پھر کچھ سوچ کر بولا۔

''ہاں......! چلی جاؤ......! مگر ایک وعدہ کر کے......؟''

''کیسا وعدہ......؟''

شازیہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھ سے وعدہ کرو......! آئندہ تم جینز شرٹ کبھی نہیں پہنو گی۔ کبھی کھلے نہیں چھوڑو گی۔ کبھی اتنا زیادہ میک اَپ نہیں کرو گی۔ بولو......! وعدہ کرتی ہو......؟''

''اے......! تم ہو کون مجھ سے وعدہ لینے والے......؟ کیا حیثیت ہے تمہاری......؟ کیا تعلق ہے میرا تم سے جو میں یہ وعدہ کروں؟ اونہہ!''

شازیہ اپنی فطرت میں لوٹ گئی۔ جبار نے پانی پیتے ہوئے ایک نظر اس کو دیکھا پھر گلاس رکھتے ہوئے وہ نہ صرف کھڑا ہوا بلکہ اچانک ہی شازیہ کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

''تعلق پیدا ہوتے صدیاں تو نہیں لگتیں......؟ ابھی چاہوں تو تعلق پیدا کرسکتا ہوں۔''

''بہت بے شرم ہو......!''

شازیہ مارے شرم اور غصے کے سرخ ہوگئی۔

''جو بھی سمجھ لو۔ بولو......! وعدہ کرتی ہو یا......''

جبار اپنی گرفت سخت کرتے ہوئے اس کے چہرے پر جھکا تو شازیہ جلدی سے بول پڑی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی میک اَپ نہیں کروں گی، کبھی بال کھلے نہیں چھوڑوں گی، کبھی جینز شرٹ نہیں پہنوں گی۔ پلیز......! اب مجھے جانے دو......!''

اس کی آنکھوں سے پانی کے قطرے گرنے لگے۔ جبار نے مسکرا کر اس کو چھوڑ دیا۔ شازیہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے بھنویں اُچکا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

''جاتی ہو یا......''

اور شازیہ بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"ایسے انسان کا کیا بھروسہ......؟ کہیں پھر نہ پکڑ لے۔"

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے یوں جبار کے گھر کی طرف دیکھا، جیسے یقین ہو کہ وہ اس کو سی آف کرنے ضرور آئے گا۔ مگر جب کافی دیر انتظار کے باوجود وہ باہر نہ آیا تو شازیہ نے زور زور سے ہارن دینا شروع کر دیا۔ جبار فوراً جھلایا ہوا باہر آیا۔

"اب کیا تکلیف ہے......؟"

اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر تلخی سے پوچھا۔

"اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہاری زُلف کا اسیر ہو چکا ہوں یا ہو جاؤں گا تو یہ تمہاری بھول ہے......؟ یا پھر میں تمہارے ساتھ محبت کا کوئی ڈرامہ شروع کروں گا......؟ تمہارے گھر کے چکر لگاؤں گا......؟ اور تمہارے والد کی ڈانٹ ڈپٹ سنوں گا......؟ تو یہ بھی تمہاری بھول ہے۔ جاؤ......! چلتی پھرتی نظر آؤ......!"

"لعنت ہو تم پر......!"

شازیہ گاڑی میں بیٹھی غصے سے چیخی۔

"تمہاری اوقات کیا ہے جو میں تمہارے ساتھ محبت کروں گی......؟ کمینے انسان......! میں جانے سے پہلے تمہیں یہ بتانا چاہتی تھی، میں جینز شرٹ پہنوں گی، میک اَپ کروں گی اور بال بھی کھلے چھوڑوں گی۔ اونہہ......! وعدہ......؟"

یہ کہہ کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی اور جبار دروازے میں کھڑا دانت پیس کر رہ گیا۔ ویسے وہ اگر ایک لمحہ بھی رُکتی تو واپس جانا مشکل ہو جاتا۔

جب وہ گھر پہنچی تو سب لوگ اس کے لئے پریشان تھے۔

"ارے......! کیا ہوا تمہیں......؟"

اسے زخمی دیکھ کر سب لوگوں نے استفسار کیا۔

"گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔"

شازیہ نے مختصر طور پر تفصیل بتائی اور دُلہن سے ملے بغیر اپنے ے میں چلی آئی۔ لباس بدل کر وہ باہر جانے کے بجائے بستر میں چلی ۔ وقت گزرنے لگا، آنکھیں نیند کے بوجھ سے دُکھنے لگیں، مگر نیند آنے جائے جبار کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔

"کتنی تذلیل کی تھی، اس نے میری......! گنوار کہیں کا......!"

وہ بڑبڑائی اور نہ جانے کب سو گئی۔

اس نے جبار سے آتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بال کھلے چھوڑوں گی، جینز شرٹ بھی پہنوں گی۔"

مگر یہ ہو نہ سکا اور نہ جانے کیسے اپنے آپ ہی اس نے خود کو رفتہ بدلنا شروع کر دیا۔ بال کھلے چھوڑنے کے بجائے ہمیشہ چوٹی بنا کر ں۔ مردانہ لباس کے بجائے سادہ شلوار سوٹ پہنتی، میک اَپ کرنا تو بالکل چھوڑ دیا تھا مگر اس کے باوجود بے چینیاں کم ہونے کے بجائے بڑھنے ں۔

تب ایک دن بے اختیار شازیہ کی گاڑی کا رُخ جبار کے گھر کی ف ہو گیا۔ سارا راستہ تصور میں ڈوبی جبار کو والہانہ انداز میں اپنی طرف ھتے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ جبار بے چین سا شازیہ سے پوچھتا رہا۔

"تم اتنے دن آئیں کیوں نہیں......؟"

اور شازیہ اس کی پہلی ملاقات کی زیادتیوں کا گلہ کرتی رہی۔

مگر جب وہ حقیقت میں وہاں پہنچی تو معلوم ہوا، وہ کب کا یہ گھر ڑ کر جا چکا ہے۔ شازیہ بے چین ہوتے دل کو سنبھالتے ہوئے گھر لوٹ ں۔ مگر دل اب اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ اچانک ہی جبار کے لئے دل بہت ساری محبت جاگ اُٹھی تھی۔ وقت گزرتا گیا اور جبار کی یاد پختہ گئی۔

شازیہ نے ایم اے کرنے کے بعد کالج میں لیکچرر شپ اختیار کر لی تھی۔ مگر یہ بات واضح تھی، وہ جبار کو آج تک بھول نہ سکی تھی۔ اس کو نہ جانے کیوں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ جبار اس کو ضرور ملے گا۔ اس کی زندگی اب کالج اور گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور کہیں آنا جانا اس کو اچھا نہیں لگتا تھا۔



"تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو......؟"

ماں کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔ سر اُٹھا کر ان کو دیکھا تو وہ کہہ رہی تھیں۔

"رات ہو رہی ہے۔ میں شاپنگ کر کے لوٹ آئی ہوں اور تم اب بھی یہاں اسی حالت میں بیٹھی ہو۔ موسم دیکھو، پھر سے خراب ہو رہا ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں......؟ کچھ بتاتی کیوں نہیں ہو......؟"

تب شازیہ نے دیکھا، شام گہری ہو رہی تھی۔ بادل پھر سے جمع ہو رہے تھے۔ وہ ماں کو جواب دیئے بغیر خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹ کر اُٹھ گئی۔ اس کو کمرے میں آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ بادل زور زور سے گرجنے لگے۔

شازیہ نے دریچے سے پردہ ہٹایا اور کھڑی ہو کر باہر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔

"نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے، تم مجھے ضرور ملو گے......؟ میرا انتظار صرف انتظار نہیں رہے گا۔"

اس دن وہ کمرے میں لیٹی خوب صورت غزل سن رہی تھی اور جبار کو یاد کر رہی تھی۔

جس نے میرے دل کو درد دیا
اس شخص کو میں نے بھلایا نہیں

اِک خواب سا جو دیکھا تھا کبھی
وہ یاد رہا اس حال میں بھی
جو آگ جلی جلتی ہی رہی
جو پھول کھلا مرجھایا نہیں

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں......؟"

اچانک کسی کی آواز سن کر شازیہ چونک پڑی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو فوراً کھڑی ہو گئی۔

"ارے راحیلہ......! تم......؟"

شازیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے سامنے اس کے بچپن کی دوست کھڑی تھی۔

"اوہ......! شازیہ ڈیئر......! یہ تم ہو......؟"

راحیلہ حیرت سے اس کو دیکھتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ الگ ہوئی اور ایک حیرت بھری نگاہ شازیہ پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تم نے اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے......؟"

"وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ انسان کو بدلنا پڑتا ہے۔"

شازیہ نے ایک نظر خود پر اور دوسری راحیلہ پر ڈالی۔ وہ آج بھی مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ شازیہ اس کو ساتھ لئے صوفے پر جا بیٹھی تو راحیلہ نے پوچھا۔

"اچھا بتاؤ......! شادی ہو گئی تمہاری......؟"

"شادی میں کیا رکھا ہے......؟"

شازیہ نے عام سے انداز میں کہا۔ اور پھر پوچھا۔

"تمہاری شادی ہو گئی......؟"

"تمہارے بغیر کیسے ہو سکتی تھی......؟"

راحیلہ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ راحیلہ اسکول تک شازیہ کے ساتھ پڑھی تھی مگر میٹرک کا رزلٹ آؤٹ ہوتے ہی راحیلہ کے ڈیڈی کو امریکہ میں ایک اچھی جاب آفر ہوئی اور وہ اسی وقت وہاں سے چلے گئے تھے۔

''تم نے بھی شادی نہیں کی......؟''

شازیہ حیران تھی۔

''اب کر رہی ہوں ناں......! ڈیڈی مجھے اسی مقصد کے لئے پاکستان لے کر آئے ہیں۔ ویسے فی الحال منگنی ہی ہوگی۔''

''لڑکا دیکھا ہے یا ابھی تلاش کرنا ہے......؟''

''یار......! دیکھا ہے، پرسوں منگنی کی رسم ادا ہوگی۔ میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ تمہارے بغیر شادی نہیں کروں گی۔ دیکھ لو......! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

''بہت شکریہ......!''

شازیہ نے مسکرا کر کہا پھر پوچھا۔

''اچھا......! یہ تو بتاؤ......! لڑکا کرتا کیا ہے......؟''

''وہیں امریکہ میں ایک اچھی پوسٹ پر ہے۔''

راحیلہ نے بتایا۔

''یعنی دیکھا ہے تم نے بھی......! کوئی پیار ویار کا چکر ہے......؟''

شازیہ نے شرارت سے اس کو دیکھا۔

''ہے بھی اور نہیں بھی......!''

راحیلہ مسکرائی۔

''مگر ایک بات ہے......! ہے بہت ہینڈسم......!اور سنو شازی......! تم یہ شلوار سوٹ پہن کر منگنی میں مت آنا۔ میں نے تو ان سے کہا تھا، تم بہت ماڈرن ہو، بالکل میری طرح۔ مگر تم تو بالکل بدل گئی ہو۔ مگر اب میری

ت کا سوال ہے۔ کوئی ٹھیک ڈریس پہن کر آنا۔''

راحیلہ اس کو تاکید کرتے ہوئے بولی۔

''اچھا بھئی......! سوچوں گی۔''

شازیہ نے کہا۔ اتنے میں ملازمہ چائے لے کر آ گئی۔ چائے پیتے احیلہ چلی گئی۔

منگنی والے دن راحیلہ نے شازیہ کو فون پر یاد دہانی کرائی۔

''یار......! وقت پر پہنچ جانا۔ ایسا نہ ہو کہ میں انتظار ہی کرتی رہ وں۔''

شازیہ نے اس کو تسلی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔

شازیہ نے شلوار سوٹ کے بجائے ایک اچھی پرنٹڈ ساڑھی پہنی اور بہت عرصے بعد اس کا جی چاہا کہ بال کھلے چھوڑ دے مگر برسوں پہلے کسی کے جملوں کی بازگشت سنائی دینے لگی تو اس نے ڈھیلی چوٹی بنا کر اپنا جائزہ لیا اور کی رِنگ اُٹھا کر باہر نکل آئی۔

جب وہ راحیلہ کے ہاں پہنچی تو تقریباً سب ہی مہمان آ چکے تھے۔ ہال میں راحیلہ اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ راحیلہ کے ممی ڈیڈی چونکہ شازیہ کو جانتے تھے، اس لئے بہت محبت سے ملے۔ تب ہی راحیلہ چہکی۔

''ان سے نہیں ملو گی......؟''

''مگر وہ ہیں کہاں......؟''

شازیہ نے پوچھا۔

''تمہارے پیچھے ہی تو کھڑے ہیں......!''

راحیلہ اُٹھی اور اپنے منگیتر کا بازو تھام کر اس کے سامنے آتے ہوئے بولی۔

''شازیہ ڈیئر......! یہ ہیں، میرے منگیتر مسٹر جبار......!''

شازیہ نے راحیلہ کے پہلو میں کھڑے شخص کو غور سے دیکھا تو چکرا

کر رہ گئی، مگر قبل اس کے وہ مزید کچھ سوچتی، راحیلہ بولی۔

”اور جبار......! یہ میری وہ پیاری دوست ہے جس کا میں آپ سے اکثر ذکر کرتی تھی۔ جبار......! اب یہ بہت بدل گئی ہے۔ کیسے ساڑھی کے ساتھ چوٹی بنا کر رکھی ہے، جبکہ کسی زمانے میں اس کو چوٹی بنانے سے سخت نفرت تھی۔“

راحیلہ نے بات ختم کی تو جبار نے بغور شازیہ کا جائزہ لیا۔

”ہیلو......!“

اس نے یوں شازیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسے شازیہ کو آج پہلی بار دیکھا ہو اور شازیہ نے ایک بار پھر اس سنگ دل چہرے کی طرف دیکھا جو شازیہ کو بدلنے کا کہہ کہ خود دولت کے رنگ میں رنگ گیا تھا اور اب یوں اجنبی بنا سامنے کھڑا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار شازیہ کو دیکھ رہا ہو۔

”فریبی......! دغا باز......!“

شازیہ نے دل میں سوچا۔

”آپ کو شاید مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی......؟“

جبار نے مارے خفت کے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”جبار......! تم غلط مت سوچو......!“

راحیلہ جلدی جلدی اس کی صفائی پیش کرنے لگی۔

”دراصل یہ بہت بدل گئی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ناں......! یہ پہلے ایسی نہیں تھی۔“

شازیہ کے جی میں آیا کہہ دے۔

”تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں جبار......! میں وہی ہوں جو صرف تمہاری وجہ سے بدل گئی اور تمہارے ملنے کے انتظار میں، میں نے ہر پل کاٹا، مگر تم ملے بھی تو کسی دوسرے کے بن کر۔ اب بتاؤ......! میں تمہیں دیکھ کر کیسے خوشی کا اظہار کروں......؟ جبکہ میرا دل تو رونے کو چاہ رہا ہے۔“

مگر اس کو کچھ نہ کچھ تو بولنا ہی تھا، سو بظاہر مسکرا کر بولی۔

”آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے مسٹر جبار......! مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔“

”اچھا......!“

کہتے ہوئے جبار خفیف سا مسکرایا پھر پوچھا۔

”کیا کرتی ہیں آپ......؟“

”ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہوں۔“

شازیہ نے آہستہ سے جواب دیا تو جبار مزید کچھ کہے بغیر دوسری طرف چلا گیا۔

”کیسا لگا تمہیں......؟“

راحیلہ نے پوچھا۔

”بہت اچھا......! بالکل خوابوں کے شہزادے کی طرح......!“

شازیہ گویا زبردستی مسکرائی۔

”شکریہ......!“

شکریہ کہتے ہوئے راحیلہ بھی جبار کے پیچھے چلی گئی۔

پھر انگوٹھی پہنانے کا ہنگامہ شروع ہوا۔ راحیلہ کو انگوٹھی پہناتے ہوئے جبار نے بطور خاص شازیہ کے چہرے کی طرف دیکھا، جیسے اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا ہو۔

شازیہ نے اپنے لرزتے وجود کو سنبھال کر ان دونوں کو مبارک باد دی اور پھر طبیعت ناساز ہونے کا بہانہ کر کے گھر چلی آئی۔ کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ اب اگر وہاں مزید رُکی تو شاید اس صدمے سے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔

گھر آ کر بھی وہ بہت دن پریشان رہی۔ وہ جس کے انتظار میں اس نے شادی نہیں کی تھی، وہ کسی اور کا ہو گیا تھا۔ دو تین دن وہ کالج بھی

نہ گئی۔ گھر والے بھی حیران تھے کہ اس کو ہوا کیا ہے......؟ وہ تو خراب موسم میں بھی چھٹی نہ کرتی تھی۔ اب کیوں گھر میں بند ہے......؟

مگر پوچھا کسی نے کچھ بھی نہیں کہ وہ اپنی بات بتاتی کب تھی کسی کو......؟ اور ایسے میں راحیلہ جبار کے ساتھ اس سے ملنے چلی آئی۔

"ارے......! یہ تمہیں کیا ہوا......؟"

راحیلہ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر بے چین سی ہوگئی۔ جبکہ جبار خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"معمولی سا ٹمپریچر تھا، اب ٹھیک ہوں۔ تم لوگ بیٹھو......!"

شازیہ نے خود کو نارمل ظاہر کیا۔ راحیلہ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھی رہی پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔

"جبار......! تم یہاں بیٹھو......! میں ذرا آنٹی سے مل کر آؤں۔"

راحیلہ اندر چلی گئی تو شازیہ خود بھی وہاں سے اُٹھنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگی۔

"شازیہ......! تم تو واقعی بدل گئی ہو۔"

جبار کی سرگوشی اُبھری۔

"تو گویا آپ مجھے پہچانتے ہیں......؟"

شازیہ کے لہجے میں طنز تھا۔

"تمہیں پہچاننے سے انکار کب کیا ہے میں نے......؟"

جبار کا لہجہ تھکا ہوا تھا۔

"انکار نہیں تو اقرار بھی کب کیا تھا......؟"

نہ چاہتے ہوئے بھی شازیہ کے لہجے میں شکوہ شامل ہوگیا۔

"تم یقین کرو شازیہ......! میں نے تمہیں بہت تلاش کیا مگر تم نہ ملیں اور جب ملیں تو صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ میں تم سے کھل کر بات بھی نہ کر سکا۔ بات کرنا تو دُور کی بات، آنکھیں جو برسوں سے ترس رہی

ہیں، تمہاری ایک جھلک دیکھنے کو، تمہیں جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکیں۔

خیر......! اب میں اس سلسلے میں بہت جلد راحیلہ کے ڈیڈی سے بات کر رہا ہوں۔"

"معاف کیجئے گا......! وہ کس لئے......؟"

شازیہ نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے لئے شازیہ......! اب اگر تم مجھے مل گئی ہو تو تمہیں کھونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

جبار کے لہجے میں محبت تھی۔

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے جبار صاحب......! میں نے تو کبھی آپ کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ آپ مجھ سے پوچھے بغیر میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتے۔"

شازیہ نے بے رُخی سے کہا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو شازیہ......! اگر تم نے مجھے چاہا نہیں، مجھے سوچا نہیں تو اتنا بدل کیوں گئیں......؟ مجھے معلوم تھا شازیہ......! تم بدل جاؤ گی۔ کیونکہ تمہارے الفاظ نے اگر مجھے متاثر کیا تھا تو میرے الفاظ نے بھی تمہیں متاثر کیا تھا۔ یہی سب محسوس کرتے ہوئے میں نے خود کو بدلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پہلے کویت گیا اور وہاں چند سال رہنے کے بعد امریکہ چلا گیا۔ یہ حیثیت، یہ مقام میں نے صرف تمہارے ہی لئے حاصل کیا۔ حالانکہ وہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات تھی جس میں کوئی وعدہ نہیں تھا، کوئی محبت کا اقرار نہیں تھا، پھر بھی تم مجھے یاد رہیں! اور جب تم مجھے نہ ملیں تو"

"تو آپ نے راحیلہ کا انتخاب کر لیا اور اب آپ کو شادی بھی راحیلہ سے کرنی ہوگی۔ میں اب آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

شازیہ نے گویا انکار کر دیا۔

"یہ ناممکن ہے کہ میں اب راحیلہ سے شادی کر لوں۔ شادی تو

اب صرف تم ہی سے ہوگی اور بہت جلد ہوگی۔"

اس نے مسکرا کر شازیہ کو دیکھا، جواب میں شازیہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ راحیلہ واپس آ گئی۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے اور شازیہ اس مسئلے کا حل سوچنے لگی۔ جبار کے لہجے سے لگتا تھا، اس نے جو کہا ہے، وہی کرے گا بھی۔ دوسرے دن جبار نے اس کو فون کیا اور شازیہ نے غصے سے کہا۔

"جبار صاحب......! میں اپنی سہیلی کی خوشیاں نہیں لوٹ سکتی۔ آپ کو ہر حال میں راحیلہ سے شادی کرنی ہوگی۔ ویسے بھی ہمارے درمیان محبت تو نہیں تھی جو آپ راحیلہ کی زندگی برباد کرنے کو سوچیں......؟"

"اگر تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی تو اب تک شادی کیوں نہ کی......؟ تم اعتراف کرو یا نہ کرو......! مجھے یقین ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اسی لئے تو بوڑھی ہوگئی ہو، میرے انتظار میں، تیس کی تو ہو رہی ہو۔ اب تمہیں میرے جیسا اچھا بَر کہاں ملے گا......؟"

وہ ہنسنے لگا۔

"مجھے آپ سے محبت ہے یا نفرت......! اس کا جواب دینا مجھے پسند نہیں۔ مگر رہی شادی کی بات تو وہ میں اب بہت جلد آپ کو کر کے دکھاؤں گی۔"

شازیہ کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ اس کی بات جو نہیں مان رہا تھا۔

"اگر میں نے شادی کی مہلت دی تو کرو گی ناں......؟"

جبار نے غصے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اس نے جو کہا، وہی کر کے دکھایا۔ دوسرے دن شازیہ ابھی پہلا پریڈ لے کر واپس اسٹاف روم میں آئی تو وہاں راحیلہ بیٹھی تھی۔

اس کو دیکھتے ہی راحیلہ نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور وہاں سب کے سامنے انکار فضول ہی تھا۔ شازیہ اپنی ایک ساتھی کو

داری دے کر راحیلہ کے ساتھ باہر آئی تو باہر گاڑی میں ڈرائیونگ ٹ پر جبار بیٹھا تھا۔ راحیلہ نے فرنٹ ڈور کھول کر شازیہ کو بیٹھنے کا کہتے ئے خود ہی دھکا دینے والے انداز میں اندر گرایا۔

"یہ کیا کر رہی ہو......؟ راحیلہ......! وہ تمہارا منگیتر ہے۔ تم بیٹھو ں کے ساتھ......!"

شازیہ نے دبی دبی آواز میں احتجاج کیا اور راحیلہ پیچھے بیٹھتے ئے بلند آواز میں بولی۔

"میں چھوٹے دل کی مالک نہیں ہوں......!"

"جا کہاں رہی ہو......؟"

شازیہ نے گویا دانت پیس کر پوچھا۔

"چھانگا مانگا جا رہے ہیں، مگر تم کیوں چلا رہی ہو......؟ میں ہاری امی جان کو بتا کر آئی ہوں۔"

راحیلہ نے بتایا جبکہ جبار خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے کرتے اس کے غصے سے پھولے چہرے کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

چھانگا مانگا پہنچتے ہی سب سے پہلے شازیہ گاڑی سے باہر نکلی اور چند قدم چلنے کے بعد ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے......؟ آگے چلو......! جنگل کی سیر نہیں کرو گی......؟ جھیل نہیں دیکھو گی......؟"

راحیلہ نے اس کو یوں کھڑے دیکھ کر کہا۔

"تم لوگ جاؤ......! میں یہاں پر ہی بیٹھوں گی۔"

شازیہ نے جبار کی طرف دیکھے بغیر کہا اور رُخ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔

"اوکے اوکے......! جیسے تمہاری مرضی......!"

راحیلہ نے کہا اور آگے چلی گئی۔ مگر شازیہ ویسے ہی کھڑی رہی۔ اچانک اپنے شانوں پر جبار کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہی وہ گھبرا کر

مڑی کہ راحیلہ کیا سوچے گی مگر وہ آس پاس کہیں بھی دکھائی نہ دی۔

''گھبراؤ نہیں......! وہ آگے گئی ہے، ویسے تم اتنی بزدل تو نہ تھیں۔ تم تو اس گھر میں اس لڑکے سے بھی نہیں ڈری تھیں جو تمہیں تمہاری مدد کے خیال سے وہاں لے گیا تھا۔ اس لڑکے کی ہر بات کا جواب تم نے بہت سخت لہجے میں دیا تھا۔ تب اس لڑکے کو غصہ آ گیا اور اس نے تمہیں ڈرانے کے لئے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا۔ پھر تم واقعی ڈر گئیں۔''

جبار بات ختم کر کے مسکرانے لگا۔

''وہ سب کچھ آپ نے مجھے ڈرانے کے لئے کیا تھا......؟''

شازیہ سب کچھ بھول کر حیرانی سے پوچھنے لگی۔

''اتنا گرا ہوا سمجھتی ہو مجھے......؟ بے شک میری کوئی بہن نہیں مگر ماں تو تب بھی تھی جو کہتی تھی کہ لڑکی کی عزت بہت قیمتی ہوتی ہے، وہ نہ رہے تو...... خیر چھوڑو یہ سب، یہ بتاؤ! مجھ سے شادی کر رہی ہو یا نہیں؟''

''شادی اب ضرور کروں گی مگر آپ سے نہیں......!''

شازیہ نے پھر انکار کیا۔

''شازیہ......! مجھے آج پھر اس لڑکے کو بلانے کی زحمت نہ دو، جس نے تمہیں ڈرایا تھا۔ میں آج بھی زبردستی کرنے کے موڈ میں ہوں۔''

وہ مسکرایا۔

''اب میری ڈرنے کی عمر نہیں رہی جبار صاحب......! میں نے آپ کو بتا دیا تھا۔ راحیلہ مجھے بہت عزیز ہے اور اس کی خوشیاں بھی۔ قبل اس کے کہ وہ یہاں آئے، آپ اس کے پاس چلے جائیں......!''

''میں آ چکی ہوں شازی......!''

راحیلہ کی آواز پیچھے سے اُبھری۔ شازیہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ شازیہ نے جبار کو دیکھا، وہ پرسکون کھڑا تھا۔ جبکہ راحیلہ کہہ رہی تھی۔

''تم کیسی سہیلی ہو شازی......! میرا دل رکھنے کے لئے اپنی اور اس
ں کی خوشیاں برباد کر رہی ہو جس کا تمہیں انتظار تھا؟ جس کی وجہ سے تم
اب تک شادی نہیں کی؟ جس کی وجہ سے تم نے خود کو بدل ڈالا؟''

''مگر راحیلہ......! تم......''

شازیہ نے کہنا چاہا۔ مگر راحیلہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''جس دن میں پہلی بار تم سے ملنے گئی تھی تو تم نے پوچھا تھا، ان
ے کوئی پیار ویار کا چکر ہے......؟ تب میں نے کہا تھا، ہے بھی اور نہیں
ں......! مطلب یہ کہ جبار ڈیڈی کی پسند تھے مگر چونکہ بہت ہینڈسم تھے،
ں لئے مجھے بھی اچھے لگتے تھے۔ اس لئے جب ڈیڈی نے پوچھا، ان کے
ے میں تو میں نے ہاں کر دی۔''

وہ رُکی اور ایک طویل سانس لے کر پھر کہا۔

''مگر اب بات دوسری ہے۔ جبار صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا
ے اور یہ بھی کہ صرف میری وجہ سے تم انکار کر رہی ہو تو تمہاری جگہ اب یہ
ار میں کرتی ہوں۔ کیا فائدہ ان سے اب شادی کرنے کا......؟ ان کے
ں میں تمہاری محبت ہوگی اور اس طرح میں بھی کبھی خوش نہ رہ سکوں گی۔
یسے بھی ابھی صرف منگنی ہی تو ہوئی ہے، تو یہ انگوٹھی اب میں تمہیں پہنا
تی ہوں۔''

راحیلہ نے اپنی اُنگلی سے انگوٹھی اُتار کر شازیہ کی اُنگلی میں پہنا دی
ر پھر کہا۔

''میری دُعا ہے، تم دونوں ہمیشہ خوش رہو......!''

پھر وہ رُکی نہیں، سیدھی گاڑی کی طرف بڑھ گئی اور جبار نے شازیہ
و دیکھتے ہوئے کہا۔

حسن سے عشق کبھی دُور نہیں رہ سکتا
دل اگر دل ہے تو مجبور نہیں رہ سکتا

"اب تو کرو گی ناں مجھ سے شادی......؟ لگن اگر سچی ہو تو آسمان بھی زمین سے ملنے آ سکتا ہے۔"

تب شازیہ نے کہا۔

"اب انکار کی گنجائش کہاں ہے جبار......؟ مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ میرا انتظار رنگ لے آیا ہے اور یہ کہ آپ کو بھی مجھ سے محبت تھی۔ آپ نے بھی مجھے تلاش کیا۔ حالانکہ کوئی وعدہ نہیں تھا ہمارے درمیان......!"

"شادی کے بعد پوری شدت سے یقین دلاؤں گا۔"

جبار نے شوخی سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا، پھر خود بھی گاڑی کی طرف چل پڑے۔

اور ان کو آتا دیکھ کر راحیلہ آنسو صاف کرنے لگی۔ جبار اس کی اپنی پسند تھا مگر جبار سے بات کرنے کے بجائے اس نے ڈیڈی سے بات کی تھی اور ڈیڈی اس کی شادی کے لئے اس کو پاکستان لائے تھے، منگنی کے بعد جبار پریشان تھا۔ راحیلہ نے وجہ پوچھی تو اس نے صاف صاف بتا دیا۔

"شازیہ کو میرا انتظار تھا۔ اب صرف تمہاری وجہ سے وہ انکار کر رہی ہے۔ جبکہ میں اب تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

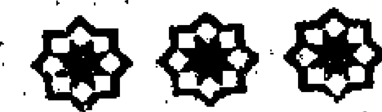
تب راحیلہ نے شازیہ سے خود بات کرنے کا سوچا اور اس کو یہاں لائی تھی۔

"تم اتنی جلدی چلی آئیں......!"

جبار نے شازیہ کے لئے فرنٹ ڈور اوپن کرتے ہوئے کہا۔

"صرف اس لئے کہ دو پیار کرنے والے دل آزادی سے باتیں کر سکیں......!"

راحیلہ نے قہقہہ لگایا مگر اس کے کھوکھلے پن کا اس کو اچھی طرح احساس تھا۔



اور وقت تھم گیا

عاشی سو کر اُٹھی تو پورے گھر میں افراتفری کا سا عالم تھا۔ ماں چیخ کر ہدایات دے رہی تھیں۔

"یہ اُٹھاؤ......! وہ اُٹھاؤ......! وہ یہاں رکھو......! یہ وہاں رکھو......! بند کرو......! وہ کھولو......!"

"نہ جانے ان لوگوں پر کیا افتاد آن پڑی ہے میرے سوتے میں ہنگامہ ہو رہا ہے......؟"

وہ ناگواری سے سوچنے لگی اور جب یہ سب کچھ برداشت سے باہر گیا تو اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"امی جان......! امی جان......! آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟"

ماں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا اور اپنے کام میں مصروف رہی۔

"بھئی......! مجھے بھی تو پتہ چلے، یہ اُٹھاؤ پٹخ کیوں ہو رہی ہے؟"

اس نے دوبارہ پوچھا۔ مگر ماں پھر بھی چپ رہی اور بہن بھائی بھاگ بھاگ کر کام کرتے رہے۔ جب ہر کام ماں کی مرضی کے مطابق

ہو گیا تو وہ عاشی کی طرف مُڑتی ہوئی بولیں۔

"ہاں بھئی......! اب کہو تم نے کیا پوچھا تھا......؟"

عاشی کو ان کی اس بے نیازی پر غصہ تو بہت آیا مگر وہ نرمی سے بولی۔

"امی......! آپ نے یہ سب سامان یہاں سے کیوں ہٹا دیا......؟ کیا یہ گھر چھوڑنے کا ارادہ ہے......؟"

"بالکل نہیں......!"

ماں نے اطمینان کا طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ سب کیا ہے......؟ مجھ سے بار بار گھر ڈیکوریٹ کرنے کی مصیبت نہیں ہوتی۔"

عاشی نے ذرا بگڑ کر کہا۔

"باجی......! بات دراصل یہ ہے کہ امی کی ایک دُور کی خالہ کی بیٹی کا لڑکا آج ہمارے گھر آ رہا ہے۔ یہ سب اس کا استقبال کرنے کے لئے انتظام کیا ہے۔"

عاشی کی چھوٹی بہن نور نے ماں کو دیکھتے ہوئے ہنس کر بات اُدھوری چھوڑ دی۔

"کیا مطلب......؟"

عاشی نے گھور کر بہن کو دیکھا۔

"کیا استقبال اس طرح کیا جاتا ہے......؟ بجائے گھر سجانے کے سب کچھ اُٹھا دیا......؟"

عاشی کی بات سن کر ماں نے نور کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ......! ایک نظر دیکھ لو کوئی قیمتی چیز رہ تو نہیں گئی......؟"

پھر عاشی سے بولیں۔

"بیٹی......! کیا بتاؤں آج وہ تمہارے باپ کے پاس دفتر میں آیا۔ ارے باپ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ کہہ دیتے، بیٹے......! یہاں سے ہی ت ہو جاؤ۔ گھر میں کوئی نہیں، شادی میں گئے ہیں۔ مگر نہیں......! اسے میں دبائے ساتھ لے آئے۔"

"لیکن امی......! وہ ہے کون......؟"

عاشی کو اس لمبی چوڑی تمہید سے چڑ ہو رہی تھی۔

"ارے......! وہ میری خالہ زاد بہن کا لڑکا ہے۔ پکا چور ہے۔ یہ یں دیکھتا کسی رشتہ دار کا گھر ہے، بس جس گھر میں گیا، کوئی نہ کوئی قیمتی چیز چوری کر کے چلتا بنا۔ آج ہمارے گھر بھی آ گیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوئی ان لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ پھر بھی جہاں جی چاہتا ہے، منہ اُٹھا کر چل دیتا ہے۔"

"ہاں......! مجھے یاد آیا، آپ نے ایک بار کسی چور کر ذکر کیا تھا۔ اس وقت وہ ہے کہاں......؟ اور آیا کب تھا......؟"

عاشی نے پرشوق لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے باپ کے ساتھ......! تم تو سو رہی تھیں، ابھی کچھ دیر پہلے گیا ہے۔ کہتا تھا آنٹی......! شام کو پھر آؤں گا۔ انگریز کا بچہ......! نہ جانے کمبخت کیا ارادہ لے کر آیا ہے......؟"

ماں پھر اسے کوسنے لگی اور عاشی خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

میٹرک کے بعد اس نے اسکول چھوڑ دیا تھا، مگر تعلیم نہیں۔ انٹر اس نے پرائیویٹ کیا۔ آج کل بی اے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا تمام وقت گھر میں کام کاج کرتے گزرتا۔ اس کی عادت تھی، دوپہر کا کھانا خود تیار کرتی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ وہ پانچ بجے تک سوتی پھر اُٹھ کر سارے

گھر کی صفائی کرتی اور ہنڈیا تو دوپہر میں ہی پک جاتی، شام کو صرف روٹی پکاتی اور ان مصروفیات سے فارغ ہو کر وہ نہاتی اور فریش ہو کر چھت پر چلی آتی۔

اس کے گھر والے جلدی سو جانے کے عادی تھے مگر وہ کبھی دس گیارہ بجے سے پہلے نہ سوتی۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اس عادت کی وجہ سے اس چور کو نہ دیکھ سکی جس کے چرچے پورے خاندان میں ہوتے تھے۔

"مگر رات کو تو پھر آئے گا۔"

اسے یاد آیا اور وہ مطمئن ہوگئی۔ جب وہ کام سے فارغ ہوئی تو ماں بولی۔

"سنو عاشی......! چھت پر اس کے لئے چارپائی بچھا دو اور یہ لو دری اور کھیس۔"

عاشی نے دری اور کھیس دیکھا اور بولی۔

"امی......! یہ تو بہت خراب ہیں اور ان سے بُو بھی آ رہی ہے۔"

"اس کے لئے یہی بہتر ہے۔ جانتی ہو، سال بھر پہلے وہ تمہاری انارکلی والی خالہ کے گھر آیا تھا۔ انہوں نے اچھا بستر بچھا کر دیا۔ صبح جب تمہاری خالہ اُٹھیں تو وہ قیمتی کمبل لے کر جا چکا تھا۔ کمروں کو ان لوگوں نے تالے ڈال دیئے تھے ورنہ پتہ نہیں کیا کیا لے اُڑتا......؟"

"پھر بھی امی......! یہ بستر تو بہت ہی خراب ہے۔ بیچارہ کیا سوچے گا......؟"

"عاشی......! ضد نہ کرو......! میں جانتی ہوں مجھے کیا کرنا ہے؟"

ماں نے کہا تو وہ بے دلی سے اوپر چلی آئی۔ موٹے بان کی یہ چارپائی ہمیشہ چھت پر ہی رہتی تھی۔ بارش آئے یا اولے پڑیں، یہ ہمیشہ چھت پر ہی رہتی۔ بستر لگا کر وہ نیچے آگئی۔

سونے سے قبل ماں بولی۔

"سنو عاشی......! وہ چور جان بوجھ کر دیر سے آئے گا تاکہ سب گھر والے سو جائیں اور وہ اپنا کام کر کے چلتا بنے۔ کمبخت سے کھانے کا مت کہنا، جیسے ہی آئے، بس کہنا، اوپر جا کر سو جاؤ۔"

ماں تو یہ کہہ کر مطمئن ہو کر سوگئی مگر عاشی جاگتی ہی رہی۔

گیارہ بجنے والے تھے مگر وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ عاشی کا خیال تھا، وہ آئے گا ضرور مگر چوری کی سہولت دیکھ کر۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ عاشی چونک کر جلدی سے اُٹھی مگر جب وہاں گئی تو چوکیدار کھڑا تھا۔ عاشی کو دیکھتے ہی بولا۔

"بی بی جی......! آج دروازہ بند کرنا کیا یاد نہیں رہا......؟ آج کل چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ دروازہ دھیان سے بند کیا کیجئے......!"

عاشی نے دروازہ بند کیا اور بڑبڑائی۔

"چور اس گھر میں آ چکا ہے۔ اب باہر سے کون آئے گا......؟"

اور لیٹ گئی۔ پھر اسے نہیں پتہ کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

صبح ہوئی تو معلوم ہوا وہ رات آیا ہی نہیں۔ عاشی کو بڑا غصہ آیا۔

"اُف امی......! محض اس چور کی وجہ سے آپ نے میرا اتنا کام بڑھا دیا۔ ہم کوئی اندھے تو نہ تھے جو وہ چوری کر کے چلا جاتا......؟"

وہ بڑبڑاتی ہوئی کام کرنے لگی۔

"ارے رہنے دو......! آج کچھ مت کرو۔ کیا پتہ آج آجائے؟ جب تک وہ کچھ لے کر نہ جائے گا، اسے چین نہیں آئے گا۔"

ماں کا کہنا درست نکلا۔ دوپہر ہی کو وہ آگیا۔ عاشی اس کے آنے کا سن کر جلدی سے اپنے کمرے کے دروازے کے سوراخ سے جھانکنے لگی۔ سامنے ماں کا چہرہ تھا اور اس چور کی دروازے کی طرف پیٹھ تھی۔

عاشی کو حیرت ہوئی۔ ماں جو اس کے آنے سے پہلے اس کے

خلاف زہر اُگل رہی تھی، اب ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔ عاشی چاہ رہی تھی، وہ کسی طرح منہ اِدھر کرے مگر وہ اسی طرح بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ ماں کو احساس ہوگیا، باہر کوئی ہے۔ اُٹھ کر باہر آئیں اور عاشی کو دیکھ کر آہستہ سے بولیں۔

''وہ چور پھر آگیا ہے۔ میں نہ کہتی تھی جب تک یہاں سے کچھ لے نہ جائے گا، اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھے گا۔ تم جاؤ میں ذرا اس کے لئے بوتل لے آؤں۔''

وہ گئیں تو نور آگئی۔

''کیا بات ہے باجی......! آپ یہاں کھڑی ہیں......؟''

''ہاں بھئی......! وہ چور آیا ہے، اس کو دیکھنے آئی تھی۔''

وہ اچانک چونک کر بولی۔

''ارے باپ رے......! امی تو باہر گئی ہیں اور چاندی کا ایش ٹرے اندر ہے۔ اس وقت یہ آسانی سے لے سکتا ہے۔ امی کے آنے تک تم یہیں کھڑی رہو۔ اگر وہ ایش ٹرے لے کر جانے لگے تو مجھے آواز دے لینا۔ پھر دیکھنا کیسی مرمت کرتی ہوں۔''

''آپ نے دیکھا ہے اس کو......؟''

''نہیں......! اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ اچھا میں اب کچن میں جاتی ہوں۔''

وہ جانے لگی تو ماں بھی آگئی۔

''آؤ عاشی......! ملوگی نہیں بھائی سے......؟''

''مجھے چوروں سے ملنے کا کوئی شوق نہیں......!''

وہ منہ بناتی ہوئی کچن میں آئی اور پھر حسبِ عادت وہ سب سے پہلے کھانا کھا کر سوگئی۔ پتہ نہیں ابھی کتنی دیر اور سوتی۔ گرمی محسوس ہوئی تو آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو بجلی جا چکی تھی۔ وہ گھبرا کر باہر آگئی۔ مگر پھر وہیں

ک گئی۔

ماں ہاتھ میں چھوٹا سا پنکھا لئے بیٹھی تھی۔ ساتھ میں شاید وہ چور ہی تھا۔ عاشی واپس مُڑنا چاہتی تھی کہ ماں نے دیکھ لیا مگر چور نے اسے سر ٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔

''آؤ عاشی......! عرفان......! یہ میری بڑی بیٹی عاشی ہے۔''

اس نے سرسری نظر عاشی پر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ عاشی کو بہت غصہ آیا۔ اس نے بھی اسے دیکھنا گوارہ نہ کیا اور بات کئے بغیر وہاں سے چلی ئی۔

شام کو وہ چھت پر بستر لگانے آئی تو نور بھی ساتھ تھی۔

''باجی......! آپ نے عرفان بھائی کو دیکھا......؟''

''کیوں......؟ کیا انہیں دیکھنا بہت ضروری ہے......؟''

وہ بگڑ کر بولی۔

''وہ بہت خوب صورت ہیں باجی......! اگر وہ چور نہ ہوتے تو امی کہتی ہیں کہ آپ کی شادی ضرور عرفان بھائی سے کر دیتیں۔''

''کیوں نہیں......؟ میرے لئے دُنیا میں یہی ایک چور ہی تو بچا ہے جیسے دُنیا میں اور کوئی مرد خوب صورت ہی نہیں۔ میں شادی کروں گی اپنی پسند سے کسی شریف آدمی سے جس کے ساتھ شادی کر کے مجھے سکون ملے۔ میری زندگی خوش گوار گزرے۔''

وہ شاید کچھ اور بھی کہتی مگر آہٹ سن کر چپ ہوگئی۔ دوسرے ہی لمحے گڈو کا ہاتھ تھامے وہ اس کے سامنے تھا۔ عاشی نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا، بولی۔

''چلو نور......! نیچے چلیں......!''

وہ دونوں زینے کی طرف بڑھیں۔

''سنئے......!''

اس نے بڑے مہذب لہجے میں پکارا۔

''کیا ہے......؟''

عاشی نے پلٹ کر دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہ یقیناً خوب صورت مردوں میں سے ایک تھا۔ اس نے عاشی پر ایک گہری نظر ڈالی مگر مخاطب نور سے ہوا۔ جیسے کہنا چاہتا ہو۔

''اگر تمہاری نظروں میں میری اہمیت نہیں تو مجھے بھی تمہاری کب پرواہ ہے......؟''

''نور......! میرا گلا خراب ہے۔ نمک ملا کر پانی گرم کر دینا، بلکہ مجھے دے جانا۔''

''ہونہہ......!''

نور نے دل میں کہا اور عاشی کے ساتھ نیچے چلی آئی۔

''بے چارہ حکم تو یوں دے تھا جیسے وہ یہاں کا مالک ہو اور ہم نوکر......؟ اوقات بھول جاتے ہیں لوگ اپنی۔''

نور کہتی رہی مگر عاشی کچھ چپ سی ہوگئی۔

''نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا، ایک نہ معلوم سا پیغام، اِک بے چینی، اِک حسرت۔''

عاشی کچھ بھی تو نہ سمجھ پا رہی تھی اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔ مگر اس کی خوب صورت آنکھیں اور چہرہ جیسے نظروں میں بس گیا تھا۔

رات کو وہ ہمیشہ دیر سے سونے کی عادی تھی مگر آج تو حد ہی ہوگئی تھی۔ نیند نہ جانے کہاں بھٹک رہی تھی......؟

''ہائے اللہ......! یہ مجھے کیا ہو رہا ہے......؟''

دل تھا کہ مسلسل اسے ایک بار پھر دیکھنے کی خواہش کر رہا تھا۔

عاشی نے اپنے آپ کو بہت روکا، بہت ضبط کیا، مگر نہ رُک سکی۔

آخر اس کے قدم زینے کی طرف اُٹھ گئے اور وہ سب سے چوری اوپر چلی آئی۔ آخری دنوں کا چاند تھا۔ اس لئے اوپر بھی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ عاشی چپکے سے چارپائی کے قریب آ کھڑی ہوئی اور غور سے اسے دیکھنے لگی۔

سوتے میں وہ اور بھی خوب صورت و معصوم لگ رہا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ چور بھی ہو سکتا ہے۔

''اتنا خوب صورت اور معصوم چہرہ...... اور کسی چور کا......''

عاشی محویت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے کروٹ لی اور عاشی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ آنے کو تو وہ اوپر آگئی تھی مگر اب پچھتا رہی تھی۔

''اگر وہ جاگ گیا اور مجھے دیکھ لیا تو کیا سمجھے گا......؟''

وہ پریشانی سے سوچنے لگی اور پھر جلدی سے نیچے چلی گئی۔

صبح وہ حسب معمول نماز، تلاوتِ قرآن سے فارغ ہو کر ناشتہ تیار کرنے لگی۔ سب کو ناشتہ کروانے کے بعد وہ ماں سے بولی۔

''امی جان......! عرفان کو بھی اوپر سے بلا لائیں۔ وہ بھی ناشتہ کر لے۔''

''پڑا رہنے دے اس چور کو......! جب اُٹھے گا تو کر لے گا۔''

''کیوں امی؟ اس نے کیا چرا لیا جو آپ ناراض ہو رہی ہیں؟''

''اس نے کیا کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی......؟ کل جو بجلی گئی تھی، یہ سب اسی کی شرارت تھی۔ اس نے سوچا ہوگا، سب اِدھر اُدھر ہو جائیں اور وہ کوئی چیز لے اُڑے۔ چور کہیں کا......!''

امی نے بے زاری سے کہا۔

''چھوڑ اماں......! ان باتوں کو، ناشتہ تو بہرحال اسے دینا ہے۔''

اور ماں اُٹھ گئی۔

بچے اسکول جا چکے تھے مگر وہ ابھی تک پڑا سو رہا تھا۔ عاشی نے

سارے گھر کا کام کیا۔ آخر میں وہ منہ دھو رہی تھی کہ وہ غسل خانے کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ عاشی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور تولیہ دے کر باورچی خانے میں آ گئی۔ گرم گرم پراٹھے بنا کر اس نے سالن گرم کیا اور جیسے ہی وہ منہ دھو کر باہر آیا، عاشی نے ناشتہ میز پر سجا دیا۔

''سنو......! ناشتہ کر لو، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

کنگھا کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر گہری نظروں سے عاشی کا جائزہ لیا اور عاشی گھبرا کر باہر آ گئی۔

ناشتہ کر کے وہ باہر جانے کے لئے اُٹھا تو عاشی نے پوچھا۔

''آپ جا رہے ہیں......؟''

''جی......! آپ کہیں تو رُک جاتا ہوں۔''

وہ ایک ادا سے بولا۔

''جی نہیں......! جی ہاں......!''

عاشی بوکھلا سی گئی۔

''میرا مطلب ہے آپ دوپہر کا کھانا کھا کر ہی جائیں......!''

''شکریہ......!''

اس نے شانِ بے نیازی سے کہا اور اپنا چشمہ اُٹھا کر باہر نکل گیا اور عاشی دروازے کو تکتی رہ گئی۔ وہ اپنی سوچ پر پریشان ہو اُٹھی۔ کہاں وہ بے زاری اور کہاں یہ التفات......؟ بھلا وہ اس چور کو دل میں کیوں بسا رہی تھی......؟

''امی جان......! ایک بات تو بتائیں......!''

چاول چنتے ہوئے اس نے کچھ سوچتے ہوئے بات شروع کی۔

''یہ آپ کا بھانجا عرفان جو ہے، چور کیسے بنا......؟ اور پڑھا لکھا کتنا ہے......؟''

''بیٹی......! پڑھنا لکھنا کیسا......؟ بالکل اَن پڑھ ہے۔ بچپن میں

چوریاں کرنے لگا، پڑھتا کس وقت......؟''

''پر ماں......! اس نے چوریاں شروع کیوں کیں......؟''

عاشی کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔

''صرف دس سال کا تھا کہ گھر سے ماں کے سو روپے اور سونے کی ٹھی لے کر کراچی بھاگ گیا۔''

''مگر امی......! کوئی نہ کوئی وجہ بھی تو ہوگی بھاگنے کی......؟''

''وجہ کیسی......؟ بچپن میں سب مائیں بچوں کو مارتی ہیں۔ اس کا مطلب تھوڑی ہے کہ بچے گھر سے بھاگ جائیں......؟ اسکول کا کام نہ کرنے کی وجہ سے ماں نے مارا تو یہ صاحب گھر سے بھاگ گئے۔ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ بے چاری سب کے سامنے روتی رہی کہ کوئی میرے بچے کو واپس لے آئے۔

پھر اخبار میں بھی اشتہار دیا اور انعام کے لالچ میں کراچی سے ایک آدمی اسے گھر چھوڑ گیا۔ مگر یہ ایسا ڈھیٹ نکلا کہ آگے پڑھنے سے انکار کر دیا اور ماں کی ساری عمر کی کمائی تو یہی تھی، اسکول سے اُٹھا کر خراد مشین کے کام پر ڈال دیا۔ مگر بری عادتیں کب پیچھا چھوڑتی ہیں......؟ کبھی کام سیکھتا اور کبھی گھر سے پیسے اُٹھا کر بھاگ جاتا۔ اسی طرح جوان ہوگیا۔

ایک بار تمہاری خالہ کے گھر آیا اور کمبل اُٹھا کر چلتا بنا۔ اور یہ بھی سنا ہے باہر چوروں کے گروہ کے ساتھ مل کر چوریاں کرتا ہے۔ ماں بدنصیب اس کی وجہ سے کسی کے گھر نہیں جاتی اور اگر بھول کر کبھی چلی بھی جائے تو لوگ بیٹے کی کرتوتوں کا پوچھتے ہیں۔''

''اور کوئی بہن بھائی نہیں اس کا......؟ اور کیا باپ بھی نہیں جو اسے روکتا......؟''

عاشی نے ماں کی تفصیل سن کر پوچھا۔

''بہن بھائی تو کوئی نہیں، باپ ہے مگر وہ اس کی ماں کو چھوڑ کر پتہ

نہیں کہاں جا چکا ہے......؟ یہ بھی اپنے باپ پر ہی تو گیا ہے۔ وہ بھی اسی جیسا آوارہ ہے۔"

عاشی کو اس کی کہانی سن کر دُکھ ہوا۔ وہ اس عورت کے بارے میں سوچنے لگی جسے نہ شوہر نے سکھ دیا اور نہ بیٹے نے۔

دن گزرتے گئے۔

وہ ایسا گیا تھا کہ پلٹ کر خبر نہ لی تھی۔ عاشی کا جی چاہتا اگر وہ نہیں آیا تو میں ہی اس کے گھر چلی جاؤں۔ مگر مجبوری تھی۔ اس کے گھر کا پتہ نہیں جانتی تھی۔ وہ سراپا انتظار بنی اس کی یاد میں گم تھی اور ایک دن اچانک وہ آ گیا۔

"آپ......؟"

عاشی سبزی بنا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر خوش ہوگئی۔ یقیناً آج کل اس کی خوشیوں کا مرکز وہی ایک ہستی تھی۔ اس کے خیالوں میں گم وہ خوش رہتی تھی مگر اس وقت وہ سامنے تھا۔

"آنٹی کہاں ہیں......؟"

اس نے عاشی کے دمکتے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"امی جان تو ماموں کے ہاں گئی ہیں، آپ بیٹھئے ناں......!"

"گویا اس وقت گھر میں تم اکیلی ہو......؟"

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا......؟ عاشی نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھنے لگی۔

"آپ کیا پئیں گے......؟"

"جو تم پسند کرو......!"

اس نے فراخ دلی سے کہا۔ عاشی جلدی سے اُٹھی۔ ماں گھر پر نہیں تھی، بچے اسکول گئے تھے۔ وہ جی بھر کر اس کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔ وہ

ون پہلے صرف ایک چور تھا، اب اس کے دل و جان کا مالک بن گیا
ں نے گھر میں موجود تمام چیزیں اس کے آگے ڈھیر کیں اور شکوہ
نے لگی کہ وہ اتنے دن سے آیا کیوں نہیں......؟

"تم نے انتظار کیا تھا......؟"

عرفان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ عاشی جلدی اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

"یہ اس نے کیا کہہ دیا......؟ وہ کیا سوچ رہا ہوگا میرے بارے......؟"

مگر وہ سوچ کہاں رہا تھا......؟ وہ بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

"عاشی......! پتہ نہیں تم میری باتوں کا کیا مطلب نکالو......؟ مگر یہ
ینت ہے، میں آج صرف تمہاری وجہ سے آیا ہوں۔ نہ جانے کیوں تمہیں
بار دیکھنے کو جی چاہتا تھا......؟ میں جانتا ہوں یہاں میرا آنا کسی کو پسند
ں، مگر تمہاری خاطر چلا آیا اور اب جا رہا ہوں۔"

"نہیں عرفان......! تم ابھی نہیں جاؤ گے۔ تم اگر میری خاطر یہاں
سکتے ہو تو کیا میری خاطر خود کو بدل نہیں سکتے......؟ میں جانتی ہوں کہ تم
تنے برے نہیں ہو، جتنا خود کو ظاہر کرتے ہو۔"

عاشی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو میں خو کو بدلنے کی پوری کوشش کروں گا۔"

پھر وہ رُکا نہیں، فوراً چلا گیا۔

عاشی خوشی سے بے قابو ہو رہی تھی۔ وہ جو خاندان میں کسی کا کہنا نہیں مانتا تھا، اس کی بات مان گیا تھا۔ پھر تو وہ اکثر آنے لگا۔ کسی کو خیال بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی خود کو تبدیل کر لے گا۔ گھر والے بھی اس کو اچھا جاننے لگے۔

عاشی کے والد نے اچھی تنخواہ پر اسے ایک جگہ پر ملازم کروا دیا ا
وہ بھی باقاعدگی سے ڈیوٹی پر جانے لگا۔ اس کی ماں ان لوگوں کا شکریہ ا
کرنے آئی۔ اب تو خاندان میں بھی اس کی عزت ہونے لگی تھی اور عاشی
وہ تو خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ یوں بھی وہ عاشی کو اتنا چاہتا تھا کہ عاشی ک
خود اپنی قسمت پر رشک آتا۔

بات گھر میں ہوتی یا گھر کے باہر، عرفان بڑی بے باکی سے کہتا۔

''میں آج جو کچھ بھی ہوں، صرف عاشی کی بدولت ہوں۔''

عاشی جب سنتی تو فخر سے اس کا سر اُونچا ہو جاتا۔

ایک سال کا عرصہ گزر گیا اور پھر عرفان کی ماں اپنی جھولی پھیلائے عاشی کی ماں کے پاس آ گئی۔ عاشی کی ماں نے فوراً کوئی جواب نہ دیا۔ کہا تو صرف اتنا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے۔

عاشی کے باپ سے بات ہوئی تو انہوں نے فوراً انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ عاشی ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے جبکہ عرفان اَن پڑھ۔ مگر جب عاشی کو ان کے انکار کی خبر ہوئی تو اس نے فوراً کہہ دیا۔

''امی جان......! آپ میری فکر نہ کریں، میری خاطر وہ اتنا بدل گیا ہے، جب میں اس کی زندگی میں شامل ہو جاؤں گی تو وہ کبھی نہ بگڑ سکے گا۔''

''عاشی......! بری عادت کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ایسا نہ ہو شادی کے بعد وہ پھر جوا کھیلنے لگے......؟ چوریاں شروع کر دے......؟ ایسے آدمی کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا۔''

ماں نے فکرمندی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی جان......! آپ کو یقین کیوں نہیں آتا......؟ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اب وہ کبھی برا کام نہیں کرے گا۔ یوں بھی شادی کے بعد میں اس کی باقی اصلاح بھی کر دوں گی اور پھر میں کوئی بچی تو نہیں جو آپ بار

سمجھا رہی ہیں......؟''

''عاشی......! یہ تمہاری پوری زندگی کا مسئلہ ہے۔''

ماں نے آخری بار اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میری زندگی خراب نہیں ہوگی۔''

''جیسے تمہاری مرضی......! لیکن میں ایک بار پھر کہتی ہوں، اب بھی ہے، سوچ لو......!''

''امی......! خدا کے لئے......!''

عاشی انہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر منگنی ہوگئی اور عاشی کا پردہ کروا دیا گیا۔ اس کے باوجود وہ کبھی
ی آتا مگر عاشی سامنے نہ آتی۔

خاندان میں کسی کی شادی تھی۔ عاشی محض اس وجہ سے نہ گئی تھی کہ
ا کا سامنا ہوگا۔ وہ ایک روز دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی کہ کال
ں بجی۔ دروازہ کھولا تو عرفان موجود تھا۔ عاشی نے جلدی سے دروازہ بند
نا چاہا مگر وہ پھرتی سے اندر آ گیا اور خود ہی دروازہ بند کر دیا۔ عاشی سے
ہ اور نہ ہوا تو چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''بھئی......! مجھے یہ رسم زہر لگتی ہے پردے والی۔ اگر تمہیں پہلے نہ
یکھا ہوتا تو یہ سب ٹھیک تھا، مگر اب میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔''

عرفان نے آہستہ سے اس کے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا دیئے۔

اشی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح اسے گہری نظروں
سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ وقت گزر گیا مگر اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہ آیا۔

''بس بھی کیجئے......!''

عاشی نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ چونک پڑا۔ پھر طویل
انس لیتے ہوئے بولا۔

''تم نہیں جانتی، میں نے اتنے دن کیسے گزارے ہیں......؟''

وہ نہ جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا......؟ عاشی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہی تھی۔

''وہ مجھے کتنا چاہتا ہے، میرے لئے اس نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ یقیناً وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ یہ میرے لئے فخر کی بات ہوگی۔''

''تم کیا سوچ رہی ہو......؟''

وہ اس کے ساتھ برآمدے میں ہی بیٹھ گیا۔

''میں کچھ نہیں سوچ رہی۔''

عاشی اُٹھتی ہوئی بولی۔

''کھانا پکا رہی تھی کہ آپ آگئے۔ بھوک تو آپ کو بھی لگ رہی ہوگی؟''

جواب کا انتظار کئے بغیر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

کھانا ان دونوں نے ساتھ کھایا۔ کھانا کھاتے ہی عاشی برتن اُٹھاتی ہوئی بولی۔

''اب رُختِ سفر باندھیئے......! امی جان آنے والی ہوں گی۔''

''ایک وعدے پر جاؤں گا۔ آئندہ تم مجھ سے پردہ نہیں کرو گی۔ تم یقین نہیں کرو گی عاشی......! میں تمہیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''اچھا......! اب آئندہ کی بات آئندہ سوچی جائے گی۔ اس وقت آپ جائیں......!''

''اوکے جناب......! جو حکم......!''

وہ مسکراتے ہوئے چلا گیا۔ منگنی کو چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ شادی کی تیاری شروع ہوگئی۔ مہندی کی رات وہ چوروں والے انداز میں عاشی کے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر عاشی کو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ باہر سب مہمان موجود تھے۔

''اگر اسے کوئی دیکھ لیتا......؟''

وہ شاید عاشی کی کیفیت سمجھ گیا تھا۔ پھر بولا۔

''عاشی......! نہ جانے کیوں دل بے چین ہو رہا تھا......؟ میں نے بہت روکنا چاہا مگر قدم نہیں رُکے۔''

''پلیز عرفان......! اپنا نہیں تو کم از کم میری عزت کا تو خیال کیا ......؟ صرف آج کا دن تھا۔ کل تو میں تمہارے گھر آجاتی۔ اب اگر کسی ہارے آنے کا پتا چل گیا تو خواہ مخواہ باتیں بنیں گی۔''

''مجھے اس کی پرواہ نہیں......! مگر تم تو مجھے ایسا نہ کہو......! تم رے پیار کو نہیں سمجھتیں......؟ لگتا ہے اگر تمہیں میرا کچھ دن انتظار کرنا ے تو دُنیا کے ڈر سے تم وہ بھی نہیں کرو گی۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''عرفان......! آپ میرے انتظار کی بات مت کیجئے۔ میں عورت ں، اپنی محبت لفظوں میں ڈھال کر آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتی۔ مگر نیا داری میں دُنیا کا خیال تو کرنا ہی پڑتا ہے۔''

عرفان نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

''عاشی......! ایک بات تو بتاؤ......! کیا تم سچ مچ مجھ سے محبت کرتی ہو......؟ یا یوں ہی میری اصلاح کے لئے یہ قربانی دے رہی ہو......؟''

''میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں، یہ کیسے بتاؤں......؟''

''مجھے یقین آگیا ہے عاشی......!''

عرفان جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چلا گیا اور عاشی کتنی ہی دیر مسکراتی رہی۔ ساری رات سہیلیوں کے درمیان جاگتے ہوئے گزری۔ صبح ہوئی تو وہ کچھ دیر کے لئے سوگئی۔ مگر جب اُٹھی تو دُنیا اُلٹ پلٹ تھی۔ سب گھر والے پریشان بیٹھے تھے اور ان میں نمایاں عرفان کی امی تھیں۔

''کیا بات ہے نور......؟ عرفان کی امی کیا لینے آئی ہیں......؟''

عاشی نے سوچا شاید وہ کوئی جہیز کا مسئلہ لے کر آئی ہیں۔

"باجی......! عرفان بھائی کل رات سے کہیں غائب ہیں۔"
نور نے بتایا۔
"کیا......؟"
عاشی کو حیرت ہوئی۔
"رات کو تو وہ میرے......"
بات منہ میں رہ گئی اور وہ چپ ہوگئی۔
"بھلا یہ بات بھی سب کو بتانے کی تھی......؟"
مگر عاشی پریشان نہیں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔
"ہوسکتا ہے کسی کام کی وجہ سے کہیں گئے ہوں......؟"
مگر عاشی کا خیال غلط نکلا۔ نہ عرفان آیا اور نہ برأت چڑھی عرفان کو نہ جانے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا......؟ شادی والا دن گزر گیا اور عاشی کی حالت خراب ہوگئی۔
اس دُنیا کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ عرفان ضرور کسی حادثے کا شکار ہوگیا ہے ورنہ وہ جا کہاں سکتا تھا......؟
"وہ تو مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔"
رو رو کر اس کی آنکھیں سوجھ گئیں۔ دل کو کسی پل قرار نہ آتا تھا۔ ماں باپ، بہن بھائی الگ پریشان تھے۔ اس کی تلاش شروع ہوئی مگر اس کو نہ ملنا تھا، اور نہ ملا۔ رفتہ رفتہ سب لوگ نارمل ہوگئے، اگر نہ ہوئی تھی عاشی۔ لوگ پھر اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرنے لگے تھے۔
"ارے......! وہ تو پیدائشی آوارہ تھا۔"
"بھلا بری عادت بھی کبھی چھوٹتی ہے......؟"
"بہن......! تم نے جان بوجھ کر بیٹی کی زندگی تباہ کی۔"
اور جب ماں جواب میں کچھ کہتی تو عاشی چیخ پڑتی۔
"نہیں امی......! وہ اب ایسا نہیں تھا۔ آپ لوگوں کو اپنی باتوں کی

ہے۔ اس کی جان کی نہیں......؟ نہ جانے اس کے ساتھ کون سا حادثہ ہے......؟"
وہ زور زور سے رونے لگتی۔
یوں ہی دو سال خاموشی سے گزر گئے۔ اس کے بارے میں کوئی ی۔ گھر والے پھر اس کے لئے رشتہ دیکھ رہے تھے اور انہی دنوں اس آ گیا۔ اتفاق سے اس وقت عاشی گھر میں اکیلی تھی۔ خط چاک کیا اور لگی۔
"جان سے بھی عزیز عاشی......!
سلامِ محبت......!
میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت ناراض ہوگی۔
مگر جان......! میری مجبوری تم نہیں سمجھ سکو گی۔ تمہیں اپنی مجبوری بتاؤں تو کیسے......؟
بس......! یہ سمجھ لو کہ میں تمہیں چھوڑ کر بھاگ جاتا، ایسا کبھی نیں ہوسکتا تھا۔ مگر جان......! میں بہت مجبور تھا۔ اپنی مجبوری جب تم سے ملوں گا تو بتاؤں گا۔
خط میں کیا لکھوں......؟
اس وقت لندن میں ہوں۔ ایک کمپنی میں نوکری کر لی ہے۔ پانچ سال کا کنٹریکٹ ہے۔ دو سال گزر گئے، باقی تین سال ختم ہوتے ہی میں تمہارے پاس لوٹ آؤں گا۔ بہت ساری دولت لے کر۔ خط کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ صرف میرا انتظار کرنا۔ کرو گی ناں......؟"

فقط تمہارا......!
عرفان......!"

"ہاں ہاں......! میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

یہ خط عاشی کے لئے زندگی تھا۔ اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کردیا اور اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب عرفان کو لوٹ کر آنا تھا۔ مگر اس کے آنے سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے خط آگیا کہ کسی مجبوری کی وجہ سے ابھی نہیں آسکتا، انتظار کرنا......!



یہ انتظار ایسا طویل ہوا کہ بیس برس گزر گئے۔ چھوٹے بہن بھائی کی شادی ہوگئی مگر عاشی انتظار کرتی رہی۔ عاشی نے زندگی کی تمام مسرتوں سے منہ موڑ لیا تھا۔ تقریب گھر کے اندر ہوتی یا باہر، اس نے کبھی شرکت نہ کی تھی۔ وہ تھی اور اس کا کمرہ تھا، اور اس کی تنہائیاں۔

بھابیاں بھی اسے کم ہی منہ لگاتی تھیں۔ مگر عاشی کو کوئی پرواہ نہ تھی۔ وقت جیسے اس کے لئے تھم گیا تھا۔ اپنی اس زندگی کی وہ عادی ہوچکی تھی۔

آج بیس سال کے بعد اس نے پہلی بار گھر سے قدم نکالا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب نور کی طبیعت اچانک خراب ہوئی۔ وہ بہن کو دیکھنے کراچی آئی تو پتہ چلا کہ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ یوں ہی بہانے سے عاشی کو بلایا تھا۔ کراچی آئی تو بہن، بہنوئی اور بھانجوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے جانے لگی تھی۔

ایک دن وہ ساحل پر کھڑی بچوں کے ساتھ تصویر بنوا رہی تھی تو ایک مانوس سا قہقہہ سنائی دیا۔ عاشی بڑی مشکل سے سنبھلی۔ پلٹ کر دیکھا تو وہی کھڑا تھا۔ وہی شخص جو اس کی زندگی کے بیس قیمتی سال اپنے ساتھ لے گیا تھا، اور جو اس کے باوجود اسے اب بھی اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔

عاشی نے تیزی سے اس کی جانب قدم بڑھائے مگر اسی دم وہ پاس ڑی ہوئی عورت سے مخاطب ہوا۔

"کیا خیال ہے ڈیئر......! اب گھر نہ چلا جائے......؟"

"ہاں......! ویسے بھی آج میں بہت تھک گئی ہوں۔"

عورت نے عرفان کا ہاتھ تھاما اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سڑک پر کھڑی لمبی سی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ عاشی آواز دے کر اسے روک بھی نہ سکی۔ گم سم سی کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔

پھر وہ بچوں کے ساتھ گھر آگئی مگر ذہن اسی میں اُلجھا ہوا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ عرفان ہی تھا۔

"مگر اس کے ساتھ وہ عورت کون تھی......؟"

وہ سمجھ نہ سکی۔ بیوی ماننے پر اس کا دل تیار نہ تھا۔ ظاہر ہے، عرفان جتنا پیار اس سے کرتا تھا، پھر شادی باہر کیسے کرسکتا تھا......؟

عاشی کا جی چاہا، اس کی تلاش میں پورا کراچی چھان مارے۔ مگر وہ مجبور تھی۔ نہ اس کا کسی سے ذکر کرسکتی تھی، اور نہ خود تلاش کرسکتی تھی۔ کبھی اپنا واہم سمجھتی، کبھی آنکھوں دیکھے پر یقین کرتی۔

کچھ دن بعد وہ طارق روڈ پر کچھ چیزیں خرید رہی تھی کہ وہ دوبارہ نظر آیا اور تھا بھی اکیلا۔ عاشی سب کچھ بھول کر اس کی طرف لپکی۔

"عرفان......!"

وہ زور سے چلائی۔ وہ چونک کر پلٹا اور پھر حیرت سے عاشی کو دیکھنے لگا۔ عاشی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ عاشی کا ارادہ سمجھ کر وہ جلدی سے دُکان سے باہر نکلا اور سڑک کے کنارے پارک کی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"عرفان......! عرفان......! رُکو......! یہ میں ہوں، تمہاری عاشی!"

لوگ حیرت سے اسے دیکھنے لگے وہ جو چالیس برس کی عورت میں

ڈھل چکی تھی۔ یوں بے تابی سے اسے پکار رہی تھی۔ عرفان کے پیچھے ہی وہ باہر آئی اور عرفان نے اسے دیکھ کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ عاشی بیٹھتے ہی بولی۔

''عرفان......! تم اتنے سال کہاں رہے......؟''

مگر وہ چپ تھا اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

عاشی جنون میں بولتی رہی۔

''دیکھو عرفان......! میں تمہیں نہیں بھولی۔ یقین کرو میں نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ تم ایک دن ضرور لوٹ کر آؤ گے اور آخر تم آج مجھے مل ہی گئے۔''

عاشی رونے لگی۔

عرفان نے گاڑی روک دی اور باہر نکل گیا۔

پارک کا یہ ایک پُرسکون گوشہ تھا۔ عاشی گاڑی میں کچھ دیر بیٹھی رہی۔ اس کا روّیہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

عرفان نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ بیس برس کی تھی جب وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر رُخصت ہوا تھا۔ تب وہ ایک حسین وشوخ دوشیزہ تھی اور اس وقت چالیس برس کی ایک عورت تھی۔ وہ ہجر کے صدمے اپنے چہرے پر سجائے اس کے سامنے سوالیہ نشان بنی کھڑی تھی۔ عرفان نے پہلی بار اپنے دل میں کچھ ٹوٹ پھوٹ سی محسوس کی اور وہ خود تو اب بھی ویسا ہی تھا۔ شاید اس لئے کہ اس نے ایک پُرسکون زندگی گزاری تھی۔

''عاشی......! ٹھنڈے دل سے میری ایک بات سنو گی......؟''

بہت سوچ کر اس نے کہنا شروع کیا۔

''جب میں پہلی بار تمہارے گھر گیا تھا تو تم مجھے نہیں ملی تھیں۔ جب دوسری بار گیا تو تمہیں ڈرائنگ روم کے دریچے سے دیکھا تو تم میرے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔ مجھے تمہاری باتیں سن کر دُکھ

تھا۔ آخر سب لوگ مجھے میرے بچپن کے حوالے سے کیوں پہچانتے ......؟ پھر جب میں تمہارے بھائی کے ساتھ چھت پر آ رہا تھا تو تم نور ے کہہ رہی تھیں۔

''اس آوارہ سے شادی کر کے مجھے اپنی زندگی برباد نہیں کرنی!''

تمہاری باتیں سن کر میرا دل جل اُٹھا تھا۔ یقین کرو میں ایک بار مر سے بھاگا ضرور تھا مگر اس کے بعد نہ میں نے کبھی چوری کی تھی اور نہ گا تھا۔ نہ میں نے کسی کے گھر سے کمبل چوری کیا تھا۔ نیک بننے کے بعد ی میں نیک نہ کہلا سکا۔ تمہاری دُنیا کسی کو نیک بنانے کے لئے برسوں کی ت مانگتی ہے۔ مگر مجرم وہ پل کے پل میں بنا دیتی ہے۔

مجھے لوگوں کی باتیں سن کر کبھی اتنا دُکھ نہیں ہوا تھا جتنا تمہاری تیں سن کر ہوا تھا۔ شاید اس لئے کہ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا۔ مگر تمہاری رائے سن کر مجھے دُکھ ہوا تھا۔ میں نے یڑھیوں میں ہی کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ میں تمہاری پوری زندگی تباہ کر وں گا۔ خواہ اس کے لئے مجھے تمہارے ساتھ محبت کا ڈرامہ ہی کیوں نہ کرنا ڑے......؟''

وہ کچھ دیر کے لئے رُکا۔ پھر بولا۔

''تم شاید تھک گئی ہو......؟''

باتیں کرتے کرتے عرفان نے اسے دیکھا۔

''آؤ کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔''

عرفان اسے لئے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

''تو گویا اتنے برس تم جان بوجھ کر نہیں آئے......؟''

عاشی نے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''پہلے میری پوری بات سن لو......!''

عرفان دوبارہ بولا۔

"جب میں اوپر آیا تو تم نے ایک نظر بھی مجھے دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے جب یہ کہا۔

"سنئے......!"

تو تمہیں ہی مخاطب کیا تھا۔ میں چاہتا تھا تم ایک نظر مجھے دیکھ لو، شاید تمہارے خیالات بدل جائیں۔ کیونکہ مجھے اپنی وجاہت پر فخر تھا۔ جب تم نے پلٹ کر دیکھا تو میں نے گہری نظر تم پر ڈالی۔

اسی رات کو جب تم میرے پاس آئی تھیں تو میں جاگ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میری وجاہت اپنا اثر دکھا چکی ہے۔ مگر تمہاری باتوں نے جو آگ میرے اندر لگائی تھی، وہ بجھی نہ تھی۔

پھر تمہارا دل جیتنے کے لئے میں نیک بن گیا۔ شادی سے پہلے تم سے ملنے اس لئے آیا تھا کہ تم مجھے بے وفا نہ سمجھو، کہیں اور شادی نہ کرلو۔ اور میں اس میں کامیاب رہا۔ تمہارے بارے میں پہلے مجھے پل پل کی خبر رہتی تھی مگر جب میری بیوی کو تمہارے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے تمہاری نفرت کو میرے دل سے کم کر دیا۔ تمہیں یہ بتا دوں کہ باہر جاتے ہی میں نے شادی کر لی تھی۔

مختصر یہ کہ میرے ساتھ شادی کر کے تم اپنی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی تھی، مگر تم سے دُور رہ کر بھی میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی۔"

عرفان باتیں کرتے کرتے چپ ہو کر خلاء میں گھورنے لگا۔

کتنے ہی لمحے گزر گئے عاشی کو خود کو سنبھالتے ہوئے۔ جب سنبھل چکی تو بولی۔

"گویا تمہیں کبھی مجھ سے پیار نہیں تھا......؟"

"کتنی بار کہوں......! مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سب تمہاری نفرت کا بدلہ تھا۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ اپنے بچوں سے محبت ہے۔ مگر تم سے نہیں......! البتہ تمہاری حالت دیکھ کر تم سے ہمدردی محسوس کر رہا

ا۔ کیونکہ میری زندگی تو خوش گوار رہی اور تم......"

"مت کرو مجھ سے ہمدردی......!"

عاشی غصے سے چیخی۔

"آہستہ بولو عاشی......! تم بیس برس کی دوشیزہ نہیں، چالیس برس ی ایک عورت ہو۔"

"مجھے عورت مت کہو......! میں آج بھی بیس برس کی دوشیزہ ں۔ جب تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے تو میں نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ ت میرے لئے تھم گیا تھا تاکہ میں تمہارا انتظار کرسکوں۔ میں نہیں جانتی زرتے ہوئے سالوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے......؟ میں تو ہارے انتظار میں گم تھی۔

میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ تم آج بھی میری محبت ہو۔ تم میری زندگی خراب کرنا چاہتے تھے......؟ کر چکے......! اور میں چونکہ تم سے شادی کرنا چاہتی تھی......؟ سو تمہیں مجھ سے شادی کرنا پڑے گی۔ کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے، بلکہ کرتی ہوں اور اس محبت کا جرمانہ تمہیں ادا کرنا پڑے گا۔"

"تم پاگل ہوگئی ہو......؟ کیا اوٹ پٹانگ بکواس کر رہی ہو......؟ اس عمر میں تم......"

"مت بات کرو تم میری عمر کی۔ میں کہہ چکی ہوں، تمہارے جاتے ہی میرے لئے وقت تھم گیا تھا۔ آج تم ملے ہو تو وقت کی رفتار شروع ہوئی ہے۔ میں آج بھی بیس برس کی دوشیزہ ہوں۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا......؟"

عرفان کو غصہ آگیا۔

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میں تم سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے اپنی بیوی سے بے حد محبت ہے۔ پھر میرے دو بچے جوان

ہیں۔"

وہ خجل سو ہو کر بولا۔

"اوہو......! میں تمہیں کیوں صفائی پیش کرنے لگا......؟ تمہارا جو جی میں آتا ہے کرتی رہو......!"

وہ اُٹھا اور عاشی کو وہیں چھوڑ کر چلتا بنا۔ عاشی کے لئے یہ انکشاف جان لیوا تھا کہ وہ بیس برس تک ایک ایسے شخص کا انتظار کرتی رہی جو انسان کہلانے کے بھی قابل نہ تھا۔ وہ آگ جو کبھی عاشی کی باتیں سن کر عرفان کے دل میں جل اُٹھی تھی، وہی آگ آج عاشی کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔

اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ اب عرفان کو سکون اور چین نہیں لینے دے گی۔ وہ اپنی زندگی کے قیمتی سالوں کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ آخر اس نے کچھ سوچا اور گھر آ گئی۔



"یہ کیا حماقت کی ہے تم نے......؟"

عرفان مسرت پر برس پڑا۔

"ارے......! ساری زندگی میں پہلی بار ایک اچھا کام کیا ہے، اور آپ اسے حماقت کہہ رہے ہیں......؟"

"مسرت......! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے جوان بچے ہیں اور اس عمر میں شادی کروں گا تو لوگ کیا کہیں گے......؟ میری عزت خاک میں مل جائے گی۔"

عرفان نے برافروختگی سے کہا۔

"کچھ بھی ہو عرفان......! یہ شادی ضرور ہوگی۔ اگر آپ عمر کی بات کرتے ہیں تو اس دُنیا میں ایسے مرد بھی ہیں جو ستر، اسّی سال کی عمر میں بھی

یاں رچاتے ہیں۔ آپ تو صرف پینتالیس برس کے ہیں اور اگر آپ ں کا کہتے ہیں تو اس وقت آپ کو لوگوں کا خیال نہ آیا جب بیس برس لڑکی کو انتظار کی صلیب پر لٹکائے رکھا......؟

آپ نے بہت بڑا ظلم کیا ہے عرفان......! اس کے باوجود پتہ نہیں م آج تک خوش کیسے رہے......؟ جبکہ ایک معصوم ہستی آپ کا انتظار کرتے رتے آپ کے ظلم کا شکار ہو کر اذیت سہتی رہی۔"

"تم تو پاگل ہوگئی ہو جو ایسی باتیں سوچ رہی ہو۔ میں یہ شادی رگز نہیں کروں گا۔"

"آپ کو یہ شادی کرنی پڑے گی اور اگر آپ یہ شادی نہیں کر سکتے تو مجھے طلاق دے دیجئے......!"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے......!"

عرفان گرجا۔

"یہ حقیقت ہے عرفان......! اگر آپ مجھے پہلے ہی عاشی کے بارے میں بتا دیتے تو میں کبھی آپ سے شادی نہ کرتی۔ آپ کو ترس نہیں آیا تھا یہ ظلم کرتے ہوئے......؟ میں یہ نہیں دیکھ سکتی۔ اور پھر ہم نے تو ایک بھرپور اور بڑی اچھی زندگی گزاری ہے۔"

"اسی لئے تو کہتا ہوں مسرت......! مجھے تم سے محبت ہے۔ اگر وہ آئی تو کیا ہماری محبت اور یہ سکون قائم رہ سکے گا......؟ اگر تمہیں اس پر زیادہ ہی ترس آ رہا ہے کہ وہ اپنی بہن بھائیوں کی محتاج ہے تو میں کچھ رقم اس کے نام بینک میں جمع کرا دیتا ہوں۔"

"عرفان......! آپ اتنی چھوٹی سوچ رکھتے ہیں۔ کیا یہ چند نوٹ بیس سالوں کا کفارہ ادا کر سکتے ہیں......؟ نہیں......! یہ کاغذ کے ٹکڑے تو اس کی محبت کی توہین ہوں گے۔

باقی رہ گیا آپ کی محبت کا سوال......؟ تو مجھے اب آپ کی محبت کی

ضرورت نہیں۔ میرے بیٹے جوان ہیں۔ میرے لئے ان کی محبت کافی ہے۔ آپ کی محبت پر اب صرف عاشی کا حق ہے۔ وہ چاہے گی تو یہاں میرے ساتھ رہے گی اور اگر وہ نہیں چاہے گی تو آپ کو اس کے ساتھ الگ گھر میں رہنا ہوگا۔''

مسرت نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''مسرت......! میں تمہارے بغیر، بچوں کے بغیر......''

عرفان زِچ ہو کر بولا۔

''آپ کو ہمارے بغیر رہنا ہوگا۔''

مسرت بات کاٹ کر بولی۔ عرفان اس کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔ مگر وہ نہ مانی۔

اور یوں دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ مسرت ساری رسمیں ادا کرنا چاہتی تھی۔ یوں مہندی سے لے کر ولیمے تک ساری رسمیں ادا ہوئیں۔ مسرت سے عرفان کا نکاح لندن کی ایک مسجد میں ہوا تھا۔ نہ عرفان نے سہرا باندھا تھا نہ مسرت پوری طرح دُلہن بنی تھی مگر اب وہ سب رسمیں ادا ہوگئیں تھیں۔

عاشی کے گھر والوں نے خاموشی سے کراچی میں ہی شادی کی تیاری کی تھی۔ ادھر مسرت نے ہر کام کی نگرانی خود کی تھی۔ عرفان کا بس نہیں چلتا تھا کہ خودکشی کر لے۔

عاشی رُخصت ہو کر جب عرفان کے ساتھ گھر آئی تو مسرت نے خود آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھا۔ مگر رات جب عرفان نے اپنے کمرے میں جانے سے انکار کیا تو مسرت بولی۔

''اب ایسی باتوں سے کیا حاصل......؟ شادی تو ہوگئی۔''

''ہاں......! شادی تو ہوگئی اور میں پورے شہر میں ذلیل ہوگیا۔''

ی ضد تھی بلکہ تمہاری بھی ضد تھی کہ اسے روپے نہیں تحفظ چاہئے......! ادی کر لی، اب تم جانو اور وہ......! میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ نفرت ہے اس کے وجود سے۔ اس کی وجہ سے لوگ شہر میں مجھ پر طرح ح کی باتیں بنا رہے ہیں۔

اس عمر میں اگر وہ شادی نہ کرتی تو قیامت تو نہ آجاتی......؟ اور یں بھی اب مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں......!''

''خدا کے لئے عرفان......! ایسی باتیں مت کرو......! تم اس کی عمر بات کرتے ہو مگر یہ نہیں جانتے، یہ عمر تم نے ہی تو لی ہے۔

تمہیں میری قسم......! جاؤ......!''

اور جب عرفان جانے لگا تو وہ بولی۔

''تم کو قسم ہے اس کو برا بھلا مت کہنا۔ وہ پہلے ہی بہت دُکھ سہ ی ہے۔''

عرفان جب کمرے میں داخل ہوا تو عاشی دوپٹہ گلے میں ڈالے ام سے بیٹھی تھی۔ عرفان نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا اور پھر قریب کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اس عمر میں شادی کر کے بہت خوش ہو رہی ہو......؟ مگر یاد ھو......! تم اس گھر میں ضرور ہوگی مگر میرا تم سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔''

''میں تم سے کب واسطہ رکھنا چاہتی ہوں......؟ تم نے میری چھوٹی ی بات کا اتنا بڑا انتقام لیا اور میری عمر کے حسین سال لے لئے۔''

وہ تنفر بھرے لہجے میں پھر گویا ہوئی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر زمانے میں مرد ہی حاکم رہے......؟ وہ ب چاہے جو چاہے کرتا رہے......؟ اور عورت اس کا ہر ظلم سہتی ہوئی قبر یں اُتر جائے......؟ میں اس رسم کو توڑنا چاہتی تھی اور یہ میرا انتقام تھا کہ تمہیں اس عمر میں شادی پر مجبور کیا۔ لوگ تم سے شادی کے بارے میں

پوچھتے تو ہوں گے......؟ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''بکواس مت کرو......!''

عرفان غصے سے دہاڑا۔

''شادی کر کے بھی تمہارے لئے تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ تم نے اس گھر پر قبضہ کیا ہے، میرے دل پر نہیں......!''

''ایک بات تو بتاؤ......!''

عاشی سکون سے بولی۔

''کیا تمہیں اب بھی مجھ سے محبت نہیں......؟''

''نہیں......! اور نہ کبھی ہوگی۔ تمہیں شاید یہاں مسرت دُنیا کی ہر خوشی دے، کیونکہ وہ ایک اچھی عورت ہے۔ مگر میں نہ مل سکوں گا۔ بیس سال تم نے دُور رہ کر انتظار کیا اور بیس سال یہاں رہ کر کرنا......!''

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو......؟ سچ ہی کہہ رہے ہوگے، کیونکہ تمہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے......؟ مگر یہ خوش فہمی تمہیں کیسے ہوگئی کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے......؟ وہ تمہارا انتقام تھا، یہ میرا انتقام ہے۔ البتہ تمہاری بیوی بہت اچھی ہی نہیں بلکہ ایک عظیم عورت ہے۔ اس نے عدالت میں میرا مان رکھ کے میرا دل جیت لیا ہے۔

اور عرفان......! میں اتنی بری نہیں کہ اس کی اچھائی کے جواب میں برائی کرتی۔ تم سے پیار میں نے کیا تھا اور آج بھی محبت کرتی ہوئی رُخصت ہو جاؤں گی۔ جس عورت نے بھری دُنیا میں میری عزت رکھی، میں اس کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔

میں...... میں جا رہی ہوں عرفان......! میں مزید تمہاری نفرت نہیں سہہ سکتی۔ میری طرف سے مسرت کا شکریہ ادا کر دینا۔''

اس کے لفظوں کا مفہوم سمجھتے ہی عرفان نے گھبرا کر غور سے اس کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ عرفان

گتا ہوا باہر آیا اور مسرت کو بلایا۔ مسرت نے جب آ کر دیکھا تو وہ ست ہونے کے قریب تھی۔

''یہ تم نے کیا کیا عاشی......؟''

مسرت ساتھ والی کوٹھی کی طرف بھاگی جہاں ایک ڈاکٹر صاحب ہتے تھے۔

عرفان عاشی کو دیکھ رہا تھا جس کی سانسیں ناہموار ہو رہی تھیں۔ یناً اس کی پہلی محبت وہی تھی۔ اس دیکھ کر ہی اس کے دل نے پہلی بار یک عجیب سا جذبہ محسوس کیا تھا۔ مگر اس کی باتیں سن کر نفرت کا جو طوفان ں میں اُٹھا تو پھر اس کو کسی جذبے کا خیال نہ رہا۔ مگر اس وقت آنکھیں بند رتی ہوئی عاشی کے لئے دل میں پھر وہی جذبہ جاگا تھا۔

''عاشی......!''

وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔

''عاشی جان! یہ تم نے کیا کیا؟ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

''عرفان......! یہ آپ کہہ رہے ہیں......؟''

عاشی نے بڑی مشکل سے پوری آنکھیں کھول کر ان کو دیکھا۔

''ہاں عاشی......! یہ میں کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں کبھی خود کو معاف نہیں کروں گا۔ میرے دل کی پہلی محبت تو تم ہی تھیں عاشی......! مگر تمہاری باتیں سن کر وہ محبت ایسی رُخصت ہوئی کہ پھر لوٹ کر نہ آئی۔ پھر جب تمہیں بیس سال بعد دیکھا تو اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ مگر وقت میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اپنے جرم کا مجھے احساس تھا، لیکن مسرت کا بھی خیال تھا۔''

''عرفان......! آپ سچ کہہ رہے ہیں......؟''

عاشی نے بڑی مشکل سے بولنے کی کوشش کی اور اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ نکلے۔

"عاشی......! عاشی......! یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں......؟ مجھے تم سے محبت ہے۔ وہی محبت جو پہلے بھی صرف تمہیں دیکھ کر جاگی تھی۔"

"عر......عرفان......!"

عاشی روتے ہوئے بولی۔

"بیس سال میں نے آپ کا انتظار کیا تھا اور جب آپ چھوڑ گئے تھے مجھے تو وقت میرے لئے تھم گیا تھا۔ میں نے کتنی باتیں سنیں......؟ کتنی اذیت سہی......؟ اس کا اندازہ شاید اب آپ کو ہو۔ کیونکہ اب میں چلی جاؤں گی تو مجھے یقین ہے کہ یہ وقت یوں ہی دُکھوں کا بار آپ کے کاندھے پر رکھے تھم جائے گا۔

آپ میری طرح زندہ ضرور رہیں گے مگر وقت یوں ہی تھما رہے گا۔ بیس برس کی سزا کوئی کم نہیں ہوتی۔ میں نے بڑی مشکل سے یہ سزا کاٹی ہے۔"

اس کی آواز اُکھڑنے لگی۔

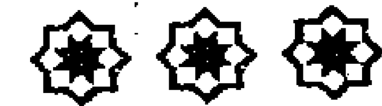
"اب آپ......آپ تیار رہئے گا۔"

بات ختم ہوتے ہی اس کا منہ خون سے بھر گیا اور جب مسرت ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو عاشی رُخصت ہو چکی تھی اور عرفان اس کے قریب کھڑے اس کا چہرہ تکے جا رہے تھے۔ مسرت نے عرفان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا مگر وہ یوں ہی گم سم کھڑے رہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو سزا عاشی انہیں دے گئی ہے، وہ کاٹنا پڑے گی۔

"عاشی......!"

وہ اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے بڑبڑایا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا، میں محسوس کرتا ہوں جیسے کہ وقت تھم گیا ہو۔ یہ وقت کب تک تھما رہے گا......؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"



اَن پڑھ

چھٹی کا دن تھا اور جمیل ناشتہ کرنے کے بعد کمرے میں بیٹھا بور ہو رہا تھا۔ پھر ایک جاسوسی ناول اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ چونکہ رات کو پڑھ چکا تھا، اس لئے چند صفحے پڑھ کر ہی اُکتا گیا اور ناول میز پر پھینک دیا۔

وہ انگڑائی لیتا ہوا اُٹھ ہوا۔ جون کا گرم ترین مہینہ تھا۔ تفریح کے لئے گھر سے باہر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ جمیل جب کبھی بھی بہت بور ہوتا تو خالہ زبیدہ کے گھر میں چلا جاتا تھا۔

خالہ زبیدہ کے دو لڑکے، دو لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں دونوں جوان تھیں۔ لڑکے ابھی چھوٹے تھے۔ کوثر اور کوکب جمیل کے ساتھ ہی کھیل کود کر جوان ہوئی تھیں۔ کوثر چھوٹی تھی اور کوکب بڑی۔ جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی جمیل نے محسوس کیا تھا کہ وہ کوکب کو پسند کرتا ہے۔ اس کو دیکھ کر ہونٹ خود بخود مسکرا اُٹھتے ہیں۔

یہ اور بات تھی کہ کوکب کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ جمیل بہت کوشش کرتا کہ وہ اسے کچھ سمجھائے، کچھ احساس دلائے مگر یا تو وہ جان بوجھ کر کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی یا پھر واقعی اس کے پلّے کچھ نہ پڑتا تھا۔

اس کے برعکس کوثر نہ صرف بات فوراً سمجھ لیتی بلکہ جواب بھی دیتی تو ایک اعتماد کے ساتھ، مگر کوکب کو تو کھانے پینے سے ہی فرصت نہ ملتی۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ کھاتی ہی نظر آتی۔

کوثر البتہ تعلیم کی طرف پوری توجہ دے رہی تھی اور اس وقت میٹرک میں تھی۔ کوکب نے پانچ جماعت پڑھ کر تعلیم کو یوں ختم کر دیا تھا جیسے ڈبل ایم اے کر لیا ہو۔ اس کے منہ سے جمیل نے جب کبھی بھی کوئی بات سنی تھی تو وہ کھانے کے متعلق ہی تھی۔

جمیل کو اچھی طرح یاد تھا کہ بی اے میں اس نے اپنے کالج میں ٹاپ کیا تھا۔ اپنی اس اوّل پوزیشن حاصل کرنے پر جمیل کے پاؤں خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ غریب اور بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا جو محنت مشقت کر کے اسے پڑھا رہی تھی۔

جمیل خوشی خوشی یہ بتانے کے لئے کوکب کی طرف آیا اور یہ بھی اتفاق کی بات تھی، کوثر اسکول جانے کے لئے باورچی خانے میں ماں کے پاس بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ کوکب آنگن میں جھاڑو دے رہی تھی۔ جمیل اسے شانوں سے پکڑ کر گھماتے ہوئے اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولا۔

”کوکب......! میں پاس ہوگیا۔“

جمیل کا خیال تھا وہ اسے مبارک باد دے گی اور انتہائی خوشی کا اظہار کرے گی مگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بھی نہ ہوئی۔ وہ لاپرواہی سے جھاڑو رکھ کر کپڑے جھاڑتی ہوئی بولی۔

”اتنی بڑی خوش خبری کے ساتھ خالی ہاتھ آتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی......؟ لڈو لے کر آتے اور وہ بھی موتی چور کے۔“

جمیل جھنجلا سا گیا۔ جی چاہا، اتنی زور سے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کرے کہ سات دن تک کم از کم نشان نظر آتا رہے۔ مگر وہ اس پر ہاتھ بھی

ں اُٹھا سکتا تھا۔ وہ تو اسے اپنے سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ غصے سے بھینچ کر وہ اسے گھورنے لگا اور وہ کسی گڑیا کی طرح معصومیت سے جھپکائے جا رہی تھی۔ اتنے میں کوثر باورچی خانے سے باہر آئی اور و دیکھ کر حیرت سے بولی۔

”جمیل بھائی......! آپ؟ خیریت تو ہے؟ صبح صبح کیسے آنا ہوا؟“

پھر خود ہی چونکتے ہوئے بولی۔

”ارے ہاں! آپ کا تو آج رزلٹ آؤٹ ہونا تھا؟ نتیجہ کیا رہا؟“

”اپنے کالج میں ٹاپ کیا ہے۔“

وہ خوشی سے بولا۔

”تب تو مبارک ہو آپ کو......!“

کوثر نے کہا اور کتابیں اُٹھا کر چلی گئی۔ جمیل خود بھی بے دلی سے نے کے لئے مُڑا تو کوکب بولی۔

”پھر کھلاؤ گے ناں لڈو......؟“

جمیل کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل گیا۔

صرف دو ماہ کی جدوجہد کے بعد جمیل کو بینک میں اکاؤنٹ آفیسر جاب مل گئی۔ یہ جمیل کی خوش قسمتی اور ماں کی دُعاؤں کا اثر تھا۔ اسے ے لوگوں کی طرح نوکری کے لئے دھکے نہیں کھانے پڑے تھے۔ ماں کری کی خوش خبری سنانے کے بعد وہ دل میں خوشی چھپائے کوکب کے ں آیا۔ کوکب کوثر کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ دونوں بھائی کھیلنے گئے ئے تھے اور خالہ زبیدہ کو وہ ماں کے پاس باتیں کرتے چھوڑ کے آیا تھا۔

”کہئے جمیل بھائی......! کیسے آنا ہوا......؟“

کوثر نے حسب عادت پوچھا اور بھاگ کر اندر سے کرسی اُٹھا

ں۔

”کوثر......! مجھے ملازمت مل گئی۔“

جمیل نے بغور کوکب کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے بے خبر چنے چبانے میں مصروف تھی۔

"ارے بھئی......! کیا مل گئی......؟"

اس نے چنے چباتے چباتے اس لاپرواہی سے پوچھا۔

"نوکری مل گئی......!"

کوثر نے کہا اور جمیل سے بولی۔

"آپ تو بہت لکی ہیں جمیل بھائی......! آپ کو نوکری کے لئے بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی۔ ورنہ ملازمت تو آج کل کے زمانے میں ایک مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔"

"اے......! ملتی کیوں ناں......؟ میں نے خود نماز پڑھ کر صبح دُعا کی تھی نوکری مل جائے۔ اب تم جلدی سے منہ میٹھا کرانے کے بارے میں سوچو......!"

اس نے پھر کھانے کی بات کی۔ جمیل کو بے حد غصہ آیا مگر اچانک اس کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا جب کوثر نے چھوٹے ہونے کے باوجود اسے ڈانٹ کر کہا۔

"کبھی کوئی ڈھنگ کی بات بھی کر لیا کرو......! چوبیس گھنٹے کھانے ہی کی باتیں کرتی ہو۔ کھانے کے علاوہ بھی دُنیا میں بہت کچھ ہے۔"

کوکب برا ماننے کی بجائے جمیل سے بولی۔

"کیا کھانے پینے کی باتیں کرنا اچھی نہیں ہوتیں......؟"

جمیل کو کوکب اس وقت اتنی پیاری لگی کہ جلدی سے بولا۔

"کیوں نہیں......؟ خوشی کے موقع پر کھانے کی بات ہی کی جاتی ہے۔"

اور پھر مزید ان کے گھر رُکے بغیر چلا آیا۔ بہرحال لڈو کھلانا وہ ایسے موقعوں پر بالکل نہیں بھولتا تھا۔

پہلی تنخواہ ملنے پر ماں نے مٹھائی منگوا کر پورے محلے میں تقسیم لی۔ آخر میں مٹھائی کی پلیٹ لے کر اُٹھتی ہوئی بولی۔

"اچھا بیٹا......! اب میں تمہاری خالہ زبیدہ کے گھر جا رہی ہوں۔ تم گھر میں ہی رہنا۔"

"لاؤ ماں......! میں دے آتا ہوں۔"

جمیل بچوں کی طرح ماں کے ہاتھ سے پلیٹ چھین کر باہر نکل گیا۔ جب وہ خالہ زبیدہ کے گھر میں داخل ہوا تو کوثر برآمدے میں بیٹھی اسکول کا کام کر رہی تھی۔ ساتھ میں چھوٹے بھائیوں کو بھی پڑھا رہی تھی۔ قریب ہی خالہ پیڑھی پر بیٹھی پالک بنا رہی تھیں۔ البتہ کوکب کہیں نظر نہ آئی۔

"کہاں ہو سکتی ہے......؟"

جمیل نے سوچا۔

"آؤ جمیل بیٹے......! رُک کیوں گئے......؟"

خالہ نے اسے کچھ سوچتے دیکھ کر پوچھا۔

"خالہ......! یہ ماں نے دی ہے۔"

جمیل نے پلیٹ ان کے ہاتھوں میں تھمائی اور خود کھڑا ہو گیا۔

"کوکب......! کرسی لا بھائی کے لئے......!"

کوثر کی ماں نے مٹھائی والی پلیٹ پر رومال ڈالتے ہوئے آواز دی۔ تین چار آوازیں دینے پر کوکب اندر سے کرسی اُٹھائے باہر آئی اور جمیل کے پاس پہنچ کر یوں زمین پر پٹخی جیسے جمیل کے سر پر مارنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ جمیل نے بیٹھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"سو رہی تھی کیا......؟"

جمیل نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اور کیا چکی پیس رہی تھی......؟"

کوکب کے جواب دینے سے قبل ہی ماں کہنے لگی۔

''کھا لیا، اور سو لیا! یہی دو کام تو ہیں جہان میں اس کے لئے!''

''سوتی نہ تو اور کیا کرتی......؟ تمہیں اگر پالک بنانے کی وجہ سے غصہ آ رہا ہے تو لاؤ......! ادھر دو، میں خود کاٹ لیتی ہوں۔''

کوکب نے ماں کے ہاتھ سے چھری لے کر پالک والا برتن اپنی طرف کھسکا لیا۔

''بیٹے......! تمہیں آج پہلی تنخواہ ملی ہوگی......؟''

خالہ نے پوچھا۔

''ارے......! تو کیا پہلی تنخواہ مل گئی......؟''

کوکب چونکتے ہوئے بولی۔

''ہاں......! مل گئی۔''

جمیل نے آہستہ سے کہا۔

کوکب پالک والا برتن ایک طرف رکھی ہوئی بولی۔

''خالہ جان کہتی تھیں جب تمہیں پہلی تنخواہ ملے گی تو وہ محلے میں مٹھائی بانٹیں گی۔''

جمیل کوکب کی یہ بات سن کر جل ہی تو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوکب یہی بات کرے گی۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر ایسی ہی باتیں کر کے اس کے ارمانوں کا خون کیا کرتی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ جمیل تو خاموش رہا البتہ کوثر بولی۔

''پھر کھانے کی بات......؟''

''تو کیا رونے کی بات کروں......؟''

کوکب کاٹنے کو دوڑی۔ پیار کاٹنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ خود جمیل کی آنکھیں بھی نم ہو رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر کوکب کی ماں بولی۔

''ارے......! کم عقل......! پہلے آ کر چھیل لیتی تو کیا ہو جاتا......؟
ں نہیں دے رہا جمیل بیٹھا ہوا ہے......؟''

''جمیل بیٹھا ہے کہ کمشنر بیٹھا ہے......؟''

کوکب بڑبڑاتی ہوئی سبزی اُٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ کمر پر بل
تی ہوئی ناگن سی لمبی چوٹی نے جمیل کے دل کو ڈس لیا۔ اس کا جی چاہا
سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے مگر وہ گھر چلا آیا۔

بالآخر اس نے کوکب سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔
موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ جمیل جب بھی جاتا تو وہ سب بہن بھائیوں
باتیں کرتے ہوئے ملتی یا سوتی ہوئی، اور کبھی کچن میں کام کرتی ہوئی۔
ں کو ہمیشہ ناکام لوٹنا پڑتا۔

کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ کوکب کو سر سے بلند کر کے زمین پر
خ دے تاکہ سارا قصہ ہی ختم ہو جائے مگر وہ اپنی اس خواہش کو کبھی عملی
امہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ دوسری تنخواہ کیا ملی، ماں شادی کا مطالبہ کرنے لگی۔
سری تنخواہ ملتے ہی یہ مطالبہ زور پکڑ گیا۔ جمیل اس کوشش میں تھا کب
وکب سے کوئی بات ہو اور وہ ماں کو کوئی معقول جواب دے سکے۔

چھٹی کے روز وہ حسب معمول ناشتہ کرنے کے بعد کمرے میں
ٹھا بور ہو رہا تھا۔ اگرچہ موسم گرمی کا نہیں تھا مگر کوکب کی وجہ سے اس کا گھر
سے جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس کے خیال میں اُلجھا
ٹھا تھا کہ ماں چاول چنتی ہوئی اندر آئی اور شادی کی بات چھیڑ دی۔

''جمیل......! تو آخر چاہتا کیا ہے......؟ کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے......! میں اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتی۔ تجھے تو میرا کچھ خیال ہی نہیں۔ دیکھتا نہیں سارے گھر کا کام کرتے ہوئے میں تھک جاتی ہوں۔ اب تو میری نظر بھی مزید کمزور پڑ گئی ہے۔ چاول بھی نہیں چنے جاتے؟''

''تو ماں چشمہ لگا لو......!''

جمیل نے ٹالنے کے لئے کہا۔

”جمیل......! تو سمجھتا کیوں نہیں......؟ مجھے عینک کی نہیں، تیری دُلہن کی ضرورت ہے۔“

”ماں......! مسئلہ اگر چاولوں کا ہے تو لاؤ......! میں چن دیتا ہوں۔ یہ دُلہن وُلہن کا قصہ چھوڑو......!“

جمیل نے زبردستی ماں کے ہاتھ سے چاول چھیننے اور چننے لگا۔

”جمیل بیٹے......! میں تجھے کیسے سمجھاؤں......؟“

ماں پیار سے اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی۔

”تیری دُلہن آجائے گی تو گھر میں رونق پیدا ہوگی اور گھر کا سارا کام کاج بھی وہ سنبھال لے گی۔“

”اور ماں......! اگر اس نے یہ سب نہ کیا تو گھر میں لڑائی جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔ اس سے بہتر یہ نہیں کہ ہم اسی طرح گزارہ کرتے جائیں......؟“

”ہر لڑکی ایسی نہیں ہوتی اور پھر جو لڑکی میں نے دیکھی ہے، وہ تو بالکل ایسی نہیں۔ بہت سلیقہ مند ہے۔ تم ہاں کر کے تو دیکھو......!“

”پر ماں......! وہ لڑکی ہے کون......؟“

جمیل نے ہنس کر پوچھا۔

”اپنی کوثر......! کیا کسی سے کم ہے کوثر......؟ خوب صورت ہے، پڑھی لکھی ہے۔ بس اور کیا چاہئے ہمیں......؟ ہاں کر دو بیٹا......!“

”مگر ماں......! وہاں کوکب بھی تو ہے۔“

جمیل نے ماں کی رائے جاننا چاہی۔

”کوکب کو چھوڑو......! کوکب بھی کوئی لڑکیوں میں لڑکی ہے......؟ کسی بات کا ہوش نہیں۔ کھا لیا یا پھر سو لیا......؟ نہ اپنی خبر نہ دوسروں کی......؟ کوثر ایک اچھی لڑکی ہے اور پٹر پٹر انگریزی بولتی ہے۔ کوکب نے

اعت پڑھ کر پڑھائی چھوڑ دی۔ تم نے چودہ جماعتیں پاس کی ہیں۔ کم دس جماعتوں والی لڑکی تو تجھے ملنی چاہئے......!“

”ماں! تم نے دیکھا ہوگا کہ گھر کے سارے کام تو کوکب ہی کرتی سی نے پڑھ لیا، کسی نے گھر سنبھال لیا۔ بات تو ایک ہی ہے۔“

جمیل نے کوکب کی صفائی پیش کی۔

”بیٹا......! کام تو وہ ماں کے ڈنڈے کی وجہ سے کرتی ہے ورنہ پوری ہڈ حرام......! خیر......! تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میں ادھر کریم گھر جا رہی ہوں۔ چاول چن کر بھگو دینا۔“

ماں کے جانے کے بعد جمیل نہایت سنجیدگی سے کوکب کے بارے ں سوچنے لگا۔

”کب تنہائی ملے اور کوکب سے بات ہو......؟“

وہ انہی سوچوں میں بیٹھا تھا کہ کوکب کی آواز سنائی دی۔

”خالہ......! اے خالہ......!“

وہ پکار رہی تھی۔

”اس کی جگہ اگر کوثر ہوتی تو خالہ جان کہتی۔“

جمیل اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دروازے کے یچھے چھپ گیا۔

”پتہ نہیں ماں بیٹا کہاں گئے ہوئے ہیں......؟ چور چاہے پورا گھر وٹ کر لے جائیں......؟“

کوکب نے کمرے میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

تنی دیر میں وہ جمیل کی طرف پلٹی، جمیل اندر سے دروازہ بند کر چکا تھا۔

”دروازہ کیوں بند کیا......؟“

کوکب اسے گھورتے ہوئے خوفزدہ ہوئے بغیر بولی۔

”تم نے میرا خون بہت جلایا ہے۔ بہت تڑپایا ہے مجھے۔ مگر اب

کہاں جاؤ گی......؟ ایک ایک بات کا بدلہ لوں گا۔"

"کب جلایا ہے میں نے تمہیں......؟ جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی......؟ دروازہ کھولو......! خالہ آگئیں تو کیا سوچیں گی......؟"

"سوچنے دو جو بھی وہ سوچتی ہیں۔ مگر تم نے کبھی اپنے بارے میں بھی سوچا ہے......؟"

جمیل نے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔

"یہ کیا کر رہے ہو......؟ یہ تمہیں آج ہو کیا رہا ہے......؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟ کوئی دورہ تو نہیں پڑا کسی بیماری کا......؟"

کوکب نے حیرانی سے اسے تکتے ہوئے پوچھا۔

"جو کچھ بھی ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے۔ البتہ تمہیں ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔"

"مجھے......؟ مجھے کیوں......؟"

کوکب اسی حیرانی سے بولی۔

"اس لئے کہ تمہیں ساون کی کچھ خبر ہی نہیں......"

صحن میں ماں کی آواز اُبھری۔ جمیل کو نہ صرف بات اُدھوری چھوڑنا پڑی بلکہ کوکب کے ہاتھ بھی۔

اور آہستہ سے دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے ماں......؟"

"ارے کوکب......! تو کب آئی......؟"

ماں نے جمیل کی بات کا جواب دینے کی بجائے کوکب سے سوال کیا۔

"ابھی آئی تھی......!"

کوکب مٹھی بھر چاول اُچھالتی ہوئی بولی۔

"خالہ جان......! ایک بات تو بتائیں......! یہ جمیل کو کیا ہوگیا

ہے......؟ بڑی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔"

"کیسی باتیں......؟"

"اب آپ کو کیا بتاؤں......؟"

کوکب نے جمیل کی طرف دیکھا اور بولی۔

"خالہ......! تمہیں ماں نے بلایا ہے۔"

اور باہر نکل گئی۔ شام کو جمیل ان کے گھر آیا تو زبیدہ خالہ، کوثر اور دونوں بیٹے چھت پر تھے۔ کوکب شاید نہا کر نکلی تھی۔ تولیے سے بال خشک کر رہی تھی۔ جمیل چپ چاپ کھڑا اسے دیکھنے لگا۔

"تم کب آئے......؟"

اچانک کوکب اپنے پیچھے کسی اور کو محسوس کرتی ہوئی مڑی۔

"تمہارے لئے یہ لایا ہوں۔"

جمیل نے فروٹ کا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے کیا......؟"

کوکب نے حیرت سے لفافے کی طرف تکتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے، کوئی کھانے کی چیز ہوگی۔"

جمیل طنزیہ لہجے میں بولا۔

"اور پھر تمہیں کیا......؟ تمہیں تو صرف کھانے سے مطلب ہے۔ میں لاکر دوں یا کوئی اور......؟"

"تم کیا سمجھتے ہو مجھے......؟"

کوکب فروٹ کا لفافہ اس کے ہاتھ سے پکڑ کر برآمدے میں پھینکتے ہوئے بولی۔

"کیا میں کچھ نہیں جانتی......؟ بے وقوف ہوں میں......؟ جاہل ہوں یا کوئی دیہاتی عورت......؟ تعلیم چاہے کم ہے مگر پڑھنا لکھنا جانتی ہوں۔ مجھے پتہ ہے غیر مرد سے چیز نہیں لینی چاہئے کیونکہ لوگ باتیں بناتے

ہیں۔تم تو ہمارے اپنے ہو ناں......!“

اس کی بات سن کا جی چاہا سر پیٹ لے۔

”کوکب......! تم سچ مچ واقعی نہیں سمجھتیں......؟“

جمیل نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”پھر وہی بات......؟“

کوکب آنکھیں نکالتے ہوئے بولی۔

”کہا تو ہے میں بے وقوف نہیں ہوں۔ سب سمجھتی ہوں۔“

”تم کچھ نہیں سمجھتیں......!“

جمیل دانس پیس کر چیخا۔

”امی ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے کوثر سے شادی کر لینی چاہئے......!“

”تو منع کس نے کیا ہے......؟“

کوکب جھٹ بولی۔

جمیل اسے دیکھتا ہوا بے بسی سے واپسی کے لئے مُڑا۔

”ڈیئر جمیل......! تم بہت باتیں کہہ چکے۔ اب میری بھی سنو!“

جمیل حیرت سے مُڑا تو کوکب بولی۔

”اتنی سی انگریزی تو مجھے بھی بولنی آتی ہے۔“

پھر رُخ موڑتے ہوئے بولی۔

”میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم صرف یہی سمجھتے ہو ناں کہ میں صرف کھانا جانتی ہوں۔ تم لوگوں نے جیسا مجھے سمجھا، میں نے بن کر دکھا دیا۔“

”تم کچھ نہیں جانتیں کوکب......! اگر تم کچھ جانتیں، کچھ سمجھتیں تو میرے جذبات سے یوں بے خبر نہ رہتیں......؟ مجھے یوں سولی پر نہ لٹکاتیں......؟ تم نے ہمیشہ میرے ارمانوں کا خون کیا ہے۔ تم کیا سمجھو محبت کس کو کہتے ہیں......؟“

کوکب نے جزبز ہو کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس سے کبھی کوئی انسان بے خبر نہیں ۔ مگر تمہیں تو کوثر جیسی سلیقہ مند لڑکی چاہئے جو تمہارے ساتھ اُردو کے ہ ہلکی پھلکی انگریزی بھی بول سکے۔ آج تمہیں ایک راز کی بات بتاتی ں جمیل......! لڑکی اَن پڑھ ہو یا پڑھی لکھی، امیر ہو یا غریب، سیدھی ہو یا ک، محبت ضرور کرتی ہے۔ شادی کے بعد شوہر سے کرے یا شادی سے محبوب سے۔ آخر ہوتی تو لڑکی ہی ہے ناں......؟ اس کے سینے میں بھی ہوتا ہے، پتھر نہیں......!“

”کوکب......! یہ تم کہہ رہی ہو......؟“

جمیل نے حیرت کی تصویر بن کر پوچھا۔

”ہاں ہاں......! میں کہہ رہی ہوں۔ کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ں۔“

کوکب نے ہنس کر کہا۔

”اب ڈرامہ ختم......! تمہیں یہ بتا دوں کہ میں تمہاری ہر بات سمجھتی ں۔“

”ارے کوکب......! گویا تم مجھے بے وقوف بناتی رہی ہو......؟“

جمیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تم کتنی اچھی ہو کوکب......! اور عقل مند بھی۔“

”جی ہاں......! میں سب کچھ ہوں۔“

کوکب شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”مگر اب مکھن لگانے کی ضرورت نہیں......! یہ بتاؤ......! اس خوشی کے موقع پر منہ میٹھا کروا رہے ہو یا نہیں......؟“

یہ کہتے ہوئے وہ خود بھی جمیل کے ساتھ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔



ذرا سی بات

بے سبب تجھ سے ہر اِک بت پہ نالاں ہونا
اپنا پیشہ ہی جو ٹھہرا ہے پریشاں ہونا

اب کی بار میں پورے چھ سال بعد ایبٹ آباد آئی تھی۔ بھابی اور بچے مجھے یوں اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ جبکہ بھابی جان نے کہا تھا۔

"تمہارا دل کیسے مانا یہاں آنے کو......؟ بھلا چھ سال بعد آنے کی بھی کیا ضرورت تھی......؟ مزید چھ سال گزرنے کا انتظار کیا ہوتا......؟"

اور میں ان کی ناراضگی محسوس کر کے مسکرا دی۔

بھائی جان میرے سگے بھائی تو نہ تھے، لیکن سگوں سے بڑھ کر ہمیں چاہتے تھے۔ وہ میرے بھیا کے بہت عزیز دوست تھے اور ایبٹ آباد کی ایک بہت بڑی حویلی میں رہتے تھے۔

میں چھ سال پہلے بھیا کے ساتھ ان کے گھر آئی تھی اور بہت اچھے دن گزار کر گئی تھی۔ بھیا تو مجھے چھوڑ کر دوسرے ہی روز چلے گئے تھے۔ جبکہ

بھابی اور بھائی جان نے روک لیا تھا۔

میں اگرچہ پہلی بار آئی تھی لیکن مجھے ذرا سی بھی اجنبیت کا احساس ہوتا تھا۔ سارا دن میں بھابی کے ساتھ باتیں کرتی اور شام کو روز بھابی ڑی بیٹی کے ساتھ باہر ٹہلنے چلی جاتی تھی۔ دن رات بہت اچھے گزر تھے۔

لیکن ایک دوپہر جبکہ میں سو رہی تھی، اچانک شور کی آواز سن کر آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر کھڑکی کھولی۔ بھابی اونچی ز میں بول رہی تھیں اور بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ تو بہت آہستہ اور لہجے میں بات کرنے کی عادی تھیں۔ بھابی جان کا چہرہ بھی غصے سے خ ہو رہا تھا جبکہ بشریٰ الگ کھڑی رو رہی تھی۔

میں نے دل میں سوچا نہ جانے میرے سوتے میں ان پر کیا بیتا ر گئی ہے جو سب غصے میں بھرے بیٹھے ہیں......؟

پہلے تو سوچا کچھ نہ پوچھوں۔ ہوسکتا ہے بات مجھے بتانے والی نہ ۔ کیونکہ ہر گھر کی اپنی سو باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن جب شور کسی طرح کم نہ تو میں دوپٹہ سنبھالتی ہوئی باہر نکل آئی۔

بھابی نے میرے باہر آنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو میں نے بشریٰ پوچھا۔

"کیا ہوا بشریٰ......؟"

بشریٰ تو رونے کی وجہ سے خاموش رہی، البتہ بھابی نے غصے سے کہا۔

"نہ جانے اس کمبخت کو موت کب آئے گی......؟"

"کس کو بھابی جان......؟"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ کیونکہ میں نے تو انہیں کبھی بچوں کو بھی کوستے نہیں دیکھا تھا۔

"ارے.....! اس کمینے گل کو اور کس کو.....؟"

بھابی نے منہ بھر کر بددُعا دی۔ میں اور بھی حیران ہوئی۔ کیونکہ نام بھی ان کے کسی بچے کا نہ تھا۔ قبل اس کے کہ میں گل کے بارے مزید پوچھتی، بھابی جان نے سخت لہجے میں کہا۔

"بکواس بند کرو دلشاد.....!"

بھابی غصے سے بڑبڑاتی ہوئی اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ بھائی جا کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ بھائی جان تو اوروں کے لئے بہت خو تھے لیکن بھابی کو اونچی آواز میں بات کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ بھا کے جانے کے بعد میں نے بھائی جان سے پوچھا۔

"یہ گل کون ہے.....؟"

"میرا چھوٹا بھائی ہے۔"

بھائی جان نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

یہ انکشاف میرے لئے نیا تھا کیونکہ مجھے آئے ایک ہفتہ ہو چکا اور پہلے کبھی گل خان کی بات نہ ہوئی تھی۔ بھائی جان بھی اُٹھ کر باہر چ گئے تو میں نے سوچا۔

"ہوسکتا ہے گل نے بشریٰ یا کسی بچے کو مارا ہو اور اس کا مارنا بھا کو برا لگا ہو۔ یہ ہی وجہ ہوسکتی تھی۔"

اس رات باہر ٹہلتے ہوئے میں نے بشریٰ سے پوچھا۔

"بشریٰ.....! کیا تمہارے چچا نے آج تمہیں مارا تھا.....؟"

"نہیں تو.....! آپ سے کس نے کہا.....؟"

بشریٰ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"اچھا تو پھر تم رو کیوں رہی تھیں.....؟"

"وہ تو میں چچا کی حالت دیکھ کر میں روئی تھی۔"

بشریٰ کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔

"کیوں.....؟ کیا تمہارے چچا بیمار ہیں.....؟"

میں نے پوچھنا ضروری سمجھا۔

"نہیں تو.....!"

بشریٰ اتنا کہہ کر چپ ہوگئی۔

"کمال ہے.....! اگر انہوں نے تمہیں مارا بھی نہیں، اور وہ بیمار بھی تو پھر.....؟"

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ پہلے تو چپ رہی، شاید سوچ رہی تھی، بتائے یا نہ بتائے.....؟ ار طویل آہ بھر کے بولی۔

"میرے چچا نشہ کرتے ہیں۔"

"کیا تمہارے چچا نشہ کرتے ہیں.....؟"

میں نے حیرت سے کہا کیونکہ بھائی جان تو سگریٹ تک نہیں پیتے اور ان کے بھائی.....؟

بشریٰ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ زاہد اس کو بلانے آگیا اور میں بھی کے ساتھ واپس آگئی تھی۔ مگر دل میں، میں نے سوچ لیا تھا کہ بھابی گل کے بارے میں ضرور پوچھوں گی۔

صبح جب بھابی کام کاج سے فارغ ہوئیں تو میں نے گل کے ے میں پوچھا۔ بھابی نے ناگواری سے کہا۔

"پہلے سارے خاندان سے بغاوت کر کے اپنے سے بڑی عمر کی کی سے شادی کی، تب نہ ماں باپ کی عزت کا خیال آیا، نہ بھائی کی زت کا سوچا۔ مگر شادی کے بعد جب وہ آوارہ پہلے بچے کی پیدائش پر چھوڑ ر چل دی....."

بھابی سانس لینے کے لئے رُکیں تو میں نے دُکھ سے کہا۔

"آپ کا مطلب ہے وہ مر گئی.....؟"

''ارے......! بے غیرت لوگ بھی کبھی مرتے ہیں......؟ جس طر گل کو پسند کیا تھا، اسی طرح کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی اور اس نے لوگو کے طعنوں سے تنگ آ کر نشہ کرنا شروع کر دیا۔''

بھابی کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

میں مزید کچھ نہ پوچھ سکی۔ مگر شام کو جب بھائی جان آئے تو م نے ان سے کہا۔

''میں گل کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

بھائی جان نے اسی وقت زاہد سے کہا۔

''جاؤ......! ڈیرے پر چچا سے کہنا میری بات سن جائے۔''

اور میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔

ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ بشریٰ نے آواز۔

''چچا آئے ہیں۔''

میں جلدی سے باہر آئی اور پوچھا۔

''کہاں ہیں......؟''

''وہ ابو کے ساتھ بیٹھے ہیں۔''

بشریٰ نے کہا اور میں چونک پڑی۔ بھائی جان نے کہا تھا وہ مجھ سے دس برس چھوٹا ہے اور بھائی جان کے پاس بیٹھا وہ شخص کسی طرح ا سے کم عمر کا نہیں لگ رہا تھا۔ بہت پریشان سا حلیہ، بالوں میں بہت زیاد تیل ڈال رکھا تھا جبکہ کمزوری ایسی کہ لگتا تھا اب گرا، تب گرا۔ بھائی جان نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''گل......! یہ میرے لاہور والے دوست کی بہن امبر ہے۔''

اس نے چونکتے ہوئے سر اُٹھایا۔ سر کو خم دے کر گویا مجھے سلام کیا تھا۔ میں کوئی جواب دیئے بغیر اس کو دیکھتی رہی اور دُکھ سے سوچتی رہی۔

''محض ایک عورت کی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچا ہے۔''

میرے اندر اس کے لئے دُکھ کی ایک لہر اُٹھی۔ میں نے فوراً بھائی ن سے کہا۔

''ان کا علاج کیوں نہیں کرواتے......؟''

بھائی جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بھرائے ہوئے ے میں کہا۔

''میں نے تو کوئی علاج نہیں چھوڑا۔ اسپتال میں بھی رکھا ہے اور ائیویٹ بھی علاج کرواتا رہا ہوں۔ مگر کچھ دنوں کے لئے ٹھیک ہو جاتا ہے مگر پھر وہی دوست، وہی ماحول، وہی عادت......!''

میں بھائی جان کی باتیں سنتے ہوئے مسلسل اس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جھکائے بیٹھا تھا، چپ چاپ۔ اسے آس پاس کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ لسل زمین کو دیکھے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بھائی جان نے اسے جانے کا کہا تو وہ چھوٹے وٹے قدم اُٹھاتا ہوا چلا گیا۔

نہ جانے کیا وجہ تھی، رات دیر تک میں اسی کے بارے میں سوچتی ی۔ محبت کی ناکامی ہر دور میں انسان کی برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ وہ رت کتنی کمینی تھی، جو پسند سے شادی کرنے کے باوجود چھوڑ کر چلی گئی۔

''بے چارہ گل......!''

مجھے گل سے بے حد ہمدرد ہو رہی تھی۔

اگلے دن میں نے تنہائی میں بشریٰ سے پوچھا۔

''ارے بھئی......! یہ تمہارے چچا موصوف رہتے کہاں ہیں......؟''

نہ جانے کیوں میں اسے ایک بار پھر دیکھنا چاہتی تھی......؟ رات ھی اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے گزری تھی۔

''چچا پرانی حویلی میں رہتے ہیں۔''

بشریٰ نے بتایا۔

"وہ قریباً قریباً تمام گر چکی ہے، صرف ایک دو کمرے ٹھیک حالت میں ہیں۔ ان کی بھی کھڑکیاں دروازے نہیں ہیں۔ ابا بھی بہت کہتے ہیں کہ یہاں آکر رہا کرو، گھر میں سب کے ساتھ۔ مگر چچا نہیں مانتے۔ چونکہ رات کو سارے ان کے دوست، جو ان جیسے ہیں، ان کے ساتھ وہاں حویلی میں آکر محفل جما لیتے ہیں، اس لئے امی بھی اس بات کو پسند نہیں کرتیں کہ وہ یہاں آکر رہیں۔ کبھی کبھار جب کپڑے دُھلوانے ہوں تو آکر مجھے دے جاتے ہیں اور میں دھونے کے ساتھ ساتھ استری بھی کر دیتی ہوں۔ شادی سے پہلے جب وہ ائیر فورس میں تھے تو بہت صاف رہتے تھے۔"

"ارے......! تو کیا پہلے تمہارے چچا ائیر فورس میں تھے......؟"

یہ انکشاف میرے لئے حیران کن تھا۔

"جی......! پہلے ائیر فورس میں تھے، یہ جب سے نشہ کرنے لگے ہیں تب سے نوکری وغیرہ سب ختم ہو گئی۔ اب تو ان کو صاف رہنے سے جیسے نفرت ہو گئی ہے۔ لیکن جب میں کپڑے استری کر کے دیتی ہوں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"اور کھانا یہاں سے کھاتے ہیں......؟"

میں نے پوچھا۔

"کھانا وہ باہر ہی سے کھاتے ہیں۔"

"ہوں......!"

میں کچھ دیر سوچتی رہی پھر کہا۔

"بشریٰ......! کیا تم میرے ساتھ پرانی حویلی چل سکتی ہو......؟"

نہ جانے کیوں اچانک ہی میرے دل میں بالکل افسانوی ہیروئنوں کی طرح اس کے لئے نرم جذبہ جاگ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر اس کو دیکھنا چاہتی تھی، سمجھنا چاہتی تھی، جو محض ایک عورت کی وجہ سے برباد ہو گیا تھا۔ میں اسے بتانا چاہتی تھی، سمجھنا چاہتی تھی کہ زندگی اتنی بے مول ہرگز نہیں کہ

ے محض ایک بے وفا ہستی کے لئے ضائع کر دیا جائے۔ زندہ رہنے کے ئے بہت سے دوسرے سہارے بھی تو ہوتے ہیں۔

"چچا وہاں تو نہیں ہوں گے، رات گئے آتے ہیں اور صبح نماز سے ی پہلے نکل جاتے ہیں۔ نہ جانے کہاں جاتے ہیں......؟"

بشریٰ نے دُکھ سے کہا۔

"اس کے باوجود میں جاؤں گی۔ دراصل میں تمہارے چچا سے بس ملنا چاہتی، میں تو حویلی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے بشریٰ کو مطمئن کرنے کے لئے کہا اور دل میں سوچا۔

"ہو سکتا ہے کہانیوں کے ہیرو کی طرح وہ بھی اچانک وہاں جائے......؟"

بشریٰ مجھے ساتھ لے کر چل دی۔ راستے میں قبرستان سے گزرنا ا۔ پھر ہم پرانی حویلی پہنچ گئے۔ حویلی ویسی ہی تھی جیسا بشریٰ نے اس کے ے میں کہا تھا۔

ایک کمرے میں میلا سا گدا زمین پر پڑا تھا۔ دو تین میلے سوٹ ے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔ چارپائی اُلٹی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے سارے کپڑے اکٹھے کر کے کھڑکی کی سلاخوں میں پھنسا دیئے۔ گدا لے کر کے ٹوٹی ہوئی چارپائی پر رکھا اور بشریٰ سے کہا۔

"تم کمرے کی صفائی کرو۔"

مگر بشریٰ نے کہا۔

"یہاں جھاڑو نہیں ہے۔"

"اچھا......!"

اچانک میں نے وہاں پڑے کوئلے میں سے ٹکڑا توڑ کر کمرے کی اف دیوار پر لکھا۔

"نشہ کرنے والے ملک وقوم پر بوجھ ہوتے ہیں۔ پلیز......! نشہ

چھوڑ دیں......!''

اور پھر بشریٰ کے ساتھ واپس آ گئی۔

لیکن اب چین کہاں تھا......؟

اگلے روز میں پھر بشریٰ کے ساتھ وہاں گئی تو دیکھا، اس نے کپڑے پھر سارے کمرے میں بکھیر دیئے تھے۔ گدا زمین پر پڑا تھا۔ مجھے یہ سب دیکھ کر بہت دُکھ ہوا۔ میں نے سوچا۔

''شاید اس نے ابھی میری تحریر کو نہیں پڑھا۔''

یہی وجہ تھی کہ میں نے پھر لکھا۔

''نشہ بزدل لوگ کرتے ہیں۔ دوسروں سے انتقام لینے کا یہ بہت غلط اور بھونڈا طریقہ ہے۔''

اور پھر بشریٰ کے ساتھ واپس آ گئی۔

نہ جانے کیوں مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ میں نے بھائی جان سے بھی کہا تھا۔

''آپ ایک بار پھر اس کا علاج کروائیں......!''

تب بھابی بیچ میں بول پڑیں۔

''ارے......! وہ ٹھیک ہونے والا نہیں......! اور پھر ہمارے پاس فالتو پیسے نہیں جو اس پر برباد کرتے رہیں......؟ میرا خود ایک کمانے والا ہے اور کچھ کھانے والے۔''

بھائی جان نے نہ بھابی کو چپ کرایا نہ مجھے کوئی جواب دیا اور میں نے دُکھ سے سوچا۔

''جب سر پر ماں باپ نہ ہو تو کون چھوٹے بھائی کو پوچھتا ہے؟''

پھر بھی بھائی جان نے اس کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ لیکن اب وہ مجبور تھے۔ بھابی ان کو روک دیتی تھیں۔

اگلے روز میں نے ایک چارٹ لے کر اس کے چار حصے کئے اور

پھر ان پر لکھنا شروع کیا، یہ سوچ کر کہ وہاں تو بجلی بھی نہیں ہے۔ رات گئے اندھیرے میں وہ آتا ہے اور اندھیرے میں ہی چلا جاتا ہے، اس سفید کاغذ کو تو وہ اندھیرے میں بھی محسوس کر ہی لے گا۔

میں نے مضمون سوچنا شروع کیا اور ہر حصے پر منشیات کے خلاف لکھ کر پرانی حویلی اکیلی ہی چلی آئی۔ کیونکہ اگلے روز تو صبح صبح مجھے لاہور جانا تھا۔

جب میں وہاں گئی تو حویلی حسب معمول خالی تھی۔ میں گوند ساتھ لے کر گئی تھی۔ جاتے ہی میں نے کام شروع کر دیا۔

اپنے سر سے اونچائی پر میں نے چارٹ لگانے شروع کر دیئے کیونکہ حویلی کا کوئی بھی دروازہ سلامت نہیں تھا اور حویلی کے صحن اور لان میں اُگی ہوئی گھاس بچے بکریوں کو چرانے لے آتے تھے اور گل کون سا سارا دن وہاں ہوتا تھا......؟ جس کا جی چاہتا وہ آتا اور چلا جاتا۔ دروازہ جو کوئی نہیں رہا تھا۔

میں مغرب کی نماز سے کچھ پہلے واپس آئی تھی کہ اس کے آنے سے پہلے ہی کوئی ان کو پھاڑ نہ دے۔ جب میں آخری چارٹ لگا رہی تھی تو میرے پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں سمجھی شاید بشریٰ میری تلاش میں آئی ہے۔ گل کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بشریٰ نے کہا تھا کہ وہ رات گئے آتا ہے۔ میں نے اپنے کام سے فارغ ہو کر تمام چارٹ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیوں بشریٰ......! کیا یہ تمہارے چچا کو نظر آ جائیں گے......؟''

''تمہارے خیال میں میں اندھا ہوں جو ان کو نہ دیکھ سکوں گا؟''

کسی نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

''ارے......!''

میں گھبرا کر مڑی تو دروازے کے بیچوں بیچ وہ کھڑا تھا۔

باہر اندھیرا چھا رہا تھا اور اندر وہ مجھے اپنی سانپ جیسی چمکتی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ میں نے جلدی سے جانے کے لئے قدم اُٹھایا تو وہ دبے دبے لہجے میں بولا۔

"وہیں رُک جاؤ......!"

مارے خوف کے میرا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ دو لمبے ڈگ بھر کے میرے قریب بھی آ گیا۔ ایک نظر مجھے دیکھا اور زہر خند لہجے میں کہا۔

"اچھا تو یہ دیواروں پر بھی تم ہی لکھ کر گئی ہو گی......؟"

وہ اس وقت ذرا بھی نشے میں نہیں لگ رہا تھا نہ ہی آج اس دن والی کمزوری تھی، نہ ہی وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نظر اُٹھا کر اس کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں مگر سرخ انگاروں جیسی۔ میں نے کانپ کر نظر جھکا لی۔ اس نے ٹارچ روشن کر کے اس کا رُخ میرے چہرے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں لکھا ہے یہ سب تم نے......؟"

میں خوف سے کانپ گئی مگر جواب نہ دے سکی۔

"جواب دو......!"

وہ سخت لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے بمشکل کہا۔

"بھائی جان آپ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔"

"ہونہہ......! پریشان......؟ وہ تو اس انتظار میں ہیں کہ کب مجھے موت آئے اور کب وہ اس حویلی کی زمین پر قبضہ کر لیں۔"

"بھائی جان ایسے نہیں ہیں۔"

میں نے اس کی غلط سوچ پر دُکھ سے کہا۔

"اونہہ......! وہ میرا بھائی ہے۔ اس کو میں جانتا ہوں۔ خیر......! تم اپنی کہو......! تم کون ہوتی ہو یہاں یہ سب لکھنے والی......؟"

اس کا لہجہ ایک بار پھر بہت سخت ہو گیا۔

"وہ...... دیکھئے......نشہ کرنا بری بات ہے۔"

میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"جانتا ہوں......!"

اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تم اپنی کہو......!"

اس نے پھر وہی بات دُہرائی۔

"وہ...... یہ...... مجھے آپ کی حالت دیکھ کر بہت دُکھ ہوا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ پھر پہلے کی طرح اچھے ہو جائیں۔"

میں نے ہمت کر کے کہنا شروع کیا۔

"رات بشریٰ نے آپ کی ایک پرانی تصویر دکھائی تھی، اس کو دیکھ کر مجھے اور بھی دُکھ ہوا۔ وہ عورت جس نے آپ کا سکون برباد کیا، خود تو آرام سے کہیں اور زندگی بسر کر رہی ہے اور آپ......؟

پلیز......! آپ یہ سب کچھ چھوڑ دیں۔ پلیز......!"

نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، جب کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔

پھر ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی۔ کتنی دیر دیکھتا رہا پھر اچھا۔

"تم ایسا کیوں چاہتی ہو......؟"

اب کی بار اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ شاید میری آنکھوں کی نمی نے اسے متاثر کیا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں لیکن میں آپ کو اچھا آدمی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں بہت دُکھ ہوتا ہے میری حالت دیکھ کر......؟"

گل نے اچانک پوچھا۔

اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ پھر

پوچھا۔

"گویا تمہیں مجھ سے بہت ہمدردی ہے......؟"

اور میں نے پھر سر ہلا دیا۔

"ہمدردی ہے یا محبت بھی......؟"

اس نے ایک دم کہا اور میں نے جلدی سے سر ہلا دیا لیکن اگلے ہی لمحے مجھے خیال آیا۔

"یہ میں نے کیا کہہ دیا......؟ کیا مجھے ایسا کہنا چاہیئے تھا......؟"

مگر میں آگے سوچ ہی نہ سکی۔ کیونکہ گل نے ٹارچ بند کر کے جیب میں ڈال لی اور پھر اس کا چہرہ میرے چہرے پر جھک آیا۔ اس کے لبوں نے میری پیشانی کو اچانک چھو لیا۔

میں گھبرا کر فوراً پیچھے ہٹ گئی مگر میری پیشانی پر وہ اپنی محبت کی مہر ثبت کر چکا تھا۔

باہر شام کا اندھیرا گہرا ہوتے ہوئے رات میں ڈھل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے جلدی سے جانے کے لئے قدم اُٹھایا تو اس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

اب تو مجھے اس سے خوف آنے لگا تھا۔ رات ہو رہی تھی۔ حویلی پہلے ہی آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی اور وہ میرے ساتھ کوئی سا بھی سلوک کر سکتا تھا۔

اس نے ٹارچ کی روشنی ایک بار پھر میرے چہرے پر ڈالی اور میں مارے خوف کے کانپنے لگی۔

گھر میں کسی کو بتا کر بھی نہیں آئی تھی۔

"کیا تم دل سے چاہتی ہو کہ میں نشہ چھوڑ دوں......؟"

اس کی آواز اُبھری۔

"جی...... جی......!"

میں نے جان چھڑانے کے لئے جلدی سے کہا ورنہ جی تو چاہ رہا
کہ صاف کہہ دوں۔

"جہنم میں جاؤ......! چھوڑو یا نہ چھوڑو، مگر مجھے جانے دو......!"

لیکن میں ایسا سوچ سکتی تھی، کہہ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ وہ میرا راستہ
ے کھڑا تھا۔

"اچھا......! نشہ چھوڑ دوں گا، مگر ایک شرط پر......!"

"جی......؟ وہ کیا......؟"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ ایک بار پھر میرے بہت قریب آ گیا
ں نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سوچا۔

"پتا نہیں، آج میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے......؟"

اس وقت میری ساری ہمدردی نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں......؟

"دیکھو......! آنکھیں کھولو......!"

اس کی آواز ذرا دُور سے آئی۔ میں نے ہاتھ ہٹا لئے تو گل نے

"تم ڈر کیوں رہی ہو......؟ دیکھو......! مجھے غلط مت سمجھو......! تم
ے لئے اس چارٹ کی تحریروں میں زندگی کا پیغام لے کر آئی ہو۔
ے پاس کچھ نہیں، جو تمہاری ہمدردی یا اس محبت کی نذر کرتا، جو تمہیں پہلی ملاقات کی نشانی کے طور پر ہمیشہ یاد رہتا۔ اس لئے میں نے
رے ماتھے پر ایک انمٹ نشانی ثبت کر دی ہے تاکہ تمہیں یہ یقین رہے
میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

اچانک باہر سے بشریٰ اور زاہد کی آواز سنائی دی تو میں نے گل
کہا۔

"پلیز......! مجھے جانے دو......!"

لیکن اس نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے جلدی سے کہا۔

"باقی باتیں کل......!"

اور جلدی سے باہر نکل آئی۔ جب میں گھر آئی تو لاہور سے بھیا جی آچکے تھے۔

"بھیا جی......! آپ کب آئے......؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے......!"

بھیا جی نے جواب دیا اور میں اندر چلی گئی۔

ساری رات میری آنکھوں میں کٹی۔ میں صرف گل کے بارے میں سوچتی رہی کہ لاہور جا کر کسی اچھے سے ڈاکٹر سے بات کروں گی۔ ہوسکتا ہے ماحول بدلنے سے، دوست بدلنے سے وہ اچھا ہو جائے۔ ویسے بھی آج تو وہ کسی طور نشہ باز نہیں لگ رہا تھا۔ کتنی اچھی طرح وہ میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس کا محبت بھرا انداز یاد کر کے میں مسکرا دی۔ اس وقت میرے دل اور سوچوں میں صرف اور صرف گل تھا۔

اگلی صبح بھیا جی جانے کے لئے تیار تھے۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں نے تو آج گل سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے بشریٰ سے کہا۔

"سنو......! اگر تمہارے چچا میرے بارے میں پوچھیں تو کہنا، میں ان کو خط لکھوں گی اور بہت جلدی آنے کی کوشش کروں گی اور وہ بھی اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے نشہ چھوڑ دیں۔ میں ان سے ملنے پھر آؤں گی۔ بس وہ نشہ چھوڑ دیں اور اگر میں خود نہ آئی تو ان کو لاہور بلاؤں گی۔ میرا ان سے وعدہ ہے۔"

پھر میں لاہور آگئی۔

لاہور آ کر کچھ دن وہ مجھے بڑی شدت سے یاد آتا رہا لیکن پھر یہ ہوا کہ کالج کی ہنگامہ خیز زندگی میں، میں اس کو بھول گئی۔ حد تو یہ تھی کہ اپنی

ں پر ثبت میں اس کے پیار کی پہلی نشانی بھی بھول گئی۔ جذبوں میں جو
ہمدردی کی شکل میں پیدا ہوئی تھی، وہ سب ختم ہوگئی۔ حتیٰ کہ مجھے گل کا
تک نہ آیا حالانکہ گھر میں ایبٹ آباد والوں کا اکثر ذکر ہوتا تھا۔

کالج کے بعد پھر یونیورسٹی، اسی دوران بھائی جان دو چار بار
آباد سے لاہور آئے بھی مگر مجھ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ تب میں کراچی
ی، باجی کے پاس۔ اور گل کا خیال مکمل طور پر میرے ذہن سے نکل
ا۔

ایم اے کے ایگزام سے میں فارغ ہوئی تو سوچا اب تفریح اور
کے لئے کہاں جاؤں......؟ تب بھیا جی نے کہا۔

"ایبٹ آباد چلی جاؤ......! بھابی نے بہت بار تمہارے بارے میں
تھا۔"

اور یوں میں ایک بار پھر یہاں موجود تھی اور بہت سالوں بعد مجھے
کا بھی خیال آیا۔

"پتا نہیں وہ اب بھی نشہ کرتا ہے......؟ یا مجھ سے کئے گئے وعدے
طابق چھوڑ چکا ہے......؟ اونہہ......! ایسے لوگ اگر نشہ چھوڑ دیں تو مسئلہ
ہے......؟"

نشہ کسی بھی غصہ کا یا مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ بہت سال بعد مجھے اپنی
ردی اور حماقت بھری محبت یاد آئی اور میں مسکرا دی۔ یہ سوچ کر کہ یہ
کی عمر بھی کتنی جذباتی ہوتی ہے۔

"بھلا مجھے وہ سب کرنا چاہئے تھا جو اس وقت میں نے گل کے
کیا۔ اب اگر گل میرے آنے کا سن کر یہاں مجھ سے ملنے آگیا تو میں
روں گی......؟"

یہ سوچ کر میں پریشان ہوگئی تھی۔

شام کو میں نے بشریٰ سے کہا۔

''ارے بھئی......! تمہارے چچا کہاں ہوتے ہیں آج کل......!
موصوف نشہ چھوڑ چکے ہیں یا اب بھی شوق فرماتے ہیں......؟''

''کیوں......؟ آج چھ سال بعد ہمدردی جاگ رہی ہے......؟''

بشریٰ نے تلخی سے کہا۔ میں اس کے لہجے پر چونک پڑی اور دل میں سوچا۔

''بشریٰ نے واقعی صحیح کہا ہے۔''

میں نے گل سے معذرت کرنے کا سوچتے ہوئے کہا۔

''چلو بشریٰ......! پرانی حویلی چلتے ہیں۔''

''کیوں......؟ ملنا ہے پھر چچا سے......؟''

بشریٰ نے پہلے والے لہجے میں کہا۔

''ہاں......! ملنا ہے۔''

میں نے بھی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''وہ اب وہاں نہیں رہتے۔''

کہتے کہتے بشریٰ چپ ہوگئی۔

''اچھا......! تو پھر کہاں رہتے ہیں......؟''

میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''آیئے......! لے چلوں۔''

بشریٰ چل پڑی۔ راستہ وہی تھا، پرانی حویلی کا۔ قبرستان کے بیچ بیچ پہنچ کر بشریٰ رُک گئی۔

''چلو بھئی......! رُک کیوں گئی ہو......؟''

میں نے جلدی سے کہا۔ قبروں سے مجھے ہمیشہ سے بہت خوف تھا حالانکہ ہماری آخری آرام گاہ یہی ہے۔ مگر دُنیا کی زندگی میں ہمیں اس خیال تک نہیں آتا۔

''چچا سے نہیں ملنا......؟''

بشریٰ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''وہ یہاں، کہاں......؟''

میں نے حیران ہوکر کہا۔

''وہ اب یہیں رہتے ہیں۔''

بشریٰ ایک قبر کے قریب بیٹھ گئی۔

''کیا مطلب......؟''

میں کچھ سمجھی، کچھ نہیں۔ لیکن اچانک میری نظر اس قبر کے کتبہ پر
جہاں بشریٰ بیٹھی تھی اور میرے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ گل
م صاف لکھا تھا ادھر بشریٰ کہہ رہی تھی۔

''چچا نے آپ کو بہت یاد کیا۔ وہ جب تک زندہ رہے آپ کو یاد
تے رہے۔''

پھر اس نے ایک کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''ان کے کمرے کی دیواروں پر اور زمین پر صرف یہی جملہ لکھا ہوا
اس کو پڑھ لیجئے۔ آپ کو اگر جا کر یہی روّیہ اختیار کرنا تھا تو چچا جان
ھر آنے کا یا ان کو بلانے کا وعدہ کیوں کیا تھا......؟''

میں نے بشریٰ کی باتوں اور نظروں سے بچنے کے لئے کاغذ کے
ے پر نظر ڈالی۔ لکھا تھا۔

''ایک بار جا کے تم آئے نہیں، میں ڈھونڈتا رہا۔''

ایک دم ہی میرے اندر باہر درد ہی درد پھیل گیا۔ وہ درد جو میں گل
ولی میں ڈال کر گئی تھی۔ ایک عورت کے بعد دوسری عورت نے بھی
ے ساتھ وہی سلوک کیا تھا۔ ایک عورت نے اس کی زندگی کو برباد کیا،
نے ختم کر دیا۔

میں نے طویل آہ بھر کر قبر پر ایک نظر ڈالی اور بشریٰ نے پھر کہا۔

''آپ کے جاتے ہی انہوں نے نشہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تو وہ

آپ کے خط کا، آپ کے آنے کا انتظار کرتے رہے لیکن جب آپ نہ خود آئیں، نہ خط لکھا تو پھر وہ مجھ سے آپ کے گھر کا ایڈریس مانگتے رہے۔ مگر میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہی نہیں......!"

کیونکہ مجھے امی سے ڈر لگتا تھا اور امی کے ڈر کی وجہ سے ان کو آپ کا ایڈریس بھی نہ دے سکی۔ اصل میں نشہ چھوڑنے سے ان کی حالت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ مگر وہ نشہ نہ کرنے کے وعدے پر قائم تھے۔ پھر آپ کے انتظار ہی میں، چند ماہ بعد وہ چل بسے۔ آخری وقت بھی ان کے منہ پر آپ ہی کا نام آپ ہی کا ذکر تھا۔"

میں نے تڑپ کر قبر پر نظر ڈالی اور بشریٰ سے کہا۔

"میں نے ابا کو منع کر دیا تھا کہ وہ آپ کو چچا کی موت کے بارے میں نہ بتائیں۔"

بشریٰ چپ ہو کر دُعا پڑھنے لگی۔ وہ اب پہلے والی چھوٹی سی بشریٰ تو نہ تھی۔

میں نے دُکھ سے قبر کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"صرف چند ماہ انتظار کیا تم نے گل......! لوگ تو محبت کے انتظا میں صدیاں گزار دیتے ہیں......؟ مگر تم اتنی جلدی ناراض ہوگئے......؟"

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور جب بشریٰ نے کہا۔

"چلو پھپھو......! اب چلتے ہیں۔"

تو میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے ہوئے میں نے آخری بار قبر پر ن ڈالی اور دُکھ سے سوچا۔

اِک ذرا سی بات تھی لیکن تمام عمر
وہ مجھ کو جاگنے کی سزا دے کے سو گیا



ایثار

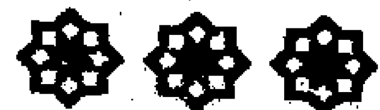
اسپتال کی بلند و بالا عمارت میں اس وقت سکوت طاری تھا۔ نائٹ اٹینڈ کرنے والی نرسیں خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھیں۔ اسی ں کے ایک وارڈ میں ایک مریضہ ایسی بھی تھی جو ابھی تک جاگ رہی اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے دو دن کے ننھے ٹیپو پر نظریں جمائے وہ ں کی بجائے ماضی اور حال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اپنی محویت سے اس بات کا بھی احساس نہ ہو سکا کہ ڈاکٹر شہباز اس کے قریب ے ہیں۔

"اب کیسی طبیعت ہے......؟"

ڈاکٹر کی آواز پر وہ چونک پڑی۔

"ٹھیک ہوں ڈاکٹر......!"

اس نے آہستہ سے کہا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ پھر اپنی ں میں کھو گئی۔ اسپتال کے وارڈ میں لیٹے لیٹے اسکے ذہن کے اُفق پر کی دُھندلی سی تصویر اُبھر رہی تھی جو دھیرے دھیرے واضح ہوتی گئی۔



صبح کالج جاتے ہوئے اور کالج واپس آتے ہوئے اس کی گاڑی
ہمیشہ لبرٹی مارکیٹ سے گزرتی تھی۔ وہ چند دنوں سے وہاں کچھ تبدیلی محسوس
کر رہی تھی اور وہ تبدیلی رؤف کلاس ہاؤس میں واقع ہوئی۔

تبدیلی یہ تھی کہ کاؤنٹر پر ایک شخص روزانہ اپنے سر کو پٹیوں سے
نئے نئے انداز میں جکڑ کر بیٹھا نظر آتا تھا۔ روبینہ نے پہلے تو کوئی اہمیت نہ
دی، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ سنجیدہ ہوگئی۔ اسے اشتیاق ہوا
کہ کاش وہ اس لڑکے سے بات کرے اور پوچھے کہ یہ تم فلمی ہیرو کی طرح
اپنے سر کو نئے نئے انداز میں کیوں باندھا کرتے ہو......؟ مگر وہ کوشش کے
باوجود نہ پوچھ سکی۔

اس دن وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکنک منانے جا رہی تھی کہ
اچانک اس کی نظر اس پر پڑی اور وہ اپنی سہیلی شیبا کو ٹھوکا دے کر بولی۔

”دیکھو شبو......! یہ اپنے سر کو نئے نئے انداز میں پٹیوں سے جکڑ
رہتا ہے۔ عجب سوانگ رچا رکھا ہے۔“

اور پھر جب گاڑی اس کے قریب سے گزری تو روبینہ نے فقرہ
چست کیا۔

”ہائے رے......! بے چارہ ہیرو......!“

روبینہ کے چوٹ کرنے پر وہ چونک کر اس کی طرف مڑا اور رو
زن سے گاڑی لے نکلی۔

دوسرے دن کالج سے واپسی پر اس نے دیکھا کہ وہ کاؤنٹر پر نہیں
تھا۔ پھر بہت دنوں تک وہ روبینہ کو نظر نہ آیا۔ مگر پھر ایک دن وہ پھر وہاں
موجود تھا۔ اس بار وہ پہلے سے بھی زیادہ اَپ سیٹ نظر آ رہا تھا۔ رو
چاہنے کے باوجود اس پر کوئی طنز نہ کر سکی۔

نہ جانے کیا سوچ کر اس کے کلاتھ ہاؤس میں چلی آئی۔ وہ

رح کاؤنٹر پر بیٹھا تھا اور اس کا کوئی دوست کاؤنٹر پر جھکا اس سے
کر رہا تھا۔ روبینہ جان بوجھ کر کاؤنٹر کے سامنے رُک گئی۔ مگر وہ اس کی
متوجہ تک نہ ہوا اور تب ہی اس کے دوست کی بات سن کر روبینہ
اُٹھی جو کہہ رہا تھا۔

”یار......! آپریشن کیسا رہا......؟“

”ناکام......!“

رؤف سنجیدگی سے بولا۔

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اس بارے میں......؟“

”ان کا خیال ہے اب میں زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہوں گا۔“

رؤف افسردگی سے بولا۔

”اور پھر یار......! اچھا ہی ہے، جتنی جلدی موت آجائے۔ خواہ
ھر والوں کے لئے بھی پریشانی کا باعث بن رہا ہوں۔“

اس کے لہجے میں حد سے زیادہ مایوسی تھی۔

”رؤف......! امریکہ کیوں نہیں چلے جاتے......؟ شاید وہاں......“

”نہیں امجد......!“

رؤف اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”دماغ کے کینسر کا علاج کہیں بھی نہیں......!“

”اُف......!“

روبینہ کو چکر سا آگیا۔ وہ نہ جانے اپنے دوست سے کیا کیا باتیں
ا تھا، پھر اس کا دوست چلا گیا۔ اس نے سر اُٹھا کر روبینہ کی طرف
اس کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم بکھر گیا۔

”فرمائیے......!“

اس نے روبینہ کو بیٹھنے کی پیش کش کرتے ہوئے کہا۔ دُکان میں
ت کافی بھیڑ تھی، اس لئے کوئی بھی ان دونوں کی طرف متوجہ نہ تھا۔

روبینہ نے اس کے پاس رُکنے کے بجائے اندر آ کر اپنے لئے دو سوٹ پسند کئے اور بل ادا کر کے فوراً چلی آئی۔

کالج سے واپسی پر روبینہ نے دیکھا۔ وہ لائٹ بلو شلوار سوٹ میں بے حد جچ رہا تھا۔

''ہیلو......!''

روبینہ نے گاڑی روک کر کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا۔ رؤف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے حیرت اُبھری مگر دوسرے ہی لمحے وہ ایک نارمل انسان کی طرح بولا۔

''ہیلو......!''

''کیا خیال ہے، آج تھوڑا سا سیر سپاٹا نہ کیا جائے......؟''

روبینہ اس کی حیرت کو نظر انداز کرتی ہوئی بولی۔

''جی......؟''

وہ حیران ہو کر بولا تو روبینہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر گاڑی کا درواز کھولتے ہوئے بولی۔

''آیئے ناں......!''

''مگر کیوں......؟ ہم آپس میں دوست تو نہیں......؟''

اس کا لہجہ خشک تھا۔

''نہیں ہیں تو کیا ہوا......؟ ہو جائیں گے۔''

روبینہ کے اصرار پر وہ خاموشی سے آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ رو گاڑی کو سیدھا ہلٹن ہوٹل لے آئی۔

''کہئے......! کیا پینا پسند کریں گے......؟''

روبینہ نے پوچھا تو وہ اسے صرف دیکھتا رہ گیا، بولا کچھ نہیں۔

''میرے خیال میں ٹھنڈا ٹھیک رہے گا......؟''

روبینہ خود ہی بولی۔

''آپ کا نام......؟''

روبینہ نے پوچھا۔

''کمال ہے......!''

وہ حیرت سے بولا۔

''آپ مجھے یہاں تک لائی ہیں اور میرا نام بھی نہیں جانتیں......؟''

''جانتی ہوں۔''

روبینہ مسکرائی۔

''آپ رؤف ہیں ناں......؟ اور میں روبینہ......!''

''شکریہ......!''

رؤف نے کہا۔ اتنے میں ویٹر دو کوک لے آیا۔

''آپ ہمیشہ اپنے سر کو پٹیوں سے کیوں باندھ کر رکھتے ہیں......؟''

روبینہ آخر اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے بولی۔

''آپ پوچھ کر کیا کریں گی......؟ بہرحال آپ کے اصرار کرنے سے قبل ہی میں بتائے دیتا ہوں کہ میرے دماغ میں کینسر ہے۔ اس لئے مجھے بقول آپ کے ہیرو بننا پڑتا ہے۔''

روبینہ کی کہی ہوئی بات اس نے اسی کو لوٹا دی۔

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں......؟''

روبینہ نے فوراً بات بدل دی۔

''ڈاکٹر کہتے ہیں، اب میں زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ تیسرا اور آخری آپریشن بھی ہو چکا ہے۔''

''پھر بھی رؤف صاحب......! خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہونا

پاہئے۔ آپ اُداس نہ رہا کریں۔''

''مس روبینہ......! جب آپ کے سامنے آپ کی موت ہو تو آپ کوشش کے باوجود مسکرا نہیں سکیں گی۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو، یہ نائیں......! مجھے یہاں کیوں لائی ہیں......؟''

''ارے......! آپ نہیں جانتے......؟ آپ کو یہاں لانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ بھی تھوڑی سی تفریح کر لیں......!''

''ہوں......! تو اس کا مطلب ہے آپ کو مجھ سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ مگر یاد رکھیں مس روبینہ......! مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ ابھی تو میں چل پھر سکتا ہوں۔ آپ اپنی یہ ہمدردی کسی اور کے لئے رکھئے......!''

''آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ہم دوست بھی تو بن سکتے ہیں......؟''

وہ سٹپٹا کر بولی۔

''معاف کیجئے گا......!''

رؤف نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں خود ہی کسی سے دوستی کرنا نہیں چاہتا۔ زندگی کا خوب صورت احساس میں خود کو دلانا نہیں چاہتا۔ میں اپنے دن عید اور راتیں شب براءت نہیں بنانا چاہتا۔ میں ایک ایسا انسان ہوں جس کی کوئی رات رنگین اور دن دلکش نہیں اور نہ ہی میں یہ چاہتا تھا کہ زندگی کیا ہے......؟ کیونکہ اب میں صرف اور صرف موت کا انتظار کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اس جہاں میں ابھی بہت سے لوگ ملیں گے مگر خدا کے لئے یہ جو دو دن میری زندگی کے ہیں، انہیں کانٹوں کی سیج نہ بنائیے......!''

رؤف چلا گیا اور روبینہ وہیں بیٹھی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

کافی دیر بعد جب وہ وہاں سے اُٹھی تو مستقبل کا اہم فیصلہ کر چکی تھی۔

''ممی...... ! آپ میری شادی کی بات کر رہی ہیں ناں......؟''

روبینہ نے ماں سے کہا۔ وہ لوگ سہ پہر کی چائے پی رہے تھے۔

''میں نے اپنے لئے ایک لڑکا پسند کر لیا۔''

روبینہ نے سر جھکا کر کہا۔

''کون ہے وہ......؟ اور کیا کرتا ہے......؟''

ماں نے یوں پوچھا جیسے روبینہ نے ایک عام سی بات کی ہو۔ اس پر بینہ نے تفصیل سے انہیں رؤف کے بارے میں بتایا تو وہ چلاّ اُٹھی۔

''نہیں روبی......! یہ ناممکن ہے۔ تمہاری شادی اس چند دن کے ان سے نہیں ہو سکتی۔''

''مگر امی......! شادی مجھے کرنا ہے، کسی اور کو نہیں......! اور میں لہ کر چکی ہوں۔''

روبینہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہمیں تمہارے فیصلے کی ضرورت نہیں۔ ہوگا وہی جو ہم چاہیں ۔ بہتر ہے کہ تم اس خام خیال کو دل سے نکال دو۔ یہ ایک ناممکن سی ت ہے۔''

ماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''امی......! انسانیت کے رشتے سے سوچئے، اسے بھی تو جینے کا حق ے۔''

روبینہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''ہم کون سا اس کے جینے کا حق چھین رہے ہیں۔ ہم تو یہ کہہ ہتے ہیں۔ مرتے مرتے وہ تمہاری زندگی کیوں برباد کرنا چاہتا ہے......؟ اسے شادی کا اتنا ہی شوق ہے تو سینی ٹوریم سے اپنے جیسی کسی لڑکی کا اب کر کے لے آئے۔'' ان کے لہجے میں ذرا سا بھی رحم نہ تھا۔

''ممی......! وہ مجھ سے نہیں، بلکہ میں اس سے شادی کرنا چاہتی ں۔ زندگی انسان کو ایک بار ملتی ہے اور ہمیں چاہئے کہ ہم اس زندگی میں

کوئی ایسا کام کر جائیں جس سے دُنیا ہمیں تاقیامت یاد رکھے......!''

وہ ایک خاص عزم کے ساتھ بولی۔

''ٹھیک ہے......! تم اس لڑکے سے بات کرو۔ ہمیں یقین ہے وہ اتنا خودغرض نہیں ہوگا کہ تمہاری زندگی برباد کر دے۔''

''اور اگر وہ شادی کے لئے رضامند ہوگیا تو......؟''

روبینہ یوں مسکرائی جیسے اسے پختہ یقین ہو کہ وہ رضامند ہو جائے گا۔

''تو ٹھیک ہے......! ہم تمہاری شادی اس سے کر دیں گے۔''

روبینہ کی والدہ نے کہا۔ ان کا خیال تھا وہ لڑکا روبینہ سے ہرگز شادی نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ تو خود موت کے دھانے پر کھڑا تھا اور ایسے میں وہ کسی کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش نہیں کر سکتا۔

فرنچ کا پرنٹڈ سوٹ پہن کر روبینہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی ہلکا پھلکا میک اَپ کر رہی تھی۔ آج وہ خود کو خاص طور پر سجانا چاہتی تھی۔ اچھی طرح ڈریس اَپ ہو کر وہ رؤف کی طرف روانہ ہوئی۔ رؤف اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا مطالعہ میں غرق تھا۔

''ہیلو......!''

روبینہ نے گاڑی روک کر زور سے کہا۔ اس نے چونک کر روبینہ کی طرف دیکھا اور مبہوت سا دیکھتا رہ گیا۔ وہ شعلہ قیامت بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''آپ اپنا تھوڑا سا وقت مجھے دے سکتے ہیں......؟''

روبینہ نے نہایت پیار سے کہا۔

''سوری......!''

رؤف نے بے رُخی سے کہا۔

''رؤف......! پلیز......!''

روبینہ نے منت کی مگر اس پر بے اثر ثابت ہوئی۔

''دیکھئے رؤف صاحب......! مجھے آپ سے بے حد ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

''میں نے کہا ناں......! میرے پاس وقت نہیں......!''

رؤف نے جھلا کر جواب دیا تو روبینہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اوکے......! جب آپ کو وقت ملے گا تب چلے جائیں گے۔ کیوں......؟ ٹھیک ہے ناں......؟''

''دیکھئے مس روبینہ......! میں آپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔''

رؤف نے دانت پیس کر کہا۔

''تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں......؟''

روبینہ نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔ رؤف نے اس سے اُلجھنا پسند نہ کیا اور خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

روبینہ نے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی گاڑی کا رُخ باغبانپورہ کی طرف موڑ دیا۔ گاڑی شالیمار کے سامنے رُکی اور روبینہ نے دو ٹکٹ لئے۔ پھر دونوں اندر داخل ہوگئے۔

روبینہ کا خیال تھا کہ انہیں شالیمار کے علاوہ اور کہیں سکون نہیں مل سکتا۔ مغلیہ دور کا یہ وسیع باغ تین حصوں میں تقسیم تھا اور سکون حاصل کرنے والے افراد اکثر یہاں کا ہی انتخاب کرتے۔

روبینہ رؤف کا ہاتھ تھامے باغ کے آخری حصے کی طرف چلی آئی اور اپنے لئے ایک ایسی جگہ تلاش کی جہاں سے وہ تو ہر آنے جانے والے کو دیکھ سکتے تھے مگر ان دونوں پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

''یہاں بیٹھنے کا مطلب......؟''

رؤف نے ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو روبینہ ہنستے

ہوئے بولی۔

''آپ لڑکی تو نہیں جو یوں ڈر رہے ہیں......؟''

رؤف عجیب سے شش و پنج کے عالم میں بیٹھ تو گیا مگر یوں لگتا تھا جیسے موقع ملتے ہی بھاگ کھڑا ہوگا۔ روبینہ بات کرنے کی بجائے اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

گارڈن کے اس آخری حصے میں سکوت تھا۔ عام دنوں میں یہاں صرف بچے اور جوان جوڑے ہی آتے۔ روبینہ ابھی تک اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ اچانک وہ بھڑک اُٹھا۔

''مس روبینہ......! میرا اور آپ کا مذاق کا کوئی رشتہ نہیں......! بہتر ہوگا جو کہنے کے لئے آپ مجھے یہاں لائی ہیں، وہ کہہ دیجئے......!''

''کل آپ نے کہا تھا ناں کہ ہم دوست نہیں بن سکتے......؟ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم باقاعدہ دوست نہیں بن سکتے تو کیا ہوا......؟ ایک بامقصد بندھن میں تو بندھ سکتے ہیں......؟ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں......؟''

روبینہ کی اتنی بڑی بات پر وہ اسے ششدر سا دیکھتا رہ گیا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تم نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے......؟''

''ہاں......!''

روبینہ کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

''مگر میں کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔''

وہ چیخ پڑا۔

''کیوں نہیں کرنا چاہتے......؟''

جواباً روبینہ نے بھی چیخ کر کہا تھا۔

''تم نہیں جانتی، میری زندگی......''

''رؤف......! پلیز......! میں سب کچھ جانتی ہوں۔''

''اور اس کے باوجود بھی......''

''ہاں......! اس کے باوجود بھی۔''

روبینہ کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔ رؤف کچھ لمحوں کے لئے تو خاموش ہوگیا۔ مگر جب وہ دوبارہ بولا تو اس کی آواز نارمل تھی۔

''سنو روبینہ......! میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔ تم اگر ترس ہی کھانا چاہتی ہو تو کسی اندھے، لولے، اپاہج سے شادی کرو۔ میں تو کچھ دنوں کا مہمان ہوں۔ مجھ سے شادی کر کے زیادہ ثواب حاصل نہ ہوگا۔''

''رؤف......! خدا کی قسم......! میں آپ پر ترس نہیں کھا رہی۔ میں تو آپ کو چاہتی ہوں۔ آپ کے قدموں میں اگر چار دن تو کیا، چار لمحے کے لئے بھی جگہ ملے تو میں سمجھوں گی کہ میں نے اپنا مقصد پالیا۔''

''روبینہ......! خدا کے لئے مجھے یہ احساس نہ دلاؤ کہ میں زندگی کی خوشیوں سے محروم ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

کہتے ہوئے رؤف اُٹھ کھڑا ہوا۔

''رؤف......! پلیز......!''

روبینہ پھوٹ کر رو دی۔

''مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔ مجھے یوں نہ ٹھکراؤ......! اپنا لو مجھے......! پلیز......!''

''مجھے افسوس ہے روبینہ......!''

رؤف نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ اس پاگل معصوم لڑکی کی خواہش پوری کر کے اس کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خود تو وہ مر کر ہر دُکھ سے نجات پا لیتا، مگر اسے ہمیشہ کے لئے دُکھوں کی بھٹی میں جلنے کے لئے چھوڑ جاتا۔

''ٹھیک ہے رؤف......!''

روبینہ آنسو پونچھتے ہوئے اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

''مجھ سے شادی مت کرو۔ چلو میں تمہیں ڈراپ تو کر دوں......!''

رؤف کچھ کہنے کی بجائے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

روبینہ نے انجن اسٹارٹ کیا اور پھر گاڑی کی رفتار میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتی گئی۔ ایک دوسری گاڑی کو اوورٹیک کرتے ہوئے گزری تو رؤف چیخا۔

''آخر تم چاہتی کیا ہو......؟''

''کچھ نہیں......!''

وہ خوفناک ہنسی ہنس دی۔

''آپ گھبرا کیوں رہے ہیں......؟ آپ کو آج نہیں تو کل تو مرنا ہی ہے۔ پھر آج ہی سہی......!''

''مجھے اپنی پرواہ نہیں......! میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ کسی دوسرے کی جان کیوں ضائع ہو......؟''

وہ خوفزدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''ہونہہ......! بڑی ہمدردی ہے دوسروں سے......؟''

روبینہ زہریلی ہنسی کے ساتھ بولی۔

''ٹھیک ہے......! میں شہر سے باہر کا رُخ کر لیتی ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے روبینہ نے گاڑی کا رُخ شہر سے باہر کی جانب جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ رفتار بتانے والی سوئی نوے کے ہندسے کو چھونے لگی تو رؤف بولا۔

''پلیز روبینہ......! تم کہو تو میں خودکشی کر لیتا ہوں مگر تم اپنی جان کی دُشمن کیوں بن رہی ہو......؟''

''آپ سے مطلب......؟ جان میری ہے کہ آپ کی......؟ میں نے آج مرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کوئی مجھے روک نہیں سکتا۔ آپ کی بلا سے

زندہ رہوں یا مروں......؟''

رؤف کا ذہن اب تیزی سے سوچ رہا تھا۔ زندگی بھر کے دُکھ
ے سے تو بہتر ہے کہ یہ یوں ہی مر جائے۔

اچانک گاڑی زمین سے اُچھلی تو رؤف کی سوچوں کا جال بکھر گیا۔
ی اب اونچی نیچی جگہوں پر بار بار اُچھل رہی تھی جس کا مطلب تھا
ی کسی وقت بھی اُچھل کر گر سکتی ہے۔ روبینہ اب ونڈ اسکرین پر دیکھنے
بجائے رؤف کو دیکھ رہی تھی۔

''روبینہ......! پلیز......! سامنے دیکھو......!''

وہ چیخا۔ رؤف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے......؟

''کیوں......؟ جب مرنا ہی ہے تو سامنے دیکھوں یا آپ کو......؟
ہی بات ہے......!''

وہ جو اتنی دیر سے محض اس لئے خاموش تھا کہ اس کے مرنے کے
بد روبینہ کیا کرے گی......؟ مگر اب کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ گاڑی ایک
رخت کو اوورٹیک کرتے ہوئے گزری تو رؤف روبینہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے
لا۔

''ٹھیک ہے روبی......! جیسے تم چاہو گی ویسے ہی کروں گا۔''

''سچ......؟''

کہتے ہوئے روبینہ نے فوراً بریک لگائے۔ گاڑی اُلٹتے اُلٹتے
ی۔ روبینہ اور رؤف کے سر ڈیش بورڈ سے ٹکرائے۔ کچھ دیر کے لئے
ونوں کو کوئی ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو روبینہ، رؤف کے سر پر سر ٹکائے گہری
گہری سانسیں لے رہی تھی۔ رؤف بے حس بیٹھا ونڈ اسکرین کے ساہر دیکھ
ہا تھا۔

''رؤف......!''

روبینہ نے گلوگیر آواز میں پکارا تو اس نے جھک کر روبینہ کی طرف

دیکھا۔ روبینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور رؤف کچھ سوچنے کی بجائے اس پر جھک گیا۔

واپسی پر روبینہ ازحد مسرور تھی۔ رؤف کو ڈراپ کر کے وہ گھر آئی تو ماں منتظر تھی۔ روبینہ بغیر کسی تمہید کے بولی۔

''امی......! آپ اپنا وعدہ پورا کیجئے......! وہ شادی کے لئے رضامند ہوگئے ہیں۔ آپ لوگ شادی کی تیاری کیجئے......! آج شام کو ان کے والدین آ رہے ہیں۔''

رات کو روبینہ کے ڈیڈی نے بھی اس سے بات کی مگر اس کا جواب ایک ہی تھا۔ مجبوراً انہیں رؤف کے گھر والوں کے سامنے ہاں کرنا پڑی۔

روبینہ کی سہیلیوں نے بھی اسے سمجھایا کہ اس وقت تم جذبات ہو کر سوچ رہی ہو۔ اگر وہ مر گیا تو پھر تمہیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا تم کچھ عرصہ کے لئے کہیں چلی جاؤ......!

روبینہ سب کی باتیں سن کر مسکرا دیتی اور پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا محاورہ ان پر صادق آیا۔ روبینہ نے چپکے سے بابل کا آنگن چھوڑ دیا۔

حجلہ عروسی میں جب رؤف داخل ہوا تو روبینہ نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اسے دیکھا تو رؤف اس کے دل میں اُتر گیا۔

''روبی......! آخر تم جیت گئی......!''

رؤف اس کے کانوں میں امرت گھول رہا تھا۔

''روبی......! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میری زندگی میں روشنی کی کرن بن کر آئی ہو......؟ اس سے پہلے میرے دن رات تاریک تھے۔ مگر آج تو ہر اطراف روشنیاں ہی روشنیاں ہیں۔ جیسے نور کی بارش ہو رہی ہو۔''

رؤف بول رہا تھا اور روبینہ سرشاری کے عالم میں سن رہی تھی۔

دو دن بعد ہی وہ لوگ ہنی مون منانے کے لئے پہاڑی علاقے [illegible] چلے گئے۔

چھ مہینے چھ لمحوں کی طرح گزر گئے۔ ان چھ مہینوں میں رؤف نے [illegible]سے اتنا بھرپور پیار دیا تھا کہ روبینہ کی روح تک سرشار ہوگئی تھی۔ عورت [illegible]شہ یہی چاہتی ہے۔ پیار چاہے کم ملے، مگر سچا ملے اور یہی سچا پیار روبینہ [illegible]نے حاصل کر لیا تھا۔ ان چھ مہینوں میں رؤف نے زندگی کا ایک ایک لمحہ [illegible] پر نثار کیا تھا۔

چھ ماہ جب مسرتوں کے دوش پر گزار نے کے بعد واپس آئے تو [illegible]بینہ بولی۔

''کیا خیال ہے......؟ ممی ڈیڈی کو ملنے چلیں......

''کیوں نہیں......؟''

رؤف خوش دلی سے مسکرایا۔ روبینہ بال بنا کر سینڈل پہن رہی تھی [illegible] چکر سا آ گیا۔

''کیا ہوا......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟''

رؤف نے اسے سہارا دیتے ہوئے پوچھا۔

''طبیعت کا اب کیا بھروسہ......؟ کسی لمحہ بھی خراب ہو سکتی ہے۔''

روبینہ نے ہنس کر کہا تو رؤف مسکرا دیا۔

پورٹیکو میں گاڑی لاک کر کے روبینہ، رؤف کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو گھر پر سکوت طاری تھا۔ روبینہ ٹی وی لاؤنج میں آئی تو یہاں سب لوگ چائے پی رہے تھے۔ روبینہ کو دیکھ کر کسی شخص نے بھی گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔

[illegible] نے رسمی طور پر اس کا حال پوچھا۔ روبینہ یہاں آ کر خفت سی محسوس کر رہی تھی۔ ڈیڈی رؤف سے باتیں کر رہے تھے مگر ماں نے اسے بلانا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔

پھر روبینہ کے ڈیڈی بھی کام کا بہانہ کر کے اُٹھ گئے تو روبینہ کی ماں بولی۔

"اب ڈاکٹر کیا کہتے ہیں رؤف......؟ تمہاری زندگی کتنے دن کی ہے......؟"

ماں کی بات پر روبینہ کا خون کھول اُٹھا۔ مگر رؤف بولا۔

"امی......! ان کا خیال ہے، ابھی شاید دو تین ماہ اور زندہ رہوں گا۔"

"ہونہہ......!"

روبینہ کی ماں نفرت سے ناک سکیڑ کر بولی۔

"دو تین مہینے بعد تم تو مر جاؤ گے مگر ہماری بیٹی کی زندگی تو تم نے برباد کر دی......؟"

روبینہ جو اب تک بڑے ضبط اور تحمل سے سب کچھ سن رہی تھی، اُٹھتے ہوئے بولی۔

"امی......! یہ مت بھولئے کہ رؤف میرے شوہر ہیں اور آپ کو ان کی اِنسلٹ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ کو اگر یہ فکر ستا رہی ہے کہ رؤف کے مرنے کے بعد میں آپ کے گھر آؤں گی......؟ تو یہ آپ کی بھول ہے۔ میں چاہے بھیک مانگ کر ہی گزارہ کیوں نہ کروں......؟ آپ کے در پر ہرگز نہیں آؤں گی۔"

روبینہ روتے ہوئے رؤف کا ہاتھ تھام کر وہاں سے چلی آئی۔

واپسی پر رؤف حد سے زیادہ خاموش تھا۔ گھر آ کر وہ چپ چاپ بیڈ پر لیٹ گیا۔

"رؤف......! کیا بات ہے......؟"

روبینہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

"کچھ نہیں روبی......!"

اس نے کسمسا کر کروٹ بدلی۔

"آپ ناراض ہیں......؟"

اس کی آنکھیں چھلکنے کو تیار تھیں۔

"نہیں روبی جان......!"

رؤف نے اسے خود سے قریب کر لیا۔

"تم نے تو مجھے یہ بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں چند دن کا ہمان ہوں۔ مگر میں کتنا خود غرض ہو گیا تھا۔"

اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"رؤف......! پلیز......!"

روبینہ نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اس دن کے بعد رؤف نے اپنا ٹائم ٹیبل ہی تبدیل کر لیا۔ صبح گھر سے جاتا اور رات گئے لوٹتا۔ روبینہ سارا دن کمرے میں بیٹھی بور ہوتی رہتی۔ روبینہ سب کچھ سمجھتی تھی مگر کیا کرتی......؟

آج روبینہ نے اچھی طرح تیار ہو کر رؤف کو فون کیا اور اس کی آواز پہچان کر بولی۔

"رؤف......! میری طبیعت خراب ہے اور گھر میں کوئی نہیں۔"

اور کچھ کہنے کے بجائے یوں ریسیور گرا دیا جیسے بے ہوش ہو کر گر گئی ہو اور پھر رؤف کے انتظار میں ٹہلنے لگی اور جب کچھ دیر بعد رؤف گھر میں داخل ہوا تو فوراً بیڈ پر لیٹ گئی۔

"روبی......! روبی......! جان......! کیا ہوا......؟"

پھر وہ تیزی سے فون کی طرف لپکا۔ تب ہی روبی مسکراتے ہوئے چپکے سے اُٹھی اور رؤف کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ رؤف فوراً پلٹا تو روبینہ مسکرا کر بولی۔

"کہو......! کیسی رہی......؟"

روٗف خاموشی سے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ سب ڈرامہ تھا......؟"

"جی ہاں......!"

روبینہ مسکرائی۔

"آخر آپ نے خود کو اتنا کام میں کیوں مصروف کر لیا ہے......؟امی کی باتوں کی سزا مجھے تو نہ دیجئے......!"

روبینہ اس کے کاندھوں پر سر رکھ کر سسک اُٹھی۔

"روبی......! مجھے ان کی باتوں کا غم نہیں......!"

روٗف اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"انہوں نے جو کچھ بھی کہا، درست ہی کہا......!"

"تو میں کیا کروں......؟"

روبینہ نے منہ بنایا تو روٗف ہنس دیا۔

"اچھا بھئی......! چلو......! آج تمہیں اسٹیج ڈرامہ دکھا کر لاتے ہیں۔"

روٗف کو خود ہی اپنی زیادتی کا احساس ہوگیا۔

"روبی......!"

وہ پیار سے اس کی طرف پلٹا تو روبینہ دوسری طرف منہ کئے پڑی تھی۔

"ناراض ہو مجھ سے......؟"

روٗف نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں......!"

روبینہ فوراً اُٹھ بیٹھی۔

"پھر تم نے منہ کیوں بنا رکھا ہے......؟"

وہ بیٹھتے ہوئے بولا تو روبینہ اس کے زانو پر سر رکھ کر بولی۔

"روٗف......! میں سوچتی ہوں، ہم اپنے بچے کا نام کیا رکھیں گے......؟"

"میں تو شاید اپنے بچے کو دیکھ بھی نہ سکوں......؟"

روٗف کے منہ سے بے ساختہ نکلا مگر پھر یہ سوچ کر کہ روبینہ کا دل دُکھی ہوگا، فوراً بولا۔

"روبی......! ہم اپنی بیٹی کا نام امبر روٗف رکھیں گے۔"

یہ اور بات تھی کہ روٗف کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں تھیں۔ موت کا خیال آتے ہی دل جینے کی تمنا کرتا تھا۔ جبکہ موت اسے اپنے ظالم شکنجے میں جکڑے ہوئے تھی۔

"روٗف......! مجھے بیٹی کی نہیں، بیٹے کی تمنا ہے۔ کیونکہ...... کیونکہ تمہارے بعد تمہارا نام چلانے والا کوئی تو ہو......!"

روبینہ کی آواز بھرا گئی تو روٗف اسے بہلانے کے لئے بولا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ......! پہلے کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے اور پھر ڈرامہ دیکھیں گے۔"

"چلو......!"

روبینہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ روٗف کے کہنے پر اس نے سرخ ساڑھی پہن کر ہلکا پھلکا سا زیور پہنا تو روٗف پیار سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہ بالکل دُلہن لگ رہی تھی۔ روٗف کے تصور میں اچانک سرخ ساڑھی سفید ساڑھی میں تبدیل ہوگئی تو وہ چکرا سا گیا۔ وہ بھی کتنا بدنصیب تھا۔ جس رات میں لوگ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیمانے کرتے ہیں، اس رات بھی اس نے بچھڑنے کی باتیں کی تھیں۔

اور اب ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ وہ دو تین مہینے زندہ رہ سکے گا مگر اسے تو پل کا بھی بھروسہ نہیں تھا۔

انہی سوچوں میں گم وہ روبینہ کے ساتھ گیراج میں آیا اور گاڑی نکال کر سڑک پر لے آیا۔

پہلے جی بھر کر روبینہ کو شاپنگ کروائی پھر کھانا کھانے کے بعد ڈرامہ دیکھا اور پھر گھر واپسی کے لئے روانہ ہوگئے۔ گیارہ بجے کے قریب یہ لوگ گھر لوٹے۔ تب تک گھر کے سب لوگ سو چکے تھے۔ ہنستے مسکراتے خوب صورت سپنے دیکھتے ہوئے وہ لوگ تھکن سے چور، بیڈ پر گر گئے۔ تھکی ہوئی روبینہ جلد ہی نیند کی وادی میں پہنچ گئی۔

دو بجے کے قریب کسی کے کراہنے کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی تو وہ فوراً اُٹھ بیٹھی۔ رؤف اس کے پہلو میں پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔

''رؤف......! رؤف......! کیا ہوا تمہیں......؟''

روبینہ نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا اور لائٹ آن کی تو زرد زردسی روشنی میں رؤف کا چہرہ بھی زرد پھولوں کی مانند تھا۔ خوشیوں سے شادمان چہرے پر اس وقت موت کی ویرانی برس رہی تھی۔ روبینہ کے جھنجوڑنے پر رؤف نقاہت سے بولا۔

''روبی......! شاید میرا وقت قریب آگیا ہے۔''

''نہیں......!''

رات کے خوف ناک سناٹے میں روبینہ کی خوف ناک چیخ خود روبینہ کو بھی خوف زدہ کر گئی۔ ابھی تک وہ صرف خوشیوں میں مگن تھی۔ رؤف کو کھونے کا احساس تو اس وقت ہوا تھا۔

''نہیں رؤف......! میں آپ کو مرنے نہیں دوں گی۔''

وہ اس سے چمٹ گئی۔

''روبی......! ڈیڈی کو اطلاع دو......!''

رؤف کی آواز میں لرزش محسوس کر کے وہ فوراً اُٹھی۔ اس کی ایک ہی آواز پر سب گھر والے بھاگے چلے آئے۔ شاید وہ روبینہ کی اس آواز

کے ہمیشہ منتظر رہتے تھے۔

رؤف کو فوراً گاڑی میں ڈال کر وہ لوگ یوسی ایچ روانہ ہوگئے۔ مگر موت کے ظالم ہاتھوں سے رؤف کو کوئی بھی نہ بچا سکا۔ موت کچھ اس قدر اچانک آئی کہ رؤف آخری وقت روبینہ سے کوئی بات بھی نہ کر سکا۔

کوئی خواہش، کوئی آرزو، لفظوں کے روپ میں نہ ڈھل سکی۔

روبینہ کو تو جیسے سکتہ سا ہوگیا۔ ساکت سی بیٹھی تو اُٹھا ہی نہ گیا۔ اس کے والدین رؤف کی موت کا سن کر آئے اور پھر چلے گئے۔ روبینہ کو تسلی دینا شاید ان کے فرائض میں نہیں تھا۔ البتہ رسم قل کے بعد روبینہ کی ماں نے واپس گھر جانے سے قبل اسے تنہائی میں بلا کر راز داری سے پوچھا تھا۔

''روبی......! تمہارا پاؤں تو بھاری نہیں......؟''

''جی امی......!''

روبینہ نے افسردگی سے سر جھکائے جھکائے جواب دیا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے بولیں۔

''ابھی وقت ہے۔ کچھ نہیں بگڑا۔ تم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرلو۔ رؤف تو مر ہی چکا ہے۔''

''امی......؟''

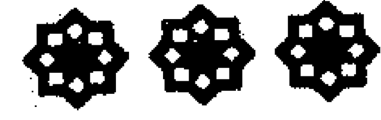
روبینہ چیخ پڑی۔

''آپ کو ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں......! میرے بچے کو آپ مصیبت کہہ رہی ہیں......؟ جبکہ وہی میری زندگی کا سہارا بنے گا۔''

''تم پچھتاؤ گی روبی......! ماں ہونے کے ناطے میرا یہ فرض ہے کہ تمہیں سمجھاؤں......! لیکن اگر تم آج بھی اپنی ضد پر قائم ہو تو مجھے افسوس ہے، کل خود ہی تاسف سے ہاتھ ملو گی۔''

روبی کی ماں تو یہ کہہ کر چلی گئی مگر روبینہ روتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

"ممی......! آپ کو میرے دُکھ کا احساس بھی نہیں......! کیسی ماں ہیں آپ......؟"



رات چپکے سے ڈھل گئی۔ مگر روبینہ کو اپنی سوچوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ وہ اس وقت چونکی جب اس کا سسر اور ساس اس کا ناشتہ لے کر وارڈ میں داخل ہو رہے تھے۔ روبینہ انہیں دیکھ کر ماضی سے پھر حال میں لوٹ آئی۔

روبینہ کی وجہ سے وہ لوگ رؤف کا ذکر بہت کم کرتے تھے۔ روبینہ کی ساس نے قریب آ کر ناشتہ کے برتن رکھے اور ٹیپو کو گود میں لیتے ہوئے بولیں۔

"دیکھو بہو......! ٹیپو بالکل رؤف جیسا ہے ناں......!"

"ہاں ماں جی......!"

روبینہ نے تصور میں کھڑے رؤف کے چہرے پر نظریں جما کر آنکھیں موندھ لیں۔



بہار

گاڑی رفتہ رفتہ لاہور کو چھوڑتی ہوئی اسلام آباد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سدرہ کھڑکی سے ٹیک لگائے گہری سوچوں میں گم تھی۔ وہ آج دوسری بار سسرال جا رہی تھی۔ مگر کتنے عجیب حالات میں۔

نہ شہنائیاں تھیں، نہ وہ دُلہن بنی تھی اور نہ ساتھ دُلہا تھا۔

"میں بھی کتنی منحوس ہوں......!"

اس نے دُکھ سے سوچا۔ آنے والا کوئی دن بھی اس کی زندگی میں کوئی خوش گوار تبدیلی نہیں لا سکے گا۔

"کاش جان......! میں آپ سے نہ ملی ہوتی......؟"

اس نے آنکھیں موندھ کر سر کھڑکی سے ٹکا دیا اور اس کا ذہن بیتے ہوئے دنوں کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔



وہ سب لاہور کے ایک ماڈرن علاقے کے رہنے والے تھے مگر اپنی ایک کزن کی شادی کے سلسلے میں سیالکوٹ کے ایک دیہات میں آئے

ہوئے تھے۔ جس کی آبادی تین چار سو سے زیادہ نہ تھی۔ گاؤں دیکھنے کا شوق انہیں یہاں لے آیا تھا۔

"گاؤں کیسا ہوتا ہے......؟"

"کیا ہوتا ہے......؟"

ان لوگوں نے یا تو کتابوں میں پڑھا تھا یا پھر فلموں میں دیکھا تھا۔ مگر اب اتفاق سے گاؤں دیکھنے کا موقع ملا تھا تو وہ اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ اب یہ ان کی بدقسمتی تھی۔ جب یہ لوگ گاڑی میں بیٹھنے لگے تو دُلہن کے بھائی، یعنی ان کے کزن سلیم نے چپکے سے نانا جان کو گاڑی میں سوار کرا دیا۔ تاکہ راستے میں لڑکیاں شرارتیں کریں تو ان پر نانا جان قابو رکھیں۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی تو لڑکیوں نے شرارتیں شروع کر دیں۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ نانا جان ڈبے کے پچھلے حصے میں تشریف رکھتے ہیں۔ سعید، نانا جان سے دو سیٹ کے فاصلے پر تھا۔ اسی کی بتوں پر سب قہقہے لگا رہے تھے کہ اچانک سعید کی "ارے باپ رے باپ......!" کی آواز اُبھری۔

سب نے پلٹ کر دیکھا تو دل اُچھل کر حلق میں آ گئے۔ نانا جان کی چھڑی سعید کے گلے میں تھی اور سعید یوں آنکھیں پھاڑے ہوئے تھا جیسے آخری وقت قریب آ گیا ہو۔

اس افتاد پر سب کے ہونٹ سِل کر رہ گئے تھے اور سر پر آنچل اوڑھنے کی کارروائی تیزی سے انجام پائی۔ اس دوران رخشندہ کے منہ سے ہنسی کی آواز نکلی تو نانا حضور نے اسے بھی قدموں میں بٹھا لیا۔

رخشندہ، سعید کی آنٹی کی لڑکی تھی۔ پھوپھو کی دونوں لڑکیاں رُخسانہ اور ریحانہ بھی ساتھ تھیں اور سمن آباد والی آنٹی کی دونوں لڑکیاں سدرہ اور نرگس بھی اس وقت گاڑی میں موجود تھیں۔ مگر خاندان بھر کے لڑکوں میں سے صرف سعید کو ساتھ جانے کی اجازت ملی تھی۔

جاتے ہوئے یہ لوگ کسی چیز کا نظارہ نہ کر سکے۔ چونکہ یہ لوگ رات کے تقریباً دس بجے گاؤں پہنچے تھے، اس لئے سوائے تاریکی کے کسی اور چیز کو نہ دیکھ سکے۔ یوں بھی گھر پہنچتے ہی یہ لوگ چھت پر چڑھ کر سو گئے تھے۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ لاہور شہر تو گرمی میں گھرا ہوا تھا مگر وہاں یہ لوگ لحاف اوڑھ کر سوئے کیونکہ گاؤں کے دائیں جانب نہر بہتی تھی اور ہوائیں نہر کے پانی کو چھو کر آتی تھیں۔

صبح یہ لوگ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی بارڈر دیکھنے کا پروگرام بنانے لگے اور جب پروگرام بن گیا تو سب لوگ تیار ہو کر باہر آئے۔ سعید نے ایک نظر سب کو دیکھا اور سینڈلوں کی اونچی ہیل کو دیکھتے ہی بولا۔

"یہ گاؤں ہے۔ راستے میں اونچے نیچے نشیب و فراز آئیں گے تو منہ کے بل گرو گی۔"

"تم سب اپنی بکواس بند کرو اور یہ سامان وغیرہ اُٹھاؤ......!"

"یہ کیا کہا......؟ یعنی ہم سامان اُٹھائیں......؟"

سعید ہکلا کر بولا۔

گاؤں سے ایک دو مزدور اپنے ساتھ لے لو یا پھر تانگہ کرا لو!"

"ہرگز نہیں......! ہم لوگ پیدل جائیں گے۔ ویسے آپ کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ دُلہن کا ایک دیور چل رہا ہے۔ اب مہربانی کر کے سامان اُٹھاؤ......!"

سعید نے دو تین ہلکی پھلکی چیزیں اُٹھا کر لڑکیوں کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا اور یوں یہ قافلہ سیالکوٹ کی سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے یہ لوگ سرحد پر پہنچ گئے۔

سعید نے ایک سرسبز جگہ دیکھ کر سامان رکھا اور چیخنے لگا۔

"بھئی......! اب جلدی سے کھانا لگا دو......! مجھے تو بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔"

"کیا بکواس ہے......؟"

رُخسانہ اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بولی۔

"پہلے گھومیں گے، پھریں گے۔ بعد میں کھانا کھائیں گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا......!"

سعید آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ سدرہ ان لوگوں کو آپس میں لڑتے دیکھ کر آگے بڑھ گئی۔ چونکہ ان دنوں فوجی مشقیں ہو رہی تھیں، اس لئے سرحد پر کافی رونق تھی۔ سدرہ کو آگے بڑھتا دیکھ کر چند فوجی نوجوان آگے بڑھے تو سدرہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"السلام علیکم......!"

"آفیسر......!"

"وعلیکم السلام......!"

"کون ہیں آپ لوگ......؟ اور کہاں سے آئے ہیں......؟"

سدرہ نے ان کا یہ سوال سنا تو مسکرا دی، پھر بولی۔

"ہم یہاں ولیمہ کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔ سرحد دیکھنے کا شوق ہمیں یہاں لے آیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو کیا میں یہاں کی کچھ تصاویر بنا سکتی ہوں......؟"

آفیسر نے شاید سدرہ کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ تو سامنے کی طرف سے آنے والی جیپ کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ سدرہ نے بھی ان لوگوں کو نظرانداز کرتے ہوئے دُور بین نکالی اور سرحد کے اس پار کا جائزہ لینے لگی۔

سدرہ ان مناظر کو پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر دُور بین اس نے دوسرے شانے پر ڈال کر کیمرہ نکالا اور مختلف لوکیشن کی تصاویر لینے کے لئے فوکس درست کرنے لگی۔ جبکہ باقی سب لوگ ایک دوسرے سے بات چیت کرنے میں مصروف تھے۔

میجر جان جو ابھی ابھی اپنی جیپ میں آئے تھے، بغور اس نازک

سی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ مناسب قد و قامت کی سدرہ گلابی سوٹ میں ملبوس ایک کاندھے پر کیمرہ اور دوسرے پر دُور بین لٹکائے کھڑی تھی۔ جب تک وہ دُور بین سے نظارہ کرتی رہی، میجر جان اسے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ مگر جیسے ہی اس نے کیمرہ نکال کر تصاویر لینے کا ارادہ کیا، میجر جان باوقار انداز میں چلتے ہوئے اس کی طرف بڑھے اور دیوار کی طرح کیمرے کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ سدرہ اچانک کسی کو کیمرے کے سامنے کھڑا دیکھ کر جھلا گئی۔

"کیا ہے بھئی......؟"

اس نے کاٹ کھانے والے لہجے میں پوچھا اور پھر میجر جان پر نظر پڑتے ہی جھنجلا کر بولی۔

"آفیسر......! کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ میں یہاں کی تصویریں لے رہی تھی۔"

"یہاں کی یعنی اس جگہ کی تصویر لینا منع ہے بے بی......!"

میجر جان نے نرمی سے سمجھایا۔

"آفیسر......! ہم کوئی جاسوس تو نہیں، ہم تو صرف شوق نے سرحد دیکھنے آئے ہیں اور اگر یہاں کی چند تصاویر لے رہے ہیں تو صرف اس لئے کہ انہیں اپنی البم کی زینت بنائیں گے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

"دیکھئے......"

میجر جان نے کچھ کہنا چاہا تو سدرہ بات کاٹ کر بولی۔

"مجھے سدرہ کہتے ہیں اور آپ کی تعریف......؟"

"جی...... میجر جان......!"

میجر جانے مسکرا کر کہا۔

"یہاں کی تصویر اُتارنا جرم ہے۔ بہتر ہے آپ یہاں کی تصویر نہ لیں۔"

قبل اس کے کہ سدرہ کچھ کہتی، میجر جان اسے چھوڑ کر ایک طرف چلے گئے۔ سدرہ افسردہ سی کیمرہ لئے چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے دل میں اب یہ خواہش مچل رہی تھی کہ سرحد کی نہیں تو چند فوجی نوجوانوں کی ہی تصویریں بنا لے۔ اُدھر میجر جان، سدرہ کے گروپ سے بات چیت کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے انہوں نے پلٹ کر ایک نظر سدرہ کو دیکھا۔ وہ کیمرہ کاندھے پر ڈالے چپ چاپ کھڑی تھی۔ رخشندہ تیزی سے ان کے ساتھ باتیں کر رہی تھی مگر وہ جواب میں ”ہوں ہاں“ کرتے رہے۔ سدرہ انہیں قدرے مختلف لڑکی لگی۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھیوں سے بات چیت کر کے دوبارہ سدرہ کی طرف چلے آئے۔

”کیا سوچ رہی ہیں آپ......؟“

حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ تصاویر کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ سدرہ نے کہنا چاہا مگر پھر چپ ہی رہی۔ یہ سوچ کر کہ شاید پھر انکار کر دیں۔ مگر میجر جان یہ محسوس کر چکے تھے کے یہ لڑکی اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔

”کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ......؟“

میجر جان نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

”جی ہاں......! وہ...... میں......“

”کہئے......!“

میجر جان نے مسکرا کر اس کا حوصلہ باندھا تو سدرہ آہستہ سے بولی۔

”میں اگر آپ سب لوگوں کی چند تصویریں لینا چاہوں تو......؟“

”عجیب خواہش ہے......!“

میجر جان دھیرے سے مسکرائے۔

”ویسے اس میں آپ کا قصور بھی نہیں ہے۔ رائٹر لوگ چونکہ خود

ب ہوتے ہیں، اس لئے ان کی خواہشات بھی عجیب و غریب ہی ہوتی ں۔“

میجر جان کے لہجے میں شوخی تھی اور وہ پرشوق نگاہوں سے اسے ہ رہے تھے۔

”آپ سے کس نے کہا میرے رائٹر ہونے کا......؟“

”مس رخشندہ کہہ رہی تھیں۔“

میجر جان نے دُور کھڑی رخشندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اگر یہاں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں تو وال کیجئے......!“

میجر جان کی بات پر پہلی بار سدرہ نے میجر جان کی طرف دیکھا۔ گندمی رنگت، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، دراز قد اور اپنے یونیفارم میں لبوس وہ بڑی گہری نظروں سے سدرہ کو تک رہے تھے۔

سدرہ نے بہت سارے سوالات ایک ساتھ کر دیئے اور وہ دھیمے نداز میں اس کے ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔ وہ دورانِ جنگ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوال کرتی گئی اور میجر جان مناسب لفظوں سے اسے جواب دیتے رہے۔

اپنی فوج کی بہادری اور وطن پرستی کے واقعات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

میجر جان خاموش ہوگئے تو سدرہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ آنکھوں میں آنسو لئے وہ سوچ رہی تھی۔

”کاش......! کوئی ہمارا بھائی بھی وطن و قوم کی خدمت کے لئے آگے بڑھے......؟ مگر امی ہمیشہ کہتی ہیں کہ میں جان بوجھ کر اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں کیوں دھکیل دوں......؟ اور یہ بھی تو ماؤں کے بیٹے ہیں

اور کتنی عظیم ہی وہ مائیں جنہوں نے اتنے عظیم بیٹوں کو جنم دیا۔"

میجر جان، سدرہ کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو تیر۔ دیکھ کر سوچ رہے تھے۔

"یہ لڑکی حب الوطنی کے جذبے سے کتنی سرشار ہے۔"

"سدرہ......!"

انہوں نے دھیمے لہجے میں پکارا۔

"شہیدوں کے لئے آنسو نہیں بہائے جاتے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔"

پھر میجر جان اس کے ساتھ ساتھ رہے اور پھر وہ واپس آ گئے۔ سعید ان لوگوں کے ساتھ نہیں گیا تھا اور ان کے واپس آنے تک آدھی سے زیادہ چیزیں ہضم کر چکا تھا۔

لڑکیاں میجر جان اور دوسرے آفیسروں کی پرواہ کئے بغیر اسے برا بھلا کہنے لگیں۔ جان نے مسکراتے ہوئے چند فوجی جوانوں کو اشارہ کیا اور دوسرے ہی لمحے ان لوگوں کے آگے کھانے پینے کی چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

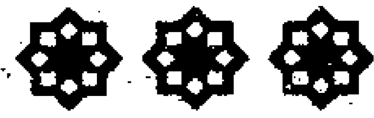
کھانے کے بعد سدرہ نے فوجی جوانون کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بنائیں مگر کوشش کے باوجود میجر جان سے یہ نہ کہہ سکی کہ میں آپ کے ساتھ تصویر بنانا چاہتی ہوں۔

واپسی پر میجر جان کے کہنے پر ایک فوجی جوان انہیں جیپ میں گھر چھوڑ گیا۔ سدرہ دُور تک میجر جان کو تکتی رہی جو جیپ روانہ ہوتے ہی کچھ دوسرے نوجوانوں کے ساتھ روانہ ہو گئے تھے۔ رات ان لوگوں نے وہاں بسر کی اور دوسری صبح ہوتے ہی لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ گاڑی ہرے بھرے کھیتوں کو چھوڑتی ہوئی لاہور کی طرف بڑھنے لگی۔

شادی کے ہنگامے تو ماند پڑ ہی چکے تھے مگر سدرہ کے دل سے

ا تک جان کا خوب صورت چہرہ نہیں ہٹا تھا۔ اگرچہ اس نے میجر جان ، کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اپنا پتہ تک نہیں دیا تھا۔ میجر جان بھی خاموش رہے ،مگر پھر بھی سدرہ کے دل کو ایک بے چینی سی لگ گئی تھی۔ وہ سوچتی۔

"کاش......! ایک بار میجر جان مل جائے تو وہ اپنا دل کھول کر اس ،سامنے رکھ دے۔"



جون کا مہینہ تھا۔ سدرہ نے ٹیلر ماسٹر کو اپنے سوٹ سلنے دے رکھے ھے۔ صبح گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سوچا کہ جا کر پڑے ہی لے آئے۔ لہٰذا نرگس کو ساتھ لیا اور بازار روانہ ہو گئی۔

کپڑے لے کر واپس ہوئی تو گھر کے راستے پر ایک جیپ نے رن بجایا۔ سدرہ نے گھبرا کر دیکھا۔

"آفیسر......! آپ......؟"

سدرہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ آواز سنتے ہی وہ ایڑھیوں پر ھوما اور سدرہ کو دیکھ کر تھکی تھکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"آپ اور یہاں......؟"

انہوں نے دھیمی آواز میں پوچھا تو سدرہ بولی۔

"میں یہیں قریب ہی میں رہتی ہوں۔"

"اچھا اچھا......! چلئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

انہوں نے سدرہ اور نرگس کو پیدل مارچ کرتے دیکھ کر کہا۔ جون کی گرمی سے ان دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

"نہیں نہیں......! آپ کو زحمت ہوگی آفیسر......!"

سدرہ بولی۔ حالانکہ میجر سے اچانک ملاقات پر وہ اندر ہی اندر خوش ہو رہی تھی۔

"زحمت کیسی؟ میں اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔ ورنہ نکل جاتا۔"

"اچھا ہی ہوا آپ سے ملاقات ہوگئی۔"

سدرہ کوشش کے باوجود اپنی خوشی نہ چھپا سکی۔ میجر جان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آیئے......! جیپ میں بیٹھئے......!"

میجر نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر سدرہ کے بتائے ہوئے پتے پر اسے اُتار کر گھر کے باہر ہی سے چلا گیا۔ سدرہ نے خاصا اصرار کیا تھا کہ وہ گھر کے اندر چلے مگر وہ معذرت کر کے چلا گیا۔

بہت سارے دن گزر گئے۔ اس دن وہ کالج سے کافی دیر سے آئی تھی کیونکہ کالج میگزین کا سارا بوجھ اس کے سر پر تھا۔

پانچ بجے جب وہ گھر آئی تو نرگس نے بتایا کہ میجر جان آئے تھے۔ سدرہ نے سنا تو اسے افسوس ہوا کہ وہ ان سے مل نہ سکی۔ مگر اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ آخر میرا خیال آ ہی گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ پھر آئے گا۔

سدرہ کا زیادہ وقت لکھنے میں گزرنے لگا تھا۔ سالگرہ نمبر کے لئے اپنا افسانہ مکمل کر رہی تھی کہ نوکر نے اطلاع دی کہ کوئی آیا ہے۔

"ڈرائنگ روم میں بٹھا دو......!"

اور پھر لکھنے میں محو ہوگئی۔ گھر کے سب لوگ دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ سدرہ کو لکھنے میں مہمان کا خیال ہی نہ رہا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے بھئی......؟"

سدرہ نے بے زاری سے پوچھا اور پھر ایک دم کھڑی ہوگئی۔

"گھر آئے مہمان کے ساتھ آپ ایسا سلوک کرتی ہیں......؟"

میجر جان آہستہ سے اندر چلے آئے۔

"جی...... وہ...... میں تو...... میں تو......"

خوشی اور حیرانگی سے سدرہ کے منہ سے بات نہ نکل سکی۔

"آپ بیٹھ جایئے......!"

میجر جان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"آپ بیٹھئے ناں......!"

سدرہ نے انہیں کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"چلئے......! اتنا تو خیال آیا کہ بیٹھنے کو کہا......؟"

جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا پئیں گے آپ......؟"

سدرہ نے شرمندگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں......! آپ بھی بیٹھ جایئے......!"

سدرہ بیٹھ گئی مگر سوچ رہی تھی کہ بات کہاں سے شروع کرے......؟ حالانکہ اتنے دنوں سے بہت سی باتیں سوچ رکھی تھیں۔

"یہ کہے گی......! وہ کہے گی......!"

مگر اس وقت تو منہ پر چپ کے تالے لگ گئے تھے۔

میجر جان دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے، تب ہی نوکر اورنج جوس لے آیا۔

"آپ یہ سب کچھ کیسے لکھ لیتی ہیں......؟"

جوس پیتے ہوئے میجر جان نے سوال کیا۔

"دیکھئے......! آپ مجھے......"

"جی فرمایئے......!"

میجر جان پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

"دیکھئے......! آپ مجھے آپ نہ کہا کیجئے......!"

"پھر......؟"

میجر جان مسکرائے۔

''آپ مجھے سدرہ بھی تو کہہ سکتے ہیں۔''

''مگر کیوں......؟''

میجر جان بڑی مصنوعی سنجیدگی سے بولے۔

''دیکھئے نا......!''

سدرہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ سمجھانا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پا رہی تھی۔

''سدرہ......!''

جان نے سب کچھ سمجھتے ہوئے اس کی مشکل خود ہی آسان کر دی۔

''ایسی باتیں کہنے کی نہیں، سمجھنے کی ہوتی ہیں۔ جو سمجھ لیتے ہیں وہ منزل پا لیتے ہیں، جو نہیں سمجھتے وہ بھٹک جاتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں......؟''

میجر جان نے پوچھا تو سدرہ نے اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔

''اچھا تو میں چلتا ہوں......!''

میجر جان جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سدرہ چاہنے کے باوجود شرم کے مارے رُکنے کا نہ کہہ سکی اور میجر جان جاتے جاتے پلٹ کر بولے۔

''بھئی! کچھ باتیں سمجھنے کی ضرور ہوتی ہیں مگر شرمانے کی نہیں!''

وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے اور سدرہ کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ محبت کی یہ دولت اسے بن مانگے ہی مل گئی تھی۔

اس دن سدرہ شاپنگ کر کے، شاپنگ سینٹر سے باہر آئی تو جان پر نظر پڑ گئی۔ وہ یونیفارم میں ملبوس جیپ کے قریب کھڑے دوسرے فوجیوں کو کچھ ہدایات دے رہے تھے۔ قریب ہی ٹرک میں چند فوجی جوان بیٹھے

ہوئے تھے۔ سدرہ نے چاہا کہ جان کو مخاطب کرے مگر چونکہ باہر ہنگامہ تھا، اس لئے خاموشی سے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

اچانک میجر جان کی نظر اس پر پڑی۔ وہ ایک لمحے کے لئے چونکے مگر دوسرے ہی لمحے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ سدرہ نے اب وہاں رُکنا مناسب نہ سمجھا مگر جیسے ہی جانے کے لئے قدم اُٹھایا تو فوجی جوان تیزی سے اُس کے قریب آیا۔

''پلیز محترمہ......! آپ اپنی جگہ پر رُکیے، آگے سے ایک جلوس آ رہا ہے۔ اگر توڑ پھوڑ کئے بغیر گزر گیا تو پھر آپ چلی جایئے گا۔ فی الحال یہیں رُک جایئے......!''

فوجی جوان جس تیزی سے آیا تھا، اس سے زیادہ پھرتی سے چلا گیا اور سدرہ دُکھ سے سوچنے لگی۔

''آخر یہ سب کر کے ہم لوگ کس کا نقصان کر رہے ہیں......؟ اس وطن کا جس کے لئے بے شمار لوگوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں......؟ آخر ہم تعمیر کی بجائے تخریب میں کیوں لگ گئے ہیں......؟''

''کاش......! ہمیں اپنی ذمے داریوں کا احساس ہو سکے اور ہم محسوس کر سکیں کہ جو لوگ ہمیں ان باتوں کی ترغیب دیتے ہیں، وہ ہمارے دوست نہیں دُشمن ہیں۔ کاش ہم دوست دُشمن میں تمیز کر سکیں۔''

دفعتہً اس کے کانوں میں اُلٹے سیدھے نعروں کی آوازیں آئیں تو وہ چونک پڑی۔ فوجی جوان سڑک کے دونوں جانب کھڑے تھے۔ شاید اسی لئے جلوس خاموشی سے گزر گیا۔ تاہم اس جلوس بازی میں دو گھنٹے ہوگئے۔ جو لوگ شاپنگ سینٹر کے اندر تھے، وہ بھی منتشر ہوگئے۔ سدرہ نے جانے کے لئے قدم بڑھایا تو میجر جان بڑی تیزی سے اس کی طرف آئے۔

''آیئے......!''

میجر جان نے جیپ کی طرف اشارہ کیا اور سدرہ خاموشی سے

جیپ میں بیٹھ گئی۔

''تم یہاں کیسے......؟''

چہرے پر نرم مسکراہٹ لیئے اس نے کہا۔

''شاپنگ کے لیئے آئی تھی۔ آپ اتنے دنوں سے آئے کیوں نہیں......؟''

''مصروفیت رہی......!''

میجر جان مسکراتے ہوئے بولے۔

''ان دنوں تمہاری کیا مصروفیات ہیں......؟''

''کوئی خاص نہیں......! آپ کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر آپ نے تو شاید بھول کر بھی میرے بارے میں نہیں سوچا ہوگا......؟''

سدرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''بس......! اتنی سی بات کے لیئے یہ جل تھل......؟ اگر فوجی کا انتظار کرنا شروع ہی کر دیا ہے تو دل بھی بڑا سا کر لو......! ہماری زندگی ہمارے لیئے نہیں، ملک وقوم کے لیئے ہوتی ہے۔ ہماری زندگی سے اگر چند لمحے بھی ہمیں اپنوں کے لیئے مل جائیں تو غنیمت سمجھو۔ زندگی کا سفر بہت لمبا ہوتا ہے۔ ہماری زندگی تو آج یہاں اور کل وہاں......! یہ زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ اچھی طرح سوچ لو......!''

میجر جان نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے......؟''

سدرہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

''میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ آئندہ سوچ سمجھ کر بات کیجئے گا۔''

''اچھا......!''

میجر جان زور سے ہنس دیئے اور گاڑی اس کے گھر کے سامنے روک دی۔

''آپ نہیں آئیں گے......؟''

''نہیں......! ویسے جلد آنے کی کوشش کروں گا۔''

سدرہ کے اُترتے ہی جیپ آگے بڑھ گئی۔

رات وہ سونے کے لیئے بیڈ پر لیٹی تو اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی چیخ پڑی۔ سدرہ نے تیزی سے برآمدے میں آکر ریسیور اُٹھایا تو اس کے کانوں میں میجر جان کی آواز رس گھولنے لگی۔

''آپ نے فون کس لیئے کیا ہے......؟''

سدرہ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

''بھئی......! ایک مسئلہ آن پڑا ہے۔''

''وہاں گاڑی میں نہیں بتا سکتے تھے کیا......؟''

''کمال ہے بھئی......! میں نے اتنے پیار سے فون کیا ہے اور تم رکھائی سے جواب دے رہی ہو......؟''

''مگر آپ نے فون کیوں کیا ہے......؟ اگر کوئی مشکل تھی تو وہیں پوچھ لیتے......؟ فون کرنے کی کیا ضرورت تھی......؟ اگر کوئی آگیا تو میں کیا جواب دوں گی......؟''

''خدا کی پناہ......! میں تو فون کر کے کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

میجر جان کراہا اور سدرہ کو ایک دم زور سے ہنسی آگئی۔

''کہیئے......! کیا مسئلہ ہے......؟''

''مسئلہ یہ ہے کہ میں صبح گھر جا رہا ہوں۔ ابھی ابھی ابا جان کا فون آیا تھا۔ امی جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ضروری جانا پڑے گا۔''

''واپسی کب ہوگی......؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اگر امی جان کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہوئی تو جلدی واپس آ جاؤں گا۔ سوچا جانے سے پہلے تمہیں بتا دوں......!''

''جی......! بہت اچھا کیا۔''

کہتے ہوئے سدرہ نے ریسیور رکھ دیا کیونکہ سامنے سے بھائی جان آ رہے تھے۔

میجر جان کو گئے ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے مگر ابھی تک ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ سدرہ دن رات میجر جان کی واپسی کی منتظر رہتی۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر اس کا دل بھر آتا۔

''اگر میجر جان نہ آئے تو میں کیا کروں گی......؟''

ان ہی سوچوں سے بچنے کے لئے وہ زیادہ تر پڑھتی رہتی۔

دوپہر کو وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ناول پڑھ رہی تھی کہ نرگس ہانپتی کانپتی اندر داخل ہوئی۔

''سدرہ باجی......! سدرہ باجی......! میجر جان بھائی جان آئے ہیں۔''

''کیا......؟''

سدرہ خوشی سے اُچھل کر دوپٹہ درست کرتے ہوئے باہر بھاگی تو نرگس لپک کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

''سنو تو سہی......! ان کے ساتھ ایک عورت اور ایک مرد بھی ہے۔''

''دیکھ لوں گی عورت اور مرد کو بھی......!''

سدرہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی مگر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ سامنے صوفے پر میجر جان ایک عورت کے ساتھ بیٹھے تھے۔ دوسری طرف ایک صاحب اس کی امی جان سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سدرہ نے انہیں آداب کیا تو اس کی امی بولیں۔

''بیٹی......! یہ میجر جان کے والد ہیں اور یہ ان کی بھاوج......!''

''جی امی جان......!''

یہ کہتے ہوئے سدرہ ان کی طرف آئی تو میجر جان اُٹھ کر اپنے والد کے ساتھ بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہی سدرہ کے ڈیڈی آ گئے تو سدرہ کی امی نے اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

''نہ جانے کیا بات ہے......؟''

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ نرگس نے آ کر یہ اطلاع دی۔

''وہ لوگ آپ کے رشتے کے لئے آئے ہیں۔ اب دیکھئے......! امی جان کیا جواب دیتی ہیں......؟ کیونکہ امی جان کو فوجی بالکل پسند نہیں۔ اس لئے وہ اپنی بیٹی کی شادی کسی وجہ سے نہیں کریں گی۔''

''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے نرگس......! امی سے کہنا انکار نہ کریں۔ موت ہر جگہ آتی ہے، لیکن شہید کی موت کا کبھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکا ہے۔ بے شک وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو جامِ شہادت نوش کرتے ہیں۔''

''ایک بار پھر سوچ لیں باجی......! کسی فلم یا ناول کی بات نہیں جو دو گھنٹے یا دس منٹ میں ختم ہو جائے گی۔ آپ کی پوری زندگی کا سوال ہے اور پھر آپ کے لئے رشتوں کی کمی تو نہیں......!''

''کچھ بھی ہو......! میں صرف میجر جان سے شادی کروں گی۔ میں کسی فوج کی بہن تو نہ بن سکی۔ اگر خوش قسمتی سے بیوی بن رہی ہوں تو تم لوگ میری راہ کا روڑا کیوں بن رہے ہو......؟ امی جان سے کہہ دو کہ میں خوش ہوں، انکار نہ کریں......!''

''باجی......! جیسے آپ کی مرضی......!''

یہ کہتی ہوئی نرگس باہر نکل گئی۔

اور اسی دن سدرہ کا نکاح جان سے ہوگیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جان کی والدہ کی طبیعت چونکہ بہت زیادہ خراب تھی، اس لئے ان کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے وہ میجر جان کی دُلہن کو ایک نظر دیکھ لیں۔

نکاح کے فوراً بعد سدرہ ان لوگوں کے ساتھ راولپنڈی چلی آئی۔ ائیرپورٹ سے گھر جانے کی بجائے ہم سیدھے اسپتال پہنچے جہاں میجر جان کی والدہ زیرِعلاج تھیں۔

میجر جان اور سدرہ کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر شفقت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے یوں سکون سے آنکھیں موندھ لیں جیسے اب کوئی خواہش باقی نہ رہی ہو اور پھر دوبارہ ان کی آنکھیں نہ کھلیں۔

اسپتال سے وہ لوگ گھر آئے۔ سدرہ پہلی بار سسرال آئی تھی اور وہ بھی عجیب انداز میں۔

سدرہ دس دن سسرال میں رہی اور پھر میجر جان اسے چھوڑنے لاہور چلے آئے مگر وہ پہلے جیسے میجر جان نہیں تھے۔ ماں کی موت کا بہت گہرا اثر تھا ان پر۔

سدرہ کی رُخصتی کچھ مدت کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ تاہم کبھی کبھار میجر جان رات کے وقت آجاتے۔ وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔ میجر جان کے زخم بھی مندمل ہوگئے۔

ایک شام میجر جان آئے اور سدرہ کو ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ سدرہ کی امی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا......؟ جلدی سے تیار ہو کر سدرہ باہر آئی تو دیکھا کہ جیپ کی بجائے ایک کار کھڑی تھی۔

''جیپ کہاں گئی......؟''

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سدرہ نے پوچھا۔

''بھئی......! جیپ میں تمہیں میرے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھ کر

لوگ فوجیوں کے بارے میں کیا سوچیں گی؟ اس لئے میں گاڑی لے آیا۔''

''بڑا خیال ہے فوجیوں کو اپنی عزت کا......؟''

''کرنا ہی پڑتا ہے......!''

میجر جان کے ہونٹوں پر دِلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ہم لوگ تو محافظ ہوتے ہیں ناں وطن کے......!''

''چلئے......! بس کیجئے......!''

سدرہ نے کہا تو میجر جان دھیرے سے مسکرا دیئے۔

''خیر! یہ تو بتایئے کہ اب آپ مجھے لے کر کہاں جا رہے ہیں؟''

''گھر سے ابا جان کا خط آیا تھا۔ انہوں نے رُخصتی کے بارے میں پوچھا ہے......؟ تمہارا کیا خیال ہے......؟''

''میرا......؟''

سدرہ کے منہ سے بات نہ نکل سکی۔ اسے ایک دم ڈھیروں سی شرم آگئی۔

''خوب......!''

میجر جان اس کی طرف دیکھ کر ہنسے۔

''اب تو رُخصتی ہو ہی جانی چاہئے......!''

سدرہ نے سوالیہ نظروں سے جان کی طرف دیکھا تو جان بولے۔

''تاکہ تمہاری یہ شرم دُور ہو سکے......!''

''یہی باتیں کرنے کے لئے آپ مجھے یہاں لائے تھے......؟''

''بالکل بالکل......!''

کہتے ہوئے میجر جان نے گاڑی روک دی۔ یہ شہر کے باہر کا ایک خوب صورت علاقہ تھا۔ جہاں صرف سکون ہی سکون تھا۔

''ہاں بھئی! اب بتاؤ! امی ابو آپ کی رُخصتی کے لئے تیار ہیں؟''

''آپ براہِ راست ان سے بات کیجئے۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے

ہیں......؟"

"اس کا مطلب ہے تم بالکل تیار نہیں ہو......؟"

سدرہ کوئی جواب دینے کی بجائے قریب ہی پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔

"اچھا بھئی......! مذاق ختم......!"

میجر جان اس کے قریب ہی جگہ بنا کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"بھابی اور ابا جان کل آرہے ہیں۔ اپنے امی ابا کو بتا دینا۔"

"جی بہتر......! کچھ اور......؟"

سدرہ نے بڑی شوخی سے مسکرا کر پوچھا۔

"اور بہت کچھ ہے......! اگر آپ اجازت دیں......؟"

"جی نہیں......! شکریہ......! بس اب واپس چلیں......!"

دوسرے دن حسب وعدہ میجر جان کے والد اور ان کے بھائی ان کے گھر پہنچ گئے اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی مگر انہی دنوں پھر ملک میں ہنگامے شروع ہوگئے۔

شادی کی تاریخ جوں جوں نزدیک آرہی تھی، ہنگامے مدہم پڑنے کی بجائے بڑھ رہے تھے اور کوشش کے باوجود میجر جان کو چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ ایسے میں میجر جان نے سدرہ کے والد کو شادی ملتوی کرنے کو کہا مگر سدرہ کی امی کا خیال تھا کہ اب جبکہ شادی میں پانچ دن باقی ہیں، ایسے میں شادی ملتوی کرنا ایک برا شگون ہوگا۔

مگر برا شگون پھر بھی برا ہو کر رہا۔ میجر جان چھٹی کی درخواست لے کر گئے تو پھر واپس ہی نہ آئے۔ شادی میں دو دن تھے۔ سب میجر جان کی وجہ سے پریشان تھے کہ ان کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

بارات والی صبح میجر جان کے والد کا فون آیا کہ ابھی ابھی چند فوجی آئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ میجر جان ایک جلوس کی روک تھام کے سلسلے میں اپنے جوانوں کے ساتھ کھڑے تھے کہ جلوس میں شامل افراد نے

فائرنگ شروع کر دی۔ چونکہ میجر جان وہاں ڈیوٹی پر موجود تھے، اس لئے ایک گولی ان کو بھی لگی۔ میجر جان شدید زخمی ہو کر زمین پر گر چکے تھے۔ فائرنگ سے چونکہ ہنگامہ زیادہ بڑھ گیا، اس لئے اس افراتفری میں کچھ لاشیں غائب کر دی گئی تھیں۔ انہی میں میجر جان بھی شامل تھے۔

سدرہ نے سنا تو چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔ مگر اس کے بے ہوش ہونے سے حقیقت بدلی نہیں جا سکتی تھی اور نہ ہی میجر جان دوبارہ زندہ ہو سکتے تھے۔

سدرہ دن رات اُداس پھرتی اور اس کی امی کہتیں۔

"اسی لئے میں فوجیوں سے شادی کے خلاف ہوں۔ جنگ ہو یا نہ ہو، ان کی زندگی ہوا میں جلتی ہوئی شمع کی مانند ہوتی ہے۔ جو کسی بھی تیز جھونکے سے بجھ سکتی ہے۔ اپنے ایثار اور عقیدت کا انجام دیکھ لیا آخر......!"

اور آج کل گھر میں یہ بحث تھی کہ سدرہ کا آخر کیا کیا جائے......؟ سدرہ سسرال جانے کے لئے بضد تھی جبکہ سدرہ کے ابو کا خیال تھا کہ بات یہیں ختم ہو جائے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ مگر سدرہ کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے سسرال جائے گی۔ کچھ سوچ کر سدرہ کے ابا نے میجر جان کے والد کو فون کیا کہ وہ کسی طرح آکر اسے سمجھائیں۔

میجر جان کے والد آئے اور سدرہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ سدرہ کو سمجھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں اسے چند روز کے لئے ساتھ لے جاتا ہوں۔ وہاں سونا سونا ماحول جب دیکھے گی تو خود ہی احساس ہوگا کہ ساری زندگی کیسے گزارے گی......؟ سدرہ آج ان کے ساتھ اپنے سسرال جا رہی تھی۔ گاڑی رُکی، سدرہ چونک پڑی۔

سسرال کے سونے سونے ماحول میں اس نے خود کو ایڈجسٹ کر لیا۔ وہاں میجر جان کی بھابی بھی تھی اور سات سالہ بھتیجا شہزاد بھی۔ سدرہ اپنا زیادہ وقت شہزاد کے ساتھ گزارتی۔ اور جب تنہائی ملتی تو میجر جان کی ایک

ایک چیز اُٹھا کر چومتی۔ کیونکہ اسے میجر جان کا کمرہ مل گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے میجر جان زندہ ہیں اور بہت جلد اس سے آن ملیں گے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ کچھ دیر کے لئے بیڈ پر لیٹ گئی۔ سردی کا موسم تھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے جان اس کے قریب آکر کھڑے ہوگئے ہیں۔ سدرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''کیا ہی اچھا ہوتا میجر جان......! اگر آپ سچ مچ یہاں موجود ہوتے......؟''

وہ بڑبڑائی اور آنسو بہہ نکلے۔

''فوجی کی بیوی ہو کر اتنا چھوٹا دل......؟''

جان کے لب ہلے۔

''نہیں میجر جان......! میں چھوٹے دل کی مالک نہیں ہوں۔ دُنیا دیکھے گی میں آپ کے نام پر زندگی بتاؤں گی کیونکہ میری محبت آج بھی قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔''

''پگلی اس طرح نہیں روتے......!''

جان نے جھک کر اسے اُٹھایا اور حقیقت کا احساس ہوتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''آ......آ......آپ......!''

سدرہ کے منہ سے صرف یہی نکلا اور وہ میجر جان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میجر جان خاموشی سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ روتے روتے سدرہ نے کہا۔

''آپ......تو......''

''مر گئے تھے......؟''

میجر جان نے مسکرا کر اس کا جملہ پورا کیا۔

''خدا نہ کرے......!''

سدرہ نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تو میجر جان اُسے بٹھاتے ہوئے بولے۔

''ہنگامے میں گولیاں لگنے کی وجہ سے میں زخمی ہو کر گر گیا تھا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مجھے بھی مردہ سمجھ کر وہ لوگ لے گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ ان لوگوں کی گرفت سے آزاد ہو جاؤں۔ مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ میری کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ ساتھ ہی علاج بھی ہو رہا تھا۔

دراصل انہوں نے شاید مجھے یرغمال بنا لیا تھا۔ اخبارات کے ذریعے مجھے اپنی موت کی خبر مل گئی تھی۔ زخمی زیادہ تھا، مجھے آرام اور علاج دونوں کی اشد ضرورت تھی اور وہ لوگ یہ ضرورت اچھی طرح پوری کر رہے تھے۔''

میجر جان کہہ رہا تھا اور یک ٹک اُسے دیکھے گئی۔ پھر کہنے لگے۔

''چلو اس طرح مجھے تمہارا بھی اندازہ ہوگیا۔ بڑی پکی نکلی ہو!''

میجر جان محبت بھرے لہجے میں بولا۔

''پھر خود بخود ان لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ آج سوچا گھر کا چکر لگا لوں۔ یہاں آیا تو تمہیں پا کر نہ پوچھو کتنا خوش ہوا۔ بلکہ تم پر فخر کر رہا ہوں۔ ایک فوجی کی بیوی کو ایسا ہی ہونا چاہیئے......!''

''اللہ کا شکر ہے......! آپ زندہ سلامت ہیں۔''

سدرہ نے مسرت سے کہا۔

''اب اپنے والد کے پاس جایئے تاکہ وہ آپ کو زندہ دیکھ کر اپنے دل میں ٹھنڈک محسوس کریں۔''

''بڑی لاجواب بیوی ہو......!''

میجر جان نے ہنس کر کہا۔



پوجا

یونیورسٹی سے تھکی ہاری بوبی گھر پہنچی تو گیٹ پر عجیب وغریب نظارہ دیکھنے کو ملا۔ گھٹیا قسم کے شلوار سوٹ میں ملبوس ایک لڑکا جو اپنے لباس کی وجہ سے اپنی عمر سے دُگنا بڑا لگ رہا تھا، گیٹ کے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی اور دوسرے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا جیسے کسی دُور دراز دیہات سے نوکری کی تلاش میں آیا ہو۔

بوبی کو ایسے لوگوں سے سخت چڑ تھی جو نوکری کے بہانے آ کر لوگوں کے گھروں سے روٹیاں بھی مانگ کر کھاتے اور فٹ پاتھوں پر سوتے تھے۔ اچھی طرح اس کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ہارن دینا شروع کیا پھر کھڑکی سے سر باہر نکال کر بولی۔

"کیوں بھئی......! یہاں کیوں کھڑے ہو......؟"

"دیکھئے بی بی جی......! میں گاؤں سے آیا......"

اور قبل اس کے وہ جملہ مکمل کرتا، بوبی چیخ پڑی۔

"وہ تو تمہاری شکل سے ظاہر ہے۔ مگر گاؤں سے یہاں کیا لینے

ئے ہو......؟"

ابھی وہ جواب دینے نہیں پایا تھا کہ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا اور بی گاڑی اندر لے گئی۔

تقریباً ایک ہفتہ ہوا تھا اسے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لئے ہوئے۔ ں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس لئے کسی کا لحاظ کم ہی کرتی تھی۔ گاڑی یراج میں بند کر کے وہ اپنے کمرے میں آئی اور منہ ہاتھ دھو کر، لنچ کے ئے ڈائننگ روم میں آئی تو اسے دروازہ میں ہی رُک جانا پڑا۔

وہ عجیب وغریب گاؤں کی مخلوق ایک کرسی پر تشریف رکھے ہوئے ں اور بوبی کے پاپا بڑے پیار سے اس سے باتوں میں مصروف تھے۔

"پاپا......! یہ جانور کون ہے......؟"

بوبی نے انگلش میں پوچھا۔

"بوبی بیٹا......! یہ گریجویٹ فیروز احمد ایم اے میں داخلہ لینے کے لئے شہر آئے ہیں۔ گاؤں میں رہتے ہیں۔"

رحمٰن صاحب نے جلدی سے تفصیل بتائی کہ کہیں بوبی کوئی اور جملہ کہہ دے۔

"واٹ......؟"

بوبی گریجویٹ سن کر حیرت سے چیخی تو رحمٰن صاحب مسکراتے ئے فیروز سے مخاطب ہوئے۔

"فیروز......! یہ ہماری لاڈلی اور اکلوتی بیٹی بوبی ہے۔"

"السلام علیکم......!"

فیروز باقاعدہ ہاتھ پیشانی پر لے گیا۔ جواب میں بوبی کھلکھلا کر ہنس دی۔ بہرطور کھانا شروع ہوگیا۔ کھانے کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی مگر جیسے ہی بوبی کھانا کھا کر اُٹھی تو رحمٰن صاحب اسے روکتے ہوئے ولے۔

’’بوبی بیٹے......! فیروز کل آپ کے ساتھ یونیورسٹی جائیں گے، داخلے کے سلسلے میں آپ کو ہی ان کی مدد کرنی ہے۔‘‘

’’جی بہتر......!‘‘

یہ کہتے ہوئے بوبی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ صبح تیار ہو کر ناشتے کے لئے آئی تو فیروز اکیلا میز پر بیٹھا تھا۔ بوبی کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ جواباً بوبی کو بھی مسکرانا پڑا۔ اتنے میں مما پاپا بھی آ گئے۔ ناشتے کے بعد رحمٰن صاحب بولے۔

’’چلو بوبی بیٹے......! اب آپ فیروز کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں......!‘‘

’’جی بہتر پاپا......! مگر مسٹر فیروز کیا اسی لباس میں جائیں گے......؟‘‘

’’جی ہاں......! یہی لباس کافی ہے۔‘‘

فیروز نے کہا تو بوبی برا سا منہ بنا کر اسے دیکھنے لگی کیونکہ وہ کھلے پائنچوں کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھا جس کو قرینے سے استری بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بوبی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پاپا کے اشارے پر خاموشی سے گاڑی کی طرف بڑھ گئی اور یہ بھی محض اتفاق تھا۔

جب یونیورسٹی جا کر گاڑی رُکی تو کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہوا تھا۔ بوبی فیروز کو لئے تیزی سے آفس کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن جب وہ آفس سے فارغ ہونے کے بعد باہر آئی تو ٹینا سے ملاقات ہوگئی۔ ٹینا بھی اس کی طرح ایک امیر گھرانے کی ماڈرن لڑکی تھی اور شاید اسی لئے ان دونوں کی دوستی گہری تھی۔

’’ہیلو بوبی......!‘‘

ٹینا اس کی طرف لپکی۔

’’ہیلو......!‘‘

بوبی بھاگنے کے انداز میں فیروز کو پیچھے چھوڑ گئی۔ جیسے فیروز سے ں کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اتنے میں بوبی کی اور سہیلیاں بھی اِدھر ہی چلی ئیں۔ ابھی باقاعدگی سے کلاسیں شروع نہیں ہوئی تھیں، اس لئے زیادہ تر ٹوڈنٹس کلاسوں سے باہر گھومتے رہتے تھے۔

’’ارے......! یہ تمہارے پیچھے کون ہے......؟‘‘

سونیا نے فیروز کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے پوچھا۔ بوبی کے واب دینے سے قبل ہی فیروز قریب آتے ہوا بولا۔

’’بوبی جی......! میں گاڑی میں چل کر بیٹھوں......؟‘‘

’’ہاں ہاں......! جاؤ......!‘‘

بوبی نے جلدی سے کہا۔

’’ارے......! یہ تمہارے ساتھ تھا......؟‘‘

ٹینا نے حیرت سے پوچھا۔

’’کہاں سے پکڑ کر لائی ہو......؟‘‘

زارا نے پوچھا جو کہ کرسچن تھی۔

’’میں پکڑ کر نہیں لائی۔ یہ خود ہی چھوپ کر آ گیا ہے۔‘‘

بوبی خود بھی ان کے ساتھ مذاق میں شامل ہوگئی۔

’’ڈرائیور رکھا ہے کیا......؟‘‘

مالا نے پوچھا۔

’’ارے نہیں......! ایم اے میں داخلہ لینے کے لئے گاؤں سے آیا ہے۔‘‘

بوبی کے اس انکشاف پر وہ کچھ دیر کے لئے حیران ہوئیں پھر ایک ساتھ چیخیں۔

’’واٹ......؟ یقین نہیں آتا......؟‘‘

’’مجھے بھی نہیں آیا تھا۔‘‘

رات کو وہ پاپا کے کمرے میں آئی اور برا سا منہ بناتی ہوئی بولی۔

''پاپا......! آپ نے یہ کیا مصیبت میرے گلے لگا دی......؟ اتنی سبکی ہوئی میری کہ کیا بتاؤں......؟ آخر یہ ہے کون......؟ اور کہاں سے آیا ہے......؟ کچھ بتائیں تو......!''

''دیکھو بوبی......! یہ تم سے زیادہ امیر ماں باپ کی اولاد ہے۔ سرگودھا سے آیا ہے۔ وہاں ان کی زمین اور باغات ہیں۔ فیروز کے والد میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ میری اور ان کی دوستی یونیورسٹی کے زمانے میں ہوئی تھی۔''

''تو کیا فیروز کے والد بھی پڑھے لکھے آدمی ہیں......؟''

بوبی بات کاٹ کر بولی۔

''وہ پڑھے لکھے نہ ہوتے تو بیٹے کو کیسے پڑھاتے......؟ ویسے آج میں فیروز کو اپنے ساتھ شاپنگ کے لئے لے جا رہا ہوں، مگر پھر بھی اسے خود کو تبدیل کرنے میں کچھ عرصہ تو لگے گا۔''

وہ خاموش ہوئے اور کچھ سوچتے ہوئے قدرے توقف کے بعد بولے۔

''بیٹی......! وہ چاہتا تو اپنے لئے الگ بنگلہ لے کر رہ سکتا تھا۔ مگر میں نے خود احمد سے کہا تھا کہ اسے میرے پاس بھیجنا اور اب اسے یونیورسٹی لے جانا اور لانا تمہارا کام ہے۔ مجھے شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے......!''

بوبی ناک چڑھاتی ہوئی باہر چلی آئی۔ جب وہ فیروز کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگی تو بے اختیار نظر اُٹھ گئی۔ فیروز سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

''ہیلو فیروز......! کیا میں اندر آ سکتی ہوں......؟''

فیروز نے چونک کر اسے دیکھا پھر بوکھلا کر اُٹھتے ہوئے بولا۔

''آیئے آیئے......!''

''کیا کر رہے تھے......؟''

بوبی نے سرسری طور پر پوچھا۔

''جی......! گھر خط لکھ رہا ہوں کہ مجھے داخلہ مل گیا ہے۔''

''اوہ، سوری......! تب تو میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا......؟''

بوبی معذرت کر کے لوٹ آئی۔

کچھ دن بعد باقاعدگی سے کلاسیں شروع ہوگئیں۔ بوبی یونیورسٹی پہنچتے ہی اس کے لئے اجنبی بن جاتی اور اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر اس کا خوب مذاق اُڑاتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فیروز کی اُردو تو ٹھیک تھی لیکن باتیں کرتے کرتے وہ اکثر اپنی گاؤں کی زبان کے چند الفاظ استعمال کر جاتا جس پر خوب ہنسی آتی اور فیروز کچھ کہنے کی بجائے تنہا ایک طرف بیٹھ جاتا اور جب چھٹی کے وقت بوبی گاڑی کی طرف بڑھتی تو وہ بھی چلا آتا۔

راستہ ہمیشہ خاموشی سے کٹتا۔ بوبی نے خود کبھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''بوبی......! آپ باقی پیریڈ اٹینڈ نہیں کریں گی......؟''

کینٹین سے آتے ہوئے فیروز نے بوبی سے پوچھا۔

''تم جو اٹینڈ کر لیتے ہو۔ بوبی کر کے کیا کرے گی......؟''

سونیا نے تمسخرانہ انداز میں کہا تو دوسری لڑکیاں بھی ہنسنے لگیں۔

فیروز خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

بوبی اکثر پیریڈ اسی طرح چھوڑ دیا کرتی تھی۔ شام کی چائے پر بوبی اپنے کمرے سے باہر آئی تو کچھ سوچ کر فیروز کے کمرے میں چلی آئی۔ فیروز مسہری پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ چونک کر بوبی کو دیکھنے لگا۔

''مسٹر فیروز......! زیادہ پڑھائی اچھی نہیں ہوتی۔''

بوبی اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''جب پڑھائی کے لئے ہی یہاں آیا ہوں تو پھر فارغ بیٹھ کر کیا کروں گا......؟''

فیروز نے آہستہ سے جواب دیا۔

''اچھا......! آیئے چائے پی لیجئے......!''

بوبی اُٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ میری چائے میرے کمرے میں بھجوا دیجئے۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اس کے باوجود تم پڑھ رہے ہو......؟''

''عادت سے مجبور جو ٹھہرا......!''

فیروز مسکرایا۔

دوسرے دن وہ لوگ یونیورسٹی گراؤنڈ میں بیٹھے حسب معمول خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ فیروز بھی عارف کے قریب بیٹھا تھا۔ باتیں کرتے کرتے عارف بولا۔

''یہ رزاق نظر نہیں آ رہا۔ کہاں گیا ہے......؟''

کسی کے کچھ کہنے سے قبل ہی فیروز بول پڑا۔

''مجھے تو مل رہا ہے۔''

''کیا مل رہا ہے......؟''

عارف نے چیونگم چباتے چباتے رُک کر پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ مجھے نظر آ رہا ہے۔''

فیروز نے وضاحت کی۔

''واہ میرے بھائی......! کیسی خوب صورت بات کہی تم نے......!''

عارف نے قہقہہ لگایا پھر تو جیسے قہقہوں کی بارش ہونے لگی۔ فیروز جھینپ سا گیا اور اتنے میں رزاق بھی سامنے سے چلا آیا۔

چھٹی کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھی تو فیروز کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ چھٹی ہوتے ہی فیروز گاڑی میں آ کر بیٹھ جاتا تھا اور بوبی کافی دیر گپ شپ لگانے کے بعد آتی۔ مگر آج اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بوبی نے دو منٹ انتظار کیا پھر بڑبڑائی۔

''میں کیا اس کی نوکر ہوں جو انتظار کرتی رہوں......؟''

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر چلی آئی۔

گھر پہنچی تو کھانے کی میز پر بھی فیروز موجود نہ تھا۔ بوبی نے سوچا۔

''اگر پاپا نے اس کے بارے میں کچھ پوچھا تو میں بھی کہہ دوں گی کہ گھومتا پھرتا ہے۔ اب میں اس کی خاطر خود تو لیٹ نہیں ہو سکتی۔''

مگر کھانا خاموشی سے شروع ہوا اور خاموشی سے ختم ہو گیا اور کھانا ختم ہونے کے بعد اس کے پاپا خود ہی بولے۔

''بوبی بیٹے......! فیروز اپنے گاؤں گیا ہے۔ دو دن تک آ جائے گا۔''

''گاؤں کیا لینے گیا ہے......؟''

بوبی حیران رہ گئی۔

''معلوم نہیں......!''

رحمٰن صاحب نے کہا اور بوبی کچھ سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

''چلو اچھا ہوا، پیچھا چھوٹا۔ اب مشکل ہی سے لوٹ کر آئے گا۔''

دوسری صبح وہ یونیورسٹی گئی تو سب نے فیروز کے بارے میں استفسار کیا۔

''بھئی......! وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور اب واپس نہیں آئے گا۔''

"مس بوبی......! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ آپ کی وجہ سے تعلیم چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو گناہ آپ کو ہوگا۔"

حامد نے سمجھایا۔

"اگر تمہیں زیادہ ہمدردی ہے تو خود جا کر لے آؤ......!"

بوبی نے نفرت سے ناک سکیڑی۔

"مس بوبی......! کتنے افسوس کی بات ہے۔ آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہی نہیں......؟"

رزاق نے کہا تو کچھ کہنے کی بجائے وہ چپ چاپ اُٹھ گئی۔

صبح وہ تیار ہو کر باہر آئی تو فیروز کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"یہ مصیبت پھر نازل ہوگئی......؟"

وہ بڑبڑائی۔ فیروز بال بنا رہا تھا۔ اسے دیکھا تو مسکرا کر "ہیلو" کہا۔

"ہیلو......!"

بوبی نے بے دلی سے کہا پھر پلٹتے ہوئے بولی۔

"مجھے آج ناشتہ نہیں کرنا فیروز......! دراصل مجھے ایک ضروری کام ہے، میں جا رہی ہوں، تم ڈیڈی کے ساتھ آجانا......!"

فیروز کچھ کہنے کی بجائے جھک کر بوٹ کے تسمے باندھنے لگا۔

بوبی سب کے ساتھ کلاس میں بیٹھی تھی کہ فیروز کلاس میں داخل ہوا۔

"ارے......! یہ پھر آگیا......؟"

ٹینا نے سرگوشی کی۔

"ہاں......!"

بوبی نے کہا۔

"ہیلو مسٹر فیروز......! آپ اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے......؟"

ٹینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک ضروری کام سے گاؤں گیا تھا۔"

کہتے ہوئے فیروز اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

چھٹی کے وقت بوبی گاڑی میں بیٹھی فیروز کا انتظار کر رہی تھی کہ قریب ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز اُبھری۔ بوبی نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا تو فیروز سر پر ہیلمٹ جمائے موٹر سائیکل پر بیٹھا تھا اور ایسے میں بے حد خوب صورت بھی لگ رہا تھا۔

بوبی نے کچھ پوچھنے کے لئے منہ کھولا مگر پھر ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کر کے اس کے آگے آگے چلی آئی۔

"ہوں......! تو یہ صاحبزادے موٹر سائیکل کی خاطر گاؤں گئے تھے......؟"

بوبی نے دانت پیس کر سوچا اور گاڑی گیراج میں لے جانے کی بجائے پورچ میں ہی روکی اور سیدھی ڈائننگ روم میں چلی آئی تاکہ پاپا سے فیروز کے بارے میں پوچھ گچھ کر سکے۔ جبکہ فیروز سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"پاپا......! فیروز کو موٹر سائیکل آپ نے لے کر دی ہے......؟"

بوبی نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

"نہیں بیٹے......! وہ تو گاؤں سے رقم لایا تھا۔ وہ کل صبح دس بجے ہی واپس آگیا تھا اور سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد آخر موٹر سائیکل خرید لی۔"

"اس کا مطلب ہے، وہ اب اپنی موٹر سائیکل پر یونیورسٹی جایا کرے گا......؟"

"ہاں......! کیا اس کا تم سے کوئی جھگڑا ہوا ہے......؟"

پاپا نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"نہیں تو......!"
بوبی نے کہا۔ اسی وقت فیروز آ گیا اور بوبی سوچنے لگی۔
"بے چارہ اس دن کی اِنسلٹ برداشت نہیں کر سکا۔ خیر......! مجھے کیا فرق پڑتا ہے......؟"

دوسری صبح یونیورسٹی پہنچتے ہی اس نے سب کو بتا دیا کہ ہمارے فیروز صاحب بہادر اس دن کی اپنی اِنسلٹ برداشت نہیں کر سکے اور موٹر سائیکل خرید لائے ہیں۔ بس پھر کیا تھا کہ فیروز کے یونیورسٹی پہنچتے ہی سب لڑکے لڑکیوں نے فیروز کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ موٹر سائیکل کی مبارک باد دی اور ساتھ ہی منہ میٹھا کروانے کے نعرے لگائے۔

فیروز نے بھی مسکراتے ہوئے ہامی بھر لی۔ وہ کسی چھوٹے موٹے خاندان کا نہیں تھا۔ اس نے وعدہ کیا، وہ سب کو انٹر کانٹینینٹل میں لنچ دے گا۔ سب "ہُرّے ہُرّے" کہتے ہوئے اُٹھ گئے۔

بوبی نے مبارک باد تو دی نہیں تھی، اس لئے جب چھٹی کے وقت سب لوگ ہوٹل روانہ ہونے لگے تو وہ خاموشی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ مگر جیسے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنا چاہی، نہ جانے کب فیروز کھڑکی پر جھک آیا۔
"مس بوبی......! آپ ہوٹل نہیں چلیں گی......؟"
بوبی اس کے اس انداز پر چونک سی گئی۔ مگر وہ دوسرے ہی لمحے نارمل ہوگئی۔
"ٹھیک ہے......! میں ہوٹل پہنچ جاؤں گی۔"
"شکریہ......!"
یہ کہہ کر فیروز کھڑکی کے قریب سے ہٹ گیا اور بوبی تذبذب کے عالم میں روانہ ہوگئی۔ لنچ کے درمیان خوب ہنگامہ رہا اور فیروز اپنی اچھی

خاصی رقم سے ہاتھ دھو کر گھر چلا آیا۔

کافی دن گزر گئے، مبین بلاناغہ بوبی کو فون کرتا۔ اسی دن وہ دوپہر کا کھانا کھا کر ابھی لیٹی ہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی چیخ اُٹھی۔ بوبی نے جھلا کر ریسیور اُٹھایا اور دوسرے ہی لمحے مسکرا دی۔
"فرمایئے جناب......!"
اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔
"فرمانا کیسا......؟"
مبین شرارت بھرے لہجے میں بولا۔
"بندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے، جیم خانہ میں......!"
"وہ کیوں......؟"
بوبی نے شوخی سے پوچھا۔
"آپ آئیں گی تو بتاؤں گا۔"
"ٹھیک ہے......! میں غور کروں گی۔"
اس نے ایک ادائے بے نیازی سے کہا اور مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔
"ارے......! رات میں نے اپنے اسی آئیڈیل محبوب کو دیکھ لیا۔"
بوبی نے ٹینا، سونیا اور مالا سے کہا۔ یہ لوگ کلاس روم میں موجود تھے۔ ابھی ابھی انگلش کا پیریڈ ختم ہوا تھا اور کلاس میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
"کیسا تھا وہ......؟"
ٹینا نے اشتیاق سے پوچھا۔
"بالکل میرے خوابوں کے شہزادوں جیسا، بالکل ماڈرن......"
پھر بات اُدھوری رہ گئی۔ کیونکہ فیروز لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سامنے سے آ رہا تھا۔

"یااللہ......! یہ انسان ہے کہ جن......؟ اِدھر اس کا ذکر ہوا اور اُدھر وہ سر پر پہنچ گیا۔ یہ تو گاؤں گیا تھا، یونیورسٹی کیسے چلا آیا......؟ کچھ بھی ہو، اس کے دل کی لگی سچی تھی، جو وہ چلا آیا۔"

ٹینا ہنسی، اتنے میں وہ قریب چلا آیا۔ یہ سب لوگ "ہیلو ہیلو" کہتے ہوئے اس کا حال دریافت کرنے لگے۔ بوبی نے بات کرنی بھی اس سے گوارہ نہیں کی۔ آرام سے بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ باتیں کرتے کرتے وہ پلٹا۔

"مس بوبی......! آپ کیسی ہیں......؟"

"کیسی نظر آ رہی ہوں......؟"

بوبی نے فوجیوں کی طرف سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے کہا۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور نہ جانے کیوں فیروز بھی مسکراتا ہوا کلاس کی جانب چل پڑا۔

انٹرول میں وہ لوگ باہر آئے تو رزاق فیروز کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

"اور سناؤ فیروز ڈیئر......! گاؤں میں کیسی گزری......؟ ہماری یاد آئی......؟ ویسے سنا ہے گاؤں کی بہاریں نرالی ہوتی ہیں۔"

"جہاں تک تم لوگوں کو یاد کرنے کا تعلق ہے، اس کی فرصت ہی نہیں ملی۔ باقی رہی گاؤں کی نرالی بات، تو وہ صرف تم لوگوں کے لئے ہوتی ہے ورنہ وہاں بھی انسان بستے ہیں اور یہاں بھی۔ یہاں کے جدید تقاضوں کو تم لوگ جلد اپنا لیتے ہو اور گاؤں والے کام کریں یا ان تقاضوں کو اپنائیں......؟

مختصر بات یہ کہ زندگی یہاں بھی ہوتی ہے اور وہاں بھی، جو کچھ شہروں میں ہوتا ہے، وہی کچھ گاؤں میں بھی، مگر وہاں ہر چیز میں سادگی ہوتی ہے اور شہر میں بناوٹ۔"

"یار......! ایک بات بتاؤ......! کیا گاؤں میں محبت بھی ہوتی ہے......؟"

عارف نے اس کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔

"بھئی......! جہاں سادگی ہوتی ہے وہاں محبت کیسے ہو سکتی ہے......؟" بوبی نے قہقہہ لگایا۔

"ایک بات تم نہیں جانتی بوبی......! سادگی میں جو حسن ہوتا ہے، وہ کوئی نہیں جانتا۔"

عارف آنکھیں بند کر کے بولا۔

"ارے......! میرے یار......! ہوش کی دُنیا آؤ......!"

رزاق نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا تو عارف چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مسٹر فیروز......! اب کی بار اگر آپ گاؤں جائیں تو ساتھ عارف کو بھی لے جائیں، تاکہ یہ بھی سادگی کا وہ حسن دیکھ آئے جس کی آپ نے بھی لمبی چوڑی تمہید باندھی۔"

بوبی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مس بوبی......! گاؤں کا حسن صرف ان کے اپنوں کے لئے ہوتا ہے۔"

فیروز نہ جانے کیوں تلخ ہو گیا......؟

"وہاں چھوٹے بڑے کی پہچان ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ ہے۔ وہ ک بڑوں کی عزت کرنا جانتے ہیں۔ بے عزتی نہیں کرتے۔"

فیروز غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اللہ اللہ......! یہ شان......!"

ٹینا مذاق کرنے والے انداز میں ہنسی اور بوبی حیران و پریشان سی ر جاتے ہوئے فیروز کو دیکھنے لگی۔

"ارے......! تو کیا فیروز کو غصہ بھی آتا ہے......؟"

بوبی بڑبڑائی۔

"غصہ......؟"

ٹینا ہنسی۔

"ان کا غصہ تو خطرناک ہوتا ہے۔ جیسے گائے بھینس کی غصے میں پٹائی کرتے ہیں، اسی طرح عورت کو پیٹ ڈالتے ہیں۔ پڑھ لکھ کر بھی گنوار کے گنوار ہی رہتے ہیں۔"

فیروز اس دن باقی پیریڈ چھوڑ کر گھر چلا آیا۔ بوبی کو ڈر تھا کہیں اس کی شکایت نہ کر دے۔ مگر جب وہ پہنچی تو فیروز معمول کے مطابق ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ بوبی اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بیٹھ گئی۔ مگر کھانا دیکھ کر وہ آگ بگولا ہوگئی۔

"یہ لوکی پکانے کا آرڈر کس نے دیا تھا......؟"

"بوبی بیٹے......! لوکی کا موسم ختم ہو رہا تھا۔ فیروز اسے پسند کرتا ہے۔ اس لئے ہم نے آج کہا، لوکی پکا لی جائے۔"

"ضرور پسند کرتا ہوگا......؟"

بوبی غصے میں چیخی۔

"میں تو اسے پسند نہیں کرتی۔ یہ تو آپ سب لوگ جانتے ہیں، پھر بھی......"

"بوبی......!"

رحمٰن صاحب زندگی میں پہلی بار اس پر بگڑ کر بولے۔

"آپ بات کرنے کے ایٹی کیٹس بھولتی جا رہی ہیں۔ آپ کو اتنی تمیز بھی نہیں کہ مہمان سے کس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے......؟ میز پر کیا یہی ایک ڈش موجود ہے جو آپ یوں بگڑ رہی ہیں......؟ ہمیں یہ باتیں سخت ناپسند ہیں۔ کم از کم دوسروں سے بات کرنے کی تہذیب ہونا

چاہئے......!"

"مہمان......؟"

بوبی، فیروز کو گھورتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

زندگی میں پہلی بار اسے ڈانٹ پڑی تھی، وہ بھی کسی دوسرے کی موجودگی میں۔ بوبی کا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے روئے یا پھر فیروز کو پیٹ ڈالے۔

"چچا جان......! میں مہمان تو نہیں......!"

فیروز نے بوبی کی طرف دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

"انسان جس جگہ رہتا ہے، اسے اپنا تصور کرتا ہے اور پھر آپ میرے اپنے ہیں، کوئی غیر نہیں۔ بوبی نے کوئی بری بات نہیں کہی۔ پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ اسے ڈانٹ دیا......؟"

بوبی نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"جانے دو......!"

رحمٰن صاحب لاپرواہی سے بولے۔ انہیں آج سچ مچ غصہ آگیا تھا۔

"نہیں چچا جان......! میں خود بوبی کو لاتا ہوں۔"

فیروز بھی اُٹھ گیا۔

"بہت اچھا لڑکا ہے......!"

بیگم رحمٰن اس کے جانے کے بعد بولیں۔

"ایسے لڑکے قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ مگر بوبی کا رویّہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گاڑی کے بارے میں بھی ضرور اس نے کچھ کہا ہوگا جو وہ موٹر سائیکل خرید لایا ہے۔ یہ ہمیشہ اس کی تذلیل کرتی ہے۔"

"مجھے خود فیروز بے حد پسند ہے۔ مگر بات تو بوبی کی پسند کی ہے۔ جب اسے ہی پسند نہیں تو فائدہ......؟"

"کہتے تو آپ ٹھیک ہیں۔ مگر فیروز جیسا لڑکا ہمیں ساری زندگی نہیں ملے گا۔"

ادھر جب فیروز، بوبی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ ابھی تک رو رہی تھی۔ فیروز تذبذب کے عالم میں آگے بڑھا۔

"مجھے افسوس ہے بوبی......! میری وجہ سے یہ سب ہوا۔ چلو چل کر کھانا کھا لو۔ چچا جان اور آنٹی پریشان......"

"انہیں کیا ضرورت پڑی ہے، میری وجہ سے پریشان ہونے کی......؟ تم جو آگئے ہو، ان کے لاڈلے......! میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ کہہ دو ان سے......!"

"پلیز بوبی......! میں نے کہا نان مجھے ہے، چلو میری وجہ سے ہی چلو......!"

"تم......؟"

بوبی نے حقارت سے اس کو دیکھا۔

"مجھے تم سے نفرت ہے، تمہاری وجہ سے......"

اس نے بات اُدھوری چھوڑ دی۔

"بس......! تم چلے جاؤ......!"

فیروز کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے چلا آیا۔

جیسے تیسے اس نے تھوڑا سا کھانا زہر مار کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بوبی کا کمرہ اس سے دو کمرے چھوڑ کر تھا اور اگر پورے بنگلے کا جائزہ لیا جاتا تو اس کا کمرہ آخری تھا۔

فیروز ہوسٹل چلے جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر پھر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے سوچا۔

"ایک سال اور رہ گیا ہے۔ آنٹی انکل کیا سوچیں گے......؟ میں

، بوبی کی نفرت کو دیکھا، مگر ان کی محبت کو محسوس نہ کیا۔ یہ ایک سال تو ے تیسے گزارنا ہی پڑے گا۔"

دوسری صبح وہ سب کے اُٹھنے سے قبل ہی یونیورسٹی چلا گیا۔

بوبی جب یونیورسٹی آئی تو فیروز لان میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ ی سیدھی اس کی طرف آئی۔

"فیروز......! تم ناشتے کے بغیر ہی چلے آئے......؟"

اس نے بھاری لہجے میں پوچھا۔

"بس......! یوں ہی، ناشتے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔"

فیروز نے حیرت سے اسے دیکھا۔

دراصل بوبی کو پاپا نے ڈانٹا تھا کہ وہ محض تمہاری وجہ سے ناشتہ کئے ر چلا گیا۔ اسی وجہ سے اس نے پوچھا اور پھر دوسری طرف بڑھ گئی۔

اس کے بعد ان دونوں کے درمیان بہت کم بات ہونے لگی۔ منا بھی یونیورسٹی میں ہی ہوتا۔ گھر میں وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ں۔

فیروز بھی زیادہ اسے مخاطب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ ہ یونیورسٹی میں دونوں کے درمیان بات چیت ضرور ہوتی۔

انہی دنوں فیروز کے گاؤں سے خط آیا اور فیروز کچھ دنوں کی چھٹی کر گاؤں چلا گیا اور اتفاق سے اسی رات بوبی کے مما پاپا ایبٹ آباد ہفتہ کے لئے بوبی کی پھوپھی کے یہاں چلے گئے۔ ان کے پوتے کا ہ تھا۔ بوبی نے جانے سے انکار کر دیا۔

فیروز کے گاؤں جانے کے بعد نہ جانے بوبی کیوں کچھ مضطرب سی ۔ وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ رہ رہ کر فیروز کا تصور ذہن پردوں پر اُبھرتا اور وہ بے چین ہو کر سوچتی۔

"آخر مجھے اس گاؤں والے کا خیال بار بار کیوں آ رہا ہے......؟"

چار بج گئے۔ وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہی۔ نوکروں کو چھٹی دے چکی تھی۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا اور وہ کمرے سے باہر نکلی۔ جب فیروز کے کمرے کے قریب سے گزری تو اس کا دروازہ بند تھا۔

بوبی نے کی ہول سے جھانکا تو فیروز کو کمرے میں سوتے پایا۔

”یہ کب آیا......؟“

اسے خبر نہیں ہوئی۔ اس نے ایک انجانی طمانیت سی محسوس کی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکی۔ مگر اس کی موجود میں اسے تحفظ کا احساس ہوا تھا۔

بوبی دروازہ چھوڑ کر کچن میں چلی آئی۔ فریج سے کھانا نکال کر گرم کیا، پھر چائے کا پانی رکھ کر اس نے کھانا میز پر لگایا اور فیروز کی طرف آئی۔ مگر وہ اب بھی بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔

بوبی کا جی چاہا اندر جا کر خود اسے اُٹھائے مگر وہ پہلے ہی اس کے بارے میں غلط خیالات کا شکار تھا۔ اس لئے خاموشی سے لان میں آئی اور گلدستہ بنانے لگی۔

موسم خوشگوار ہو رہا تھا۔ گلدستہ بنا کر وہ واپس آئی تو فیروز کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کا دل چاہا، پھولوں کا گلدستہ اس کے کمرے میں رکھ دے مگر پھر کچھ سوچ کر ڈائننگ روم میں لے آئی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ فیروز کو کیسے بلائے......؟

اس کی یہ مشکل حل ہوگئی۔ فیروز خود ہی ڈائننگ روم میں چلا آیا۔

بوبی نے خاموشی سے پلاؤ والی ڈیش اس کی طرف کھسکا دی اور وہ بھی خاموشی سے پلیٹ میں چاول ڈالنے لگا۔ کھانا خاموشی سے شروع ہوا اور خاموشی میں ختم ہوگیا۔

”چائے بناؤں......؟“

کھانے کے اختتام پر بوبی نے نظریں جھکائے جھکائے پوچھا۔

”لان میں بھجوا دینا......!“

کہتے ہوئے فیروز باہر نکل گیا۔

بوبی نے چائے دیکھی، وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ بوبی چائے لے کر ن میں گئی اور پھر گرم کر کے اسے ٹرے میں رکھا اور لان میں آ گئی۔

فیروز نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ اتنے تھوڑے عرصے میں وہ ت زیادہ بدل گئی تھی۔ وہ انا و غرور اور بات بات پر طنز کرنے والا لہجہ ل گیا تھا۔ اس نے نہ ہی گاؤں کے بارے میں کوئی طنزیہ بات کی تھی اور ہی اسے کچھ کہا تھا۔

ٹرے میز پر رکھ کر وہ فیروز کی طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو۔

”چائے بناؤں......؟“

فیروز اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا اور بولا۔

”مس بوبی......! چائے بنا دیجئے......!“

بوبی خاموشی سے چائے بنانے لگی۔ چائے بنا کر اس نے خاموشی سے کپ فیروز کی طرف بڑھا دیا۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور سیاہ گھٹائیں آسمان پر جمع ہو رہی تھیں۔

”اتنا خوش گوار موسم......!“

بوبی کو خبر بھی نہیں ہوئی اور فیروز چپکے سے اس کے من مندر کا دیوتا بن بیٹھا۔ یہ ایسا اچانک ہوا کہ بوبی سمجھ بھی نہ سکی۔

فیروز دُور اُفق پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ کافی دیر بعد اس نے اپنی پوری قوت جمع کر کے فیروز کو مخاطب کیا۔

”آپ گاؤں سے اتنی جلدی واپس کیسے آ گئے......؟“

”بس یوں ہی......! رانی نے مذاق میں خط لکھ دیا، اس لئے میں زیادہ نہ رُکا اور جلدی چلا آیا۔“

پھر وہ دونوں اِدھر اُدھر کی اور موسم کی باتیں کرتے رہے۔

صبح ناشتے کے وقت بھی وہ دونوں تنہا تھے۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ پورچ میں آئے۔ فیروز کو موٹر سائیکل کی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کا دل چاہا، آگے بڑھ کر روک لے۔ مگر پھر ہونٹ کاٹتی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں آگے پیچھے یونیورسٹی پہنچے۔ بوبی گاڑی لاک کر کے ٹینا کی طرف بڑھ گئی جو عارف کے پاس کھڑی باتوں میں مصروف تھی۔

''ارے......! یہ تمہارا پینڈو اتنی جلدی لوٹ آیا......؟''

ٹینا نے اس کے پیچھے آتے فیروز کو دیکھ کر چوٹ کی۔

''بکواس مت کرو......!''

بوبی دبی آواز میں دانت پیس کر بولی۔

''ہیلو مسٹر فیروز......!''

ٹینا فیروز سے مخاطب ہوئی۔

''تم اتنی جلدی کیسے آگئے......؟''

سامنے سے آتے ہوئے رزاق نے اس کا راستہ روک لیا۔

''بس یار......! کام زیادہ نہ تھا۔ اس لئے جلدی چلا آیا۔''

فیروز بھی خوش دلی سے مسکرایا۔ بریک میں بوبی حسب معمول باتیں کرنے کی بجائے چپ تھی۔

''کیا بات ہے......؟ بڑی چپ چپ نظر آ رہی ہو......؟''

سونیا نے پوچھا۔

''کہیں فیروز سے جھگڑا تو نہیں ہوگیا......؟''

ٹینا نے ہنس کر پوچھا۔

بوبی نے گھبرا کر فیروز کی طرف دیکھا جو ان سے تھوڑے فاصلے پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔

''بوبی......! تم نے جواب نہیں دیا......؟''

ٹینا کے کہنے پر فیروز بوبی کی طرف دیکھنے لگا۔ بوبی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملیں اور جھک گئیں۔ بوبی اُٹھ کر کلاس میں چلی گئی۔ وہ کیسے بتاتی کہ جسے آج تک وہ حقارت کی نظر سے دیکھتی آئی تھی، وہ تو اس کے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہوگیا ہے۔ اور فیروز جس کی کل تک اس کی نظروں میں کوئی اہمیت نہ تھی، آج اس کے لئے ایک دیوتا تھا۔ اور جس کی پوجا کرنے کے دل چاہتا۔ مگر فیروز کے بارے میں وہ اتنی ہی راز داری برتنا چاہتی تھی۔ بوبی کے اُٹھنے پر ان تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس پڑیں۔

ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ فیروز حسب معمول باتیں کرتا مگر بوبی زیادہ تر خاموش ہی رہتی۔

ایک ہفتہ بعد مما، پاپا بھی آگئے اور بوبی کے روّیے کو حیرت انگیز طور پر بدلا ہوا محسوس کیا۔

اس روز بھی فیروز اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ رہا تھا کہ بوبی اس کے قریب چلی آئی۔

''فیروز......! آپ میرے ساتھ گاڑی میں جایا کریں......!''

اس نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔

فیروز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔

''موٹر سائیکل اور گاڑی میں کوئی فرق نہیں مس بوبی......!''

اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

''اگر آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں گے تو کوئی حرج نہ ہوگا......؟''

''حرج تو کوئی نہیں مگر مجھے موٹر سائیکل بہت اچھی لگتی ہے۔''

فیروز اسے بیتے دن یاد دلانا نہیں چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے......! اگر آپ گاڑی پر نہیں بیٹھیں گے تو میں موٹر سائیکل پر بیٹھ جاؤں گی۔''

بوبی دل کی بات زبان پر لے آئی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں......!"

فیروز کے منہ سے یہ الفاظ سن کر بوبی کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اور وہ تو چاہتی یہی تھی، فیروز اس کے قریب رہے، صرف اس کا بن کر۔

موٹر سائیکل پر بیٹھی وہ خود کو دُنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کر رہی تھی۔ یونیورسٹی میں جس نے بھی یہ منظر دیکھا، حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔

"بھلا رات اور دن بھی آپس میں ملے ہیں......؟"

مگر ایسا ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ فیروز سیدھا کلاس میں چلا گیا اور بوبی کو سونیا، بینا نے گھیرے میں لے لیا۔

"بوبی......! آخر یہ چکر کیا ہے......؟ ہمیں تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے......؟"

"تم لوگوں کو تو ہر بات میں کچھ نہ کچھ ڈھونڈنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ گاڑی خراب تھی، اس لئے فیروز کے ساتھ چلی آئی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے......!"

وہ تینوں اسے چھوڑ کر الگ ہو گئیں اور بوبی بھی مسکراتی ہوئی کلاس میں آ گئی۔

پھر تو روز ایسا ہی ہونے لگا۔ گھر میں مما پاپا حیران تھے اور یونیورسٹی میں سب دوست۔ مگر فیروز سب سے بے نیاز تھا اور بوبی تو جیسے اس کی داسی بن گئی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے اسی کا خیال رہتا۔

صبح کو جب وہ تیار ہوتا تو بوبی کا جی چاہتا، ایک ایک چیز خود آگے بڑھ کر پکڑائے اور اس سے کہے۔

"تم بہت خوب صورت ہو فیروز......! اپنی خوب صورتی کا احساس کرو۔"

وہ اپنی پاگل سوچوں پر حیران ہوتی اور اس بات پر خوش بھی کہ وہ کم از کم پیار محبت سے اس سے بات تو کرتا ہے۔

انگلش کا پریڈ مس تھا۔ فیروز بیٹھا نوٹس بنا رہا تھا اور بوبی قریب بیٹھی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

"مس بوبی......! آپ نوٹس نہیں بنا رہیں......؟ کیا بات ہے......؟"

"فیروز......! میں آپ سے لے لوں گی۔ لیکن ایک بات، آپ مجھے مس بوبی نہیں، صرف بوبی کہا کریں۔"

فیروز نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا مگر خاموش ہی رہا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ فائنل ایگزام سر پر آ گئے۔ اسی دوران میں بوبی، فیروز سے کافی بے تکلف ہو چکی تھی اور فیروز بھی اس سے بے تکلف ہو گیا۔ مگر اظہارِ محبت دونوں میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔

بوبی اس کی وجہ یہ سمجھتی، جب وہ دوسروں کو ایسی حرکت کرتے نہیں دیکھ سکتا پھر خود ایسی چھچھوری حرکت کیسے کر سکتا تھا......؟ مگر بہرحال اس بات سے انکار نہیں تھا کہ بوبی اسے بے انتہا چاہنے لگی تھی۔

یونیورسٹی میں الوداعی پارٹی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ یہ سب لوگ خوش بھی تھے اور افسردہ بھی۔ خوش اس لئے کہ وہ اپنی تعلیم ختم کر کے اپنی عملی زندگی میں داخل ہو رہے تھے اور افسردہ اس لئے کہ ایگزام کے بعد وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اور پھر کون جانے کبھی ملاقات ہو کہ نہ ہو......؟

سب لوگ ایک دوسرے کے لئے تحائف خرید رہے تھے۔ بوبی نے فیروز کے لئے ایک خوب صورت گولڈن چین بنوائی اور اپنے پاپا سے بھی کہا کہ وہ فیروز کے لئے ایک خوب صورت سوٹ سلوائیں۔

پارٹی سے ایک دن قبل ہی وہ چین لئے فیروز کے کمرے میں چلی

آئی۔ فیروز کہیں باہر جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ فیروز نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بیٹھنے کے لئے کہا مگر بوبی بیٹھنے کی بجائے اس کے قریب چلی آئی۔

"کل الوداعی پارٹی ہے۔ آپ کے لئے یہ گفٹ ہے، میری طرف سے۔"

بوبی نے ڈرتے ڈرتے چین والی ڈبیہ اس کی طرف بڑھائی کہ کہیں واپس نہ کر دے۔ مگر فیروز نے مسکراتے ہوئے اس کا تحفہ قبول کیا تو وہ مارے خوشی کے فوراً واپس پلٹنے لگی۔

"سنو بوبی......!"

فیروز نے آواز دی۔ پھر ایک پیکٹ اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"یہ تمہارے لئے ہے۔"

پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"دینا تو کل پارٹی میں تھا، مگر چونکہ تم آج ہی دے رہی ہو، اس لئے تمہیں خالی ہاتھ لوٹانا اچھا نہیں لگتا۔"

"یہ میرے لئے ہے......؟"

خوشی کے مارے بوبی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح بھاگتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے بڑے پیار سے پیکٹ کھولا اور دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں بلیو رنگ کی خوب صورت ساڑھی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان پر ستارے چمک رہے ہوں۔ بوبی اُلٹی سیدھی ساڑھی لپیٹ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے چلی آئی۔ آئینہ میں ایک نظر خود کو دیکھا اور شرما کر سر جھکا لیا۔

پارٹی میں جانے کے لئے بوبی تیار ہو کر باہر آئی تو مما حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ارے......! یہ ساڑھی تم نے کہاں سے لی......؟"

"مما......! یہ ساڑھی فیروز نے دی ہے۔"

یہ کہتی ہوئی بوبی فیروز کی طرف آ گئی۔

فیروز کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ میز پر پاؤں ٹکائے جھک کر جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا۔ آج وہ شلوار سوٹ کی بجائے بلیو پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا اور بوبی کی دی ہوئی چین گلے میں چمک رہی تھی۔ بوبی کو وہ اس وقت سب سے الگ اور منفرد لگا۔ کسی کی موجودگی کا احساس کر کے اس نے سر اُٹھایا اور پھر مبہوت سا دیکھتا رہ گیا۔

"آج تو تم بہت بدلی بدلی سی لگ رہی ہو......؟"

فیروز نے چونکہ اسے پہلی بار ساڑھی میں دیکھا تھا، اس لئے مسکرا کر بولا۔

بوبی یوں لگ رہی تھی جیسے آسمان پر ستاروں کے بیچ چودھویں کا چاند چمک رہا ہو۔ بوبی نے سوچا۔

"شاید وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

وہ کھڑی رہی کہ شاید فیروز کوئی اور بات کہے۔ مگر وہ اس سے بے پرواہ بال بنا رہا تھا۔ بال بنا کر وہ بوبی کے ساتھ مما پاپا کے پاس آیا۔

ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر مما پاپا حیران رہ گئے۔ اور یہ دونوں اجازت لے کر پورچ میں چلے آئے۔ فیروز موٹر سائیکل کی طرف بڑھا تو بوبی نے اسے روک دیا۔

"آج گاڑی میں چلیں گے......!"

فیروز بھی نہ جانے کیا سوچ کر مسکراتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

یونیورسٹی میں ہر شخص نے انہیں حیرت سے دیکھا مگر بوبی کو آج کسی کی پرواہ نہ تھی۔ یونیورسٹی میں یہ ان کا آج آخری دن تھا اور بوبی

فیروز کے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش میں تھی مگر ایک موقع پر سونیا اور ٹینا اسے گھسیٹ کر فیروز سے دُور لے ہی گئی۔

''کیا بات ہے......؟ یہ گنوار، دیہاتی آج بڑا بن ٹھن کر آیا ہے......؟ گلے میں چین ڈال رکھی ہے۔ تمہاری ساڑھی سے میچنگ کرتا سوٹ بھی پہن رکھا ہے اور کافی عرصہ سے تم نے اس کا تذکرہ بھی بند کر رکھا ہے......؟ خیریت تو ہے......؟ کہیں دال میں کالا تو نہیں......؟''

''تم لوگوں کے جو جی میں آئے سمجھتی پھرو......!''

بوبی ہاتھ چھڑا کر پھر فیروز کے قریب چلی آئی۔ فیروز کی تو وہ دیوانی ہو چکی تھی۔

''کیا محبت اتنا شدید روحانی جذبہ ہے......؟''

وہ تنہائی میں خود سے سوال کرتی اور پھر خود ہی کہتی۔

''محبت کہتے ہی اس کو ہیں......!''

پارٹی اختتامی لمحوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر تحائف کے تبادلے ہوئے اور پارٹی پھر ختم ہوگئی۔

بوبی، فیروز کے ساتھ امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ فیروز اسٹڈی کے لئے گاؤں نہیں گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ کچھ کتابیں لائبریری سے لے کر پڑھنا تھیں، دوسرے اس کو خیال تھا کہ وہاں کام کی وجہ سے صحیح تیاری نہ ہو سکے گی۔

امتحان شروع ہوئے۔ بوبی نے فیروز کے ساتھ ہر پرچہ محنت سے دیا اور جب آخری پرچہ دے کر گھر آئی تو کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اتنے دن جاگنے کی وجہ سے آج وہ لمبی تان کر سونا چاہتی تھی۔

صبح اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ باہر آئی تو گھر کی دُنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ فیروز سامان باندھے جانے کے لئے بالکل تیار کھڑا تھا۔

''فیروز......! تم جا رہے ہو......؟''

بوبی نے مما پاپا کی پرواہ کئے بغیر پوچھا۔

''ہاں بوبی......! میں جا رہا ہوں۔ جس کام سے یہاں آیا تھا، وہ ہوگیا۔ اب تو جانا ہی بنتا ہے۔''

''پھر کب آؤ گے......؟''

بوبی نے بے قراری سے پوچھا۔

''پھر......؟''

زیر لب کہتے ہوئے فیروز نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر رحمٰن صاحب کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

''بوبی......! تم گاؤں آنا......! باغات میں گھری ہوئی وہ جگہ یقیناً تمہیں پسند آئے گی۔''

''میں ضرور آؤں گی۔''

بوبی نے گرم جوشی سے کہا اور فیروز رُخصت ہوگیا۔

فیروز کیا گیا، بوبی کی ہر بہار جیسے روٹھ گئی۔ وہ سارا دن گھر میں اِدھر اُدھر پھرتی یا پھر فیروز کے خط کا انتظار کرتی۔ مگر نہ خط آنا تھا اور نہ آیا۔

اور بوبی کی بے چینیاں بڑھتی گئیں۔

''فیروز......! میری زیادتیوں کی سزا اس طرح تو نہ دو......!''

وہ تنہائی میں روتی، پھر وہ سوچتی۔

''اس نے کون سا وعدہ کیا تھا......؟ یا پھر قسمیں کھائیں تھیں......؟ جس کا اسے پاس ہوتا۔''

ایک مہینہ اسی بے چینی میں گزر گیا اور جب وہ برداشت نہ کر سکی تو گاؤں جانے کی تیاری کر بیٹھی۔ پاپا خود اسے اسٹیشن چھوڑنے آئے۔ بوبی کی بے چینیوں کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مگر فی الحال وہ مصروف تھے۔ اس لئے بوبی کو اکیلے ہی بھیج دیا۔

اسٹیشن سے ایک تانگے والے کو فیروز کے گاؤں کا پتہ بتا کر وہ

آرام سے تانگے میں بیٹھ گئی۔

تانگہ جدھر جدھر سے گزر رہا تھا، بوبی اپنے آس پاس کے مناظر کو دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب باغات تھے۔ زیادہ تر مالٹا اور سنگترہ تھا یا پھر لیموں کے باغات تھے۔ باغات کا سلسلہ ختم ہوتا تو کھیت اُبھر آتے۔ پھر کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوتا تو باغات نظر آنے لگتے۔

بوبی ان نظاروں کو آنکھوں میں جذب کر رہی تھی۔ اس کی نظر جہاں تک جاتی، باغات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔

"فیروز نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ باغات میں گھری ہوئی یہ جگہ تمہیں پسند آئے گی۔"

اور یہ جگہ اسے بے حد پسند آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی رہی تھی۔

"مجھے دیکھ کر فیروز حیران بھی ہوگا اور خوش بھی۔"

اس نے سوچا۔

"اگر اس بار بھی فیروز نے کوئی بات نہ کی تو میں خود فیروز سے کہوں گی۔ فیروز......! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مگر میں یہ سب کیسے کہوں گی......؟"

وہ ان ہی خیالات میں گم تھی کہ تانگہ اچانک ایک لمبی چوٹی جدید اور قدیم امتزاج میں ڈھلی ہوئی عمارت کے سامنے رُک گیا۔ بوبی نے کرایہ ادا کیا اور بیگ پکڑ کر جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔

سامنے سے ایک خوب صورت معصوم سی لڑکی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی آ رہی تھی۔ بوبی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگوار شکنیں پڑ گئیں۔

"اے بی بی......! کیا بات ہے......؟ کیوں منہ اُٹھائے سیدھی اندر چلی آ رہی ہو......؟"

"یہ شاید فیروز کی بہن ہے۔"

بوبی نے دل میں سوچا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ فیروز کا گھر ہے ناں......؟ میں ان کی مہمان ہوں۔ لاہور سے آئی ہوں۔"

بوبی نے ایک ہی سانس میں وضاحت کی کہ پھر وہ کہیں بات نہ کاٹ دے۔

"اچھا اچھا......! مہمان ہو تم......! آؤ میرے ساتھ......!"

وہ بوبی کو ساتھ لئے آگے بڑھ گئی۔ پھر ایک بڑے کمرے کے سامنے رُکتی ہوئی بولی۔

"یہ بے جی کا کمرہ ہے۔ تم اندر چلی جاؤ......!"

وہ بوبی کو چھوڑ کر واپسی کے لئے مُڑ گئی۔

بوبی جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔ فیروز کی ماں اور دونوں بہنیں اندر موجود تھیں۔ بوبی نے اپنے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوشی سے ملیں۔ گھر کے ہر فرد نے اسے خوش آمدید کہا۔ مگر فیروز گھر پر نہیں تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر بوبی سو گئی۔

شام ہو رہی تھی جب وہ اُٹھی۔ باہر آئی تو فیروز برآمدے میں کھڑا نظر آیا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کے پاس کھڑا تھا۔ وہ شاید اسے بوبی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ دفعتہً اس کی نظر بوبی پر پڑی تو وہ خوش دلی سے مسکرا دیا۔

"بوبی......! تم......؟ اُمید نہیں تھی کہ تم اتنی جلد آؤ گی......؟"

اس کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"آپ نہ خود آئے، نہ کوئی خط لکھا۔ میں نے سوچا شاید آپ بھول گئے ہوں۔ لیکن چونکہ میں نہیں بھولی تھی اس لئے خود ہی چلی آئی۔"

بوبی کے ہونٹوں پر شکوہ مچل گیا۔

"دراصل یہاں آکر کام میں ایسا اُلجھا کہ خط لکھنے کا وقت ہی نہیں

ملا۔''

فیروز شرمندہ سا ہو گیا۔

''خیر......! تم کہو......! فر کیسا گزرا......؟''

''بس......! اس تصور میں کٹ گیا کہ آپ سے ملنے آ رہی ہوں۔''

جواب دینے کی بجائے فیروز بولا۔

''چلو آؤ......! لان میں چلتے ہیں۔''

وہ اسے لئے لان میں چلا آیا۔

بوبی لان دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بے حد خوب صورت، خوش نما، بڑے بڑے پھول لگے ہوئے تھے۔ شام جھک آئی تھی۔ ہوا کے جھونکے خوش گوار احساس دلا رہے تھے۔

''گاؤں والے بھی اتنے نفاست پسند ہوتے ہیں۔''

بوبی نے دل میں سوچا۔

فیروز ممی پاپا کے متعلق پوچھتا رہا اور بوبی آہستہ آہستہ جواب دیتی رہی۔ تب ہی نوکر کھانے کا بلاوا لے کر آ گیا۔

میز کی بجائے زمین پر دستر خوان بچھا تھا۔ بوبی، فیروز کی بہنوں کے درمیان بیٹھ گئی۔ دستر خوان پر دو تین کھانے موجود تھے۔ مگر فیروز کی بہن کنیز بولی۔

''باجی......! یہ لیجئے، مرغ، گھیا میں نے خود پکایا ہے۔'' فیروز چونک کر کنیز کی طرف دیکھنے لگا۔ بوبی بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں آج سے ایک سال پہلے کا واقعہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اور آنکھیں بھیگ گئیں فیروز اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''کنیز......!''

وہ بہن سے مخاطب ہوا۔

''بوبی کو لوکی پسند نہیں، کوئی دوسری چیز دو......!''

''نہیں نہیں......! میں یہی کھاؤں گی۔''

بوبی جلدی سے بول پڑی۔

''کافی مشکل کام ہے۔''

کہتے ہوئے فیروز اپنی پلیٹ میں سالن لگانے لگا۔

دوسری صبح فیروز گھر پر ہی رہا اور ناشتے کے بعد بوبی کو باغات کی سیر کے لئے لے گیا۔ باغات دکھاتے ہوئے وہ تفصیل سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ بوبی اس کے قدموں پر قدم رکھ کر چل رہی تھی۔ اسی وقت ایک درخت سے چھلانگ لگا کر ایک لڑکی سامنے آ گئی۔

''اے فیروز......! کل دوپہر میں، میں نے تیرے گھر ایک شہر کی چھوکری کو چھوڑا تھا۔ کون ہے وہ......؟ اور کیا لگتی ہے تیری......؟''

بوبی دو قدم پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ یہ سن کر ہنس پڑی۔

''شش......!''

اسے فیروز کی سرگوشی نما آواز سنائی۔ پھر وہ انگوٹھے سے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ دیکھو سلام کرو......!''

''سلام بی بی......!''

وہ ماتھے پر ہاتھ لے جا کر بولی۔ دوسرے ہاتھ میں کنوں کے رخت کی ایک ٹہنی تھی جس کے ساتھ پانچ چھ کنوں لگے ہوئے تھے۔

''چلو......! تم یہاں کیا کر رہی ہو......؟''

فیروز نے اسے ڈانٹ دیا۔

''تم سے مطلب......؟ میں مالکن ہوں باغوں کی۔ جب چاہے ہاں آؤ، تم کون ہوتے ہوئے ڈانٹنے والے......؟''

''غلطی ہوگئی مالکن جی......! معافی دے دیں۔ مگر اپنے اس خادم ی بھی ایک بات مان لیجئے اور تشریف لے جایئے......! باقی ایک بات،

درخت سے صرف کینو توڑا کریں، ٹہنی نہیں......!''

''ہوں......!''

رانی زبان نکال کر چڑاتی ہوئی بھاگ گئی۔

''یہ کون تھی......؟''

بوبی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''رانی تھی......!''

فیروز کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک اُٹھیں۔

''اسی گاؤں میں رہتی ہے......؟''

''گاؤں میں بھی اور دل میں بھی......!''

فیروز کے لہجے میں غیر معمولی مٹھاس تھی۔

''کیا مطلب......؟''

بوبی چونک کر بولی۔

''اب آپ سے کیا چھپانا......؟ مسز فیروز سمجھ لیجئے......!''

''کیا......؟''

بوبی لڑکھڑا سی گئی۔

مگر فیروز اس سے بے نیاز درختوں پر نظر جمائے کہہ رہا تھا۔

''یہ رانی ہے، میرے بچپن کی ساتھی......! ہم ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ پرائمری کے بعد رانی نے تعلیم چھوڑ دی مگر میرا اور اس کا ساتھ نہ چھوٹا۔''

''تم اس سے شادی کرو گے، جس کی تعلیم صرف پرائمری تک ہے......؟ نبھا کیسے ہوگا......؟''

''نبھا ڈگریوں سے نہیں، دلوں سے ہوتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس تعلیم کا کیا فائدہ جو انسان کو تمیز بھی نہ سکھا سکے......؟ اگر تعلیم کا مقصد محض یونیورسٹی میں ٹائم پاس کرنا یا پھر دوسروں پر

عب ڈالنے کے لئے انگریزی سیکھنا ہے تو آپ ہی بتائیے......! کیا یہ اچھی ت ہے......؟''

بوبی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے......؟ اور کیا نہ کہے......؟ خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے ر وہ اس میں سما جائے۔ مگر یہ ناممکن تھا۔ اس کا جی چاہا، فیروز کے پاؤں ڑ لے اور کہے۔

''فیروز......! تم میری زندگی ہو۔ میں تم سے الگ ہو کر جینے کا ور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر یہ میری زیادتیوں کا انتقام ہے تو مجھے معاف کر ......! مجھے کوئی بھی درجہ دے کر اپنے پاس رکھ لو......!''

وہ خاموش رہی۔ فیروز حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے بوبی......؟ تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو......؟''

''نہیں......! ایسی کوئی بات نہیں......!''

بوبی نے بڑی مشکل سے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو وکا۔

''فیروز......! اب گھر چلیں، میں بہت تھک گئی ہوں۔''

اس کا لہجہ نڈھال سا تھا۔ فیروز نے یوں اسے دیکھا جیسے سب کچھ بجھ رہا ہو اور جیسے اس نے اپنا شک دُور کرنے کے لئے ہی رانی کا ذکر ھیڑا ہو۔

وہ رات بوبی کی زندگی کی پہلی اذیت ناک رات تھی وہ جو سونے کا چہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ جس نے آج تک زندگی میں کوئی دُکھ یں سہا تھا وہ آج بلک بلک کر رو رہی تھی۔ جس کے لئے یہاں آئی تھی وہ کسی دوسرے کی محبت تھا۔

اس کا جی چاہا وہ رانی سے اپنے پیار کی بھیک مانگ لے یا پھر سے گولی مار دے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک عام سی لڑکی ہو کر فیروز کے

دل کی مالک تھی اور وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے دل میں کوئی مقام نہ بنا سکی تھی۔

بے شک وہ چاہتی تو اس کے پاپا فیروز کے باپ کو بوبی کے لئے مجبور کر سکتے تھے اور فیروز بھی ماں باپ کا کہنا مان لیتا۔ مگر کیا وہ بوبی کو بھی وہ مقام دیتا جو رانی کو دے چکا تھا......؟

"نہیں......! کبھی نہیں......!"

خود فیروز نے کہا تھا۔

"محبت روحوں کے لئے ہوتی ہے۔"

جب روح رانی کی تھی تو پھر وہ خالی فیروز کو لے کر کیا کرتی......؟

وہ رات فیصلے کی رات تھی اور آخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔

صبح وہ جانے کے لئے تیار تھی۔ اس کے اتنی جلدی جانے پر سب ہی حیران تھے۔ صرف فیروز جانتا تھا کہ وہ کیوں جا رہی ہے......؟

فیروز کے علاوہ سب نے رُکنے کے لئے کہا۔ مگر وہ چلی آئی۔ فیروز خود اسے اسٹیشن چھوڑنے آیا۔ گھر سے ابھی تھوڑی دُور آئے تھے کہ سامنے سے آتی ہوئی رانی نے جیپ روکنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے......؟"

فیروز نے جیپ روکتے ہوئے پوچھا۔ مگر رانی اسے جواب دینے کی بجائے بوبی سے مخاطب ہوئی۔

"ارے......! آپ اتنی جلدی واپس جا رہی ہیں......؟"

بوبی نے اس کو دیکھا اور پھر چونک پڑی۔ اس کے پیار کی نشانی وہ گولڈن چین جو اس نے فیروز کو دی تھی، وہ رانی نے پہن رکھی تھی۔ بوبی کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ اس نے فیروز کو دیکھا۔ وہ رانی کو ڈانٹ رہا تھا۔

"چلو نیچے اُترو......!"

"میں بھی ساتھ جاؤں گی۔"

مگر فیروز نے اسے نیچے اُتار کر جیپ آگے بڑھا دی۔ اسٹیشن یا۔ فیروز نے بوبی کا بیگ اُٹھایا اور ایک ہاتھ کے سہارے کے لئے بوبی ی طرف بڑھا دیا۔ بوبی کا جی چاہا، اس ہاتھ کو نظر انداز کر دے مگر وہ تو یوتا تھا۔ پجارن کیسے یہ جرأت کر سکتی تھی......؟ اور یہ ضروری تو نہیں کہ ارن دیوتا کے قدموں میں ہی رہے۔ اس کا مطلب تو پوجا سے ہوتا ہے۔ یوتا کے پاس رہے یا دُور......؟

اس نے بھی فیروز کا ہاتھ تھام لیا اور اسٹیشن کے اندر چلی آئی۔ اڑی میں بیٹھ کر وہ فیروز کو دیکھنے لگی جو کھڑکی کے قریب کھڑا اس سے تیں کر رہا تھا۔ مگر وہ باتیں سن کہاں رہی تھی......؟ بس یہی دل چاہ رہا تھا ہ فیروز کو دیکھتی جائے۔

گاڑی نے رینگنا شروع کیا اور فیروز کھڑکی سے ہٹ گیا۔ وہ بوبی ی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا مگر مجبور تھا۔

"جاؤ بوبی......! مجھے یقین ہے شہر کے ہنگاموں میں تم بہت جلد ں بات کو فراموش کر دو گی کہ کبھی کوئی فیروز تمہاری زندگی میں آیا تھا۔"

اس نے آخری بار ہاتھ ہلایا اور بوبی اتنی دیر سے ضبط کئے بیٹھی ی۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ نکلے۔ گاڑی رفتار پکڑتی ہوئی آگے نکل گئی ر اس کا دیوتا بہت پیچھے رہ گیا۔

مگر نہیں......! وہ تو اس کے دل میں موجود تھا کیونکہ محبت روحوں کے لئے ہوتی ہے اور وہ اپنی روح چھوڑ کر صرف جسم لے کر جا رہی تھی۔



اُڑان

پی آئی اے کا ائیروپلین 707 فضاء میں سیدھا ہوتے ہی مسافروں نے خود کو سیٹ بیلٹ سے آزاد کیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے آس پاس کا جائزہ لینے لگے۔

خوب صورت ائیر ہوسٹس اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ مسافروں کی مزاج پرسی کرنے لگیں۔ مسافر ابھی جائزہ لینے میں ہی محو تھے کہ اچانک کاک پٹ کا دروازہ کھلا اور یونیفارم میں ملبوس خوب صورت پائلٹ باہر آیا۔ فرسٹ کلاس کے پہلے درجے کی نشستوں میں سے ایک نشست پر بیٹھی ہوئی خاتون کے پاس آیا۔

''میڈم......! آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے......؟''

اس نے جھکتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''شکریہ کیپٹن......!''

خاتون نے جواب دیا۔ خاتون کی عمر پینتیس کے قریب تھی مگر وہ چھبیس، ستائیس سے زیادہ کی نظر نہیں آ رہی تھی۔ خاتون کے شکریہ کہنے پر کیپٹن نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور واپس کاک پٹ میں چلا گیا۔

فرسٹ کلاس میں بیٹھے ہوئے تمام مسافر کیپٹن کی آمد کی وجہ سے اس خاتون کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

پی آئی اے کا یہ طیارہ لاہور سے کراچی کی پرواز پر تھا۔ دس منٹ بعد کاک پٹ کا دروازہ دوبارہ کھلا اور وہی پائلٹ اس خاتون کے پاس جا کر پہلے والے مخصوص لہجے میں بولا۔

''میڈم......! اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلاتکلف فرمائیے گا۔''

''تھینکس......! اب کے خاتون نے بھی مسکرا کر کہا اور گود میں پڑا ہوا میگزین اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی تو ہواباز واپس چلا گیا۔

اس خاتون کے بالکل سامنے کی نشست پر ایک بائیس سالہ لڑکی بیٹھی اسے گھورنے لگی۔

''بھائی جان......!''

وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے بولی۔

''آپ اس سامنے والی عورت کو دیکھ رہے ہیں......؟ جہاز کا کیپٹن دو بار اس کے پاس آیا ہے۔''

''کون سی عورت......؟''

اشرف نے میگزین سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

''وہی جو سامنے بیٹھی ہے......!''

اشرف نے سامنے دیکھا اور کھو سا گیا۔ اتنی عمر کے باوجود وہ خوب صورتی کا مجسمہ تھی۔ گلاب رنگ کے کپڑے اس کے رنگ کو بھی گلابی کیے ہوئے تھے۔

''بھیا......! آپ کیا دیکھنے لگے......؟''

گڑیا نے پوچھا تو اشرف نے چونک کر گڑیا کی طرف دیکھا اور بولا۔

''کیپٹن کی واقف ہوں گی۔''

”وائف نہیں ہو سکتی......؟“

گڑیا فوراً بولی۔

”کیونکہ کیپٹن کی عمر کم لگتی ہے۔“

اس وقت کاک پٹ کا دروازہ پھر کھلا اور پائلٹ باہر آیا۔ اشرف نے غور سے دیکھا۔ واقعی اس کی عمر انتیس تیس سال کے قریب تھی۔

”بھلا......!“

گڑیا کیپٹن کے خوب صورت چہرے پر نظریں جمائے بولی۔

”لگتا ہے یہ کیپٹن کی شناسا ہے۔“

اس سے قبل گڑیا کچھ اور کہتی، اس خاتون نے دبی دبی آواز اُبھری۔

”مسٹر......! میں یہ نہیں دیکھوں گی کہ جہاز میں دوسرے مسافر بھی ہیں۔ تھپڑ مار دوں گی۔ بہتر ہے آپ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“

”اوکے......!“

اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ گڑیا جل ہی تو گئی۔

کاش اس میڈم کی جگہ وہ خود وہاں ہوتی۔ اس کے دل نے تمنا کی۔ اس وقت ائیر ہوسٹس چائے سرو کرتی ہوئی ان کے قریب آئی۔ اشرف اور گڑیا نے شکریہ کہتے ہوئے چائے کے کپ اُٹھائے اور پھر بسکٹ لیتے ہوئے گڑیا نے پوچھا۔

”سنئے......! وہ جو خاتون سامنے بیٹھی ہیں، کیا کوئی پاپولر ہستی ہیں......؟“

”وہ کون......؟“

ائیر ہوسٹس نے پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا، پھر بولی۔

”اچھا اچھا......! وہ گلابی کپڑوں والی......؟ وہ ہمارے ملک کی

ممتاز مصورہ آرزو رضا ہیں۔“

اشرف نے چونک کر آرزو کی طرف دیکھا۔ وہ خود اس کا مداح تھا۔ جب بھی آرزو رضا کی تصویروں کی نمائش ہوتی، وہ ضرور دیکھتا۔ مگر آرزو رضا سے کبھی ملاقات نہ ہوتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کبھی دوسرے مصوروں کی طرح نمائش گاہ میں موجود نہ ہوتی۔

اس کی تصویروں سے سب کچھ اتنا واضح ہوتا کہ اس کے مداحوں کو کبھی کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ البتہ اس کی تصویروں میں محرومی، اُداسی اور جستجو کا عنصر غالب تھا۔ آرزو رضا رنگوں کا نفیس طریقے سے آزادانہ استعمال کرتی تھی اور اس کی زیادہ تر پینٹنگ واٹر کلر میں ہوتی تھیں جو ایک مشکل کام تھا۔

اشرف سوچوں میں گم تھا اور گڑیا ائیر ہوسٹس سے پوچھ رہی تھی۔

”سسٹر......! وہ کیپٹن ان کے کیا لگتے ہیں جو بار بار ان سے بات کرنے آتے ہیں......؟“

”وہ کیپٹن شہزاد ہیں۔“

ائیر ہوسٹس مسکراتے ہوئے بولی۔

”وہ مس آرزو رضا کے چھوٹے بھائی ہیں۔ دراصل آج کیپٹن عالیہ جو کہ آرزو رضا اور شہزاد کی چھوٹی بہن ہے، اپنی افتتاحی پرواز پر پلین کراچی لے کر جا رہی ہیں۔ کیپٹن شہزاد ان کے پارٹنر کی حیثیت سے ہیں۔ چونکہ مس آرزو رضا ان کی بہن ہیں، اس لئے ساتھ جا رہی ہیں اور کیپٹن شہزاد انہیں تنگ کرنے کی غرض سے بار بار کاک پٹ سے باہر آتے ہیں۔“

ائیر ہوسٹس آگے بڑھ گئی، تب ہی کیپٹن شہزاد پھر چلے آئے۔

”آپ اگر کاک پٹ دیکھنا چاہیں تو تشریف لائیں۔“

انہوں نے جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

”تو تم باز نہیں آؤ گے کیپٹن......؟“

"جی ہاں......!"

کیپٹن شہزاد ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے پھر کاک پٹ میں داخل ہوگئے۔

طیارہ کراچی کی حدود میں داخل ہوا تو وہاں کا موسم کافی خوف ناک تھا۔ تیز آندھی طوفان کے ساتھ بجلی چمک رہی تھی اور طیارے کو مشکلات کا سامنا تھا۔ تیز ہوا کے باعث طیارہ ڈگمگا رہا تھا۔ مسافروں کو حفاظتی بیلٹ کس لینے کا حکم دے دیا گیا۔

آرزو مضطرب انداز میں جہاز کے شیشوں سے باہر دیکھنے لگی جہاں تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ جہاز اچانک بائیں جانب جھکا اور مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے جو لوگ گپ شپ کر رہے تھے، اب ان کی آنکھوں میں موت کی دہشت طاری تھی۔ ایئر ہوسٹس ایک دوسرے پر گرتی ہوئی سنبھل رہی تھیں۔ پہلی بار سفر کرنے والے مسافر تو کچھ زیادہ ہی پریشان تھے۔

آرزو رضا حفاظتی بیلٹ کسنے کے باوجود بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے تھے اور آنکھوں میں دُنیا جہاں کی وحشت چھائی ہوئی تھی۔

جہاز کو اچانک ایک زور دار جھٹکا لگا اور آرزو کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ایئر پورٹ پر پہنچنے تک طیارہ اسی حالت سے دوچار رہا تاہم کیپٹن عالیہ مطمئن تھی اور ایئر پورٹ پر اُترنے کے لئے سگنل کا انتظار کرنے لگی۔ سگنل ملتے ہی طیارہ نیچے کو جھکنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ رن وے پر ٹیکسی کرنے لگا۔ پھر وہ رُک گیا۔

جہاز رُکتے ہی کیپٹن شہزاد کاک پٹ سے باہر آئے اور بہن کو دیکھتے ہی پریشان ہوگئے۔ اشرف کا خیال تھا وہ ویٹنگ روم میں آرزو سے

تفصیل سے بات کریں گے۔

تھوڑی کوشش کے بعد آرزو ہوش میں آگئیں۔ تب تک مسافر اُتر چکے تھے۔ پھر یہ بھی فلائٹ انجینئر خالد، فرسٹ آفیسر رشید، کیپٹن شہزاد اور کیپٹن عالیہ آرزو کے ساتھ طیارے سے باہر آئے تو ان کا بے حد شاندار استقبال کیا گیا۔

تیز بارش اگرچہ رُک چکی تھی مگر ہلکی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ کیپٹن عالیہ کو ہاروں سے تقریباً لاد دیا گیا۔ کیونکہ انہوں نے خطرناک موسم میں شاندار فلائنگ کی تھی جبکہ یہ ان کی پہلی افتتاحی پرواز تھی۔ اشرف اور گڑیا کوشش کے باوجود آرزو سے بات نہ کر سکے کیونکہ وہ شہزاد اور عالیہ کے ساتھ ہوٹل چلی گئی تھی۔

آرزو اگرچہ اب پرسکون تھی مگر رنگت اب بھی اُڑی اُڑی سی تھی۔

"عالیہ......! تم گھبرائی تو نہیں......؟"

انہوں نے بہن سے پوچھا۔

"ارے نہیں آپی جان......! میں تو پوری طرح چاق و چوبند تھی۔"

اندرون اور بیرونِ ممالک میں تربیت پانے والی عالیہ فخر سے بولی۔

عالیہ کی افتتاحی پرواز کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد آرزو رضا کی تصویروں کی نمائش تھی۔ آرزو حسبِ معمول نمائش گاہ میں نہیں گئی تھی جبکہ عالیہ اور شہزاد نمائش میں موجود تھے۔ دوسری طرف اشرف اور گڑیا بھی تھے۔ اشرف نے دو شاہکار پینٹنگ خریدیں۔ پھر منیجر سے بات کرتے ہوئے بولے۔

"کیا میں آرزو رضا سے مل سکتا ہوں......؟"

"معاف کیجئے......! وہ موجود نہیں ہیں۔ مجھ سے کہئے......! کیا کام ہے......؟"

’’مگر ان کے بھائی اور بہن تو نمائش میں موجود ہیں۔‘‘

گڑیا نے کہا۔ اتنے میں شہزاد اپنے دوست فلائٹ انجینئر حسن سے باتیں کرتے ادھر چلے آئے۔

’’ہیلو کیپٹن......!‘‘

گڑیا نے بے تکلفی سے پکارا۔ شہزاد نے چونک کر اس بے تکلف لڑکی کو دیکھا۔

’’کون ہوسکتی ہے یہ لڑکی......؟‘‘

اس نے دل میں سوچا اور بولا۔

’’محترمہ......! میں آپ کو کیپٹن کہاں سے نظر آ رہا ہوں......؟‘‘

کیونکہ شہزاد اس وقت یونیفارم کی بجائے براؤن پینٹ اور لائنوں والی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔

’’دراصل میں نے آپ کو ایک ہفتہ قبل جہاز میں دیکھا تھا۔‘‘

’’او آئی سی......!‘‘

یہ کہتے ہوئے شہزاد نے آگے بڑھنا چاہا مگر گڑیا راستہ روکتی ہوئی بولی۔

’’کیا ہم آرزو صاحبہ سے مل سکتے ہیں......؟‘‘

’’سوری......! ان سے ملنا مشکل ہے۔ مجھ سے کہئے......! کیا بات ہے......؟‘‘

’’ہم انہی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

اب کے اشرف نے کہا۔

’’کیا مسئلہ ہے......؟‘‘

عالیہ بھی چلی آئی۔

’’یہ لوگ آپی سے ملنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’تو کہہ دو کہ یہ ان سے نہیں مل سکتے۔‘‘

عالیہ نے خشک لہجہ اختیار کیا۔

’’آپ لوگ مس آرزو سے تو بات کر کے دیکھیں......!‘‘

اشرف بہرصورت آرزو سے ملنا چاہتا تھا۔

’’بات کرنے میں کیا مضائقہ ہے......؟‘‘

گڑیا نے بھائی کی تائید کی۔

’’بات کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ آپ کو تصویریں خریدنی ہیں تو خریدیں، ورنہ......‘‘

عالیہ نے بات اُدھوری چھوڑ دی۔

’’محترمہ عالیہ......! آپ کو آخر کب عقل آئے گی......؟‘‘

حسن نے ناگواری سے کہا۔

’’آپ کو میری باتوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں......!‘‘

عالیہ نے غصیلے لہجے میں کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی دوسری طرف بڑھ گئی۔

’’آپ مائنڈ نہ کریں۔ میں ابھی فون کرتا ہوں۔‘‘

شہزاد نے کہا اور فون کرنے کے بعد بولا۔

’’ٹھیک ہے......! آپ ہمارے ساتھ گھر چلیں۔‘‘

جب وہ گھر کو روانہ ہوئے، ساتھ میں حسن بھی تھا۔ اشرف حسن اور گڑیا کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ آرزو کو لینے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد آرزو دونوں بہن بھائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اشرف نے عقیدت سے اسے دیکھا اور کھڑا ہوگیا۔ سفید لباس میں چہرے پر دیوتاؤں جیسا تقدس لئے وہ آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے گڑیا اور اشرف پر ایک نظر ڈالی پھر حسن سے بولی۔

’’حسن......! تم بھی آئے ہو......؟‘‘

’’جی ہاں آپی......! آنا ہی پڑا۔‘‘

حسن نے مسکین سی صورت بنا کر عالیہ کی طرف دیکھا جو اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔

''آپ کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے......؟''

''آپ سے ملنا جرم ہے کیا......؟''

اشرف نے غور سے اپنی اس عزیز ہستی کو دیکھا جس کا مداح تو وہ مدتوں سے تھا، مگر بات کرنے کا شرف آج حاصل ہوا تھا

''جرم تو نہیں مگر کوئی خاص وجہ......؟''

آرزو کے ہونٹوں پر مدہم تبسم در کر آیا تھا۔

''دراصل جب آپ کی پہلی تصویروں کی نمائش ہوئی تھی تو تب سے میں ہر نمائش دیکھ رہا ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ آپ کبھی خود نمائش گاہ میں موجود نہیں ہوتیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ......؟''

''وجہ......؟ اس کی خاص وجہ......''

آرزو سے آگے کچھ بولا نہ گیا۔ اس نے صوفے کی پشت گاہ سے سر ٹکا لیا۔

''آپ شاید کچھ تصویریں خریدنا چاہتے تھے......؟''

شہزاد نے فوراً بات کا رُخ بدلا۔

''تصویریں خریدنی ہیں مگر......''

''اگر مگر کچھ نہیں......!''

عالیہ اشرف کی بات کاٹتی ہوئی بولی۔

''یہ بتایئے......! آپ لوگ چائے پئیں گے یا کافی......؟''

اشرف اور گڑیا نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔

''شکریہ......! ہم چلتے ہیں۔ خواہ مخواہ آپ کو زحمت دی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں......! آپ لوگ تشریف رکھیئے......!''

آرزو سنبھلتی ہوئی بولی۔

''شکریہ......!''

گڑیا اور اشرف نے کہا اور باہر چلے آئے۔ ان کے ساتھ شہزاد اور عالیہ بھی آئے۔ حسن ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھا رہا۔

''دیکھیے......! آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔''

شہزاد نے کہا۔

''ہمیں مائنڈ کرنے کی کیا ضرورت ہے......؟''

گڑیا تلخی سے بولی۔

''یہ آپ کا گھو ہے، جسے چاہیں بے عزت کر کے نکال سکتے ہیں۔''

''معاف کرنا......! ہمارا مقصد آپ کی تذلیل کرنا ہرگز نہیں تھا۔ دراصل آپی کی پہلی نمائش پر ہی کچھ اس طرح کا حادثہ ہوگیا ہے کہ انہیں کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی۔ تصویریں اگرچہ وہ اب بھی بناتی ہیں مگر صرف ہماری خوشی کے خاطر۔ اب آپ خود ہی سوچیے......! ہم نے آپ کی تذلیل کی ہے یا......''

''آئی ایم سوری......!''

گڑیا نے معذرت کی تو اشرف بولے۔

''کوئی بات نہیں......!''

پھر جیب سے کارڈ نکال کر شہزاد کو دیتے ہوئے بولے۔

'اگر کبھی فرصت ملے تو ہمارے غریب خانے پر تشریف لایئے گا۔''

''ضرور ضرور......! شہزاد نے کہا اور انہیں رُخصت کر کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

''کون تھے یہ لوگ......؟''

آرزو نے پوچھا۔

"تصویروں کی نمائش میں آئے تھے اور آپ سے ملنے کی غرض سے گھر چلے آئے۔"

"مگر تم نے بات کس طرح کی ان لوگوں سے......؟"

آرزو نے تادیبی لہجے میں کہا۔

"سوری آپی......!"

شہزاد نے کہا اور حسن سے بولا۔

"چلو یار......!"

"کیوں......؟ آج تم تینوں کی بیک وقت پروازیں ہیں......؟"

آرزو نے پوچھا۔

"میری اور عالیہ کی ہے۔ حسن وہاں جھک مارے گا۔"

شہزاد نے کہا اور تینوں ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔

اگلے روز شہزاد اپنی بیرونی پروازوں پر چلا گیا اور عالیہ اپنی اندرونی پروازوں میں مصروف ہوگئی۔

اتوار کی شام چھ بجے عالیہ اپنا آخری پلین لاہور لائی اور پھر گھر چلی آئی۔ اس وقت گڑیا اور اشرف بھی آگئے۔ آرزو نے انہیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

کافی دیر وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ موضوع ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی آرزو کی پینٹنگ تھی۔ پھر جانے سے قبل گڑیا کی برتھ ڈے کا کارڈ اشرف نے آرزو کو پیش کیا اور تاکید کی۔

"ضرور آیئے گا......!"

آرزو چپ رہی تو گڑیا بولی۔

"شہزاد صاحب کو بھی ضرور لایئے گا۔"

"وہ تو بیرونی ٹور پر ہیں۔"

عالیہ نے کہا اور گڑیا کا چہرہ بجھ سا گیا۔

"گڑیا کی سالگرہ میں شہزاد اور عالیہ نے شرکت کی تھی۔ آرزو نے معذرت چاہ لی تھی۔

سالگرہ کے بعد سے ملاقاتوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ابتداء میں تو شہزاد گڑیا کو ایک دوست سمجھ کر ملتا رہا۔ مگر پھر اس نے محسوس کیا کہ گڑیا آہستہ آہستہ اس کے دل میں اُترتی چلی جا رہی ہے۔

تب پھر وہ اپنی ہر ملاقات کا ذکر عالیہ سے ضرور کرتا تاکہ جب کبھی آپی سے بات کی جائے تو عالیہ سے مدد لی جا سکے۔

ادھر گڑیا کو تو جیسے دونوں جہاں کی خوشیاں مل گئی تھیں مگر اپنی خوشیوں کے باوجود اسے اچھی طرح احساس تھا، اس کا بھائی آرزو کو پسند کرتا ہے۔

"بھیا......!"

وہ سہ پہر کی چائے پر بھائی سے مخاطب ہوئی۔

"آپ آرزو آپی سے بات کر کے تو دیکھئے......! ہوسکتا ہے وہ بھی آپ کو پسند کرنے لگی ہوں......؟"

اشرف نے سنجیدگی سے بہن کی طرف دیکھا اور پھر خالی کپ ٹرالی یں رکھتے ہوئے بولا۔

"فی الحال اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ میں جب بھی جاتا ہوں، ہ مختصر سی بات کر کے خاموش ہو جاتی ہیں۔ جیسے مجھے جانے کا اشارہ کر رہی وں۔"

"بھیا......! ہوسکتا ہے آپ کو غلط فہمی ہو۔ بغیر بات کیے کوئی ندازہ لگا لینا اچھی بات نہیں......!"

"اچھا گڑیا......! میں آج پھر جاؤں گا۔"

"میرے خیال میں تو ابھی چلے جانا چاہئے کیونکہ اس وقت عالیہ

اور شہزاد بھی گھر پر نہیں ہوں گے۔"

"اوکے......!"

یہ کہتے ہوئے اشرف اُٹھ گیا۔

آنے کو تو اشرف آ گیا مگر آرزو کے روبرو کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ آرزو کی شخصیت ایسی ہی تھی کہ وہ مرعوب ہو جاتا اور کوشش کے باوجود دل کی بات زبان پر نہ آتی۔

گڑیا کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ عالیہ گھر ہی پر موجود تھی۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں آرزو اور اشرف کو موجود پا کر بولی۔

"اشرف بھائی......! گڑیا کو بھی ساتھ لے آتے......؟"

اب اشرف کیسے بتاتا کہ وہ اپنے ہی کسی مقصد کے لئے آیا ہے......؟ تاہم اس وقت اس نے اطمینان کی سانس لی جب ایئر پورٹ کی گاڑی عالیہ کو لینے آ گئی۔

"اوکے آپی جان......! ہم تو چلے ڈیوٹی پر۔"

عالیہ نے کہا اور آرزو نے یوں اشرف کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"تمہارا یہاں کیا کام......؟ تم بھی چلتے پھرتے نظر آؤ......!"

مگر اشرف ہمت کر کے بیٹھا رہا۔ کیونکہ آج اس نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"اس وقت آپ فارغ ہیں......؟"

اشرف نے بات شروع کی۔

"میں بیک وقت مصروف بھی ہوتی ہوں اور فارغ بھی، جی چاہے تو سارا دن نگار خانے میں گزار دوں اور نہ چاہے تو یوں ہی اِدھر اُدھر بیٹھی رہتی ہوں۔"

"گویا اس وقت آپ فارغ ہیں......؟"

اشرف کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ایسا ہی سمجھ لیجئے......!"

"اچھا تو پھر آرزو صاحبہ......! آج مجھے بھی چند باتیں کہنے کی ازت دیجئے......!"

اشرف ہمت کر کے بولا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی......؟ کیا کہنا چاہتے ہیں......؟"

آرزو نے اُلجھ کر پوچھا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں آرزو......! میں آپ کو پسند کرنے لگا ہوں اور آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اشرف آنکھیں بند کر کے جلدی سے بولا۔ نہ جانے اچانک اس میں اتنی ہمت کہاں سے پیدا ہو گئی تھی۔

"کیا کہا......؟"

آرزو کی چیخ نما آواز نکلی مگر اشرف اس کی حالت کو نظرانداز کئے کہتا رہا۔

"مجھے آج کہنے دیجئے......! مس آرزو......! میں پندرہ سال سے آپ کی پرستش کر رہا ہوں۔ میں اسی دن سے آپ کو دیوانہ وار چاہنے لگا تھا جس دن آپ کی تصویروں کی پہلی نمائش دیکھی تھی۔ پھر اس کے بعد دو سال بعد جب نمائش ہوئی تو میں جاپان میں تھا۔ میرے ایک دوست نے مجھے اطلاع دی اور میں وہاں کی تمام مصروفیات ختم کر کے پاکستان آ گیا۔ مگر آپ سے پھر بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ آج جب پندرہ سال کی دُوری کے بعد میں نے آپ کو پایا ہے تو آپ ہی بتائیں......! آپ کو کیسے کھو دوں......؟"

آرزو دم بخود اس کی گفتگو سن رہی تھی۔ اچانک غصے سے کپکپاتی آواز میں بولی۔

"آپ کو میرے گھر میں کھڑے ہو کر ایسی باتیں کرنے کی جرأت کیسے ہوئی......؟ آپ نے مجھے اپنی نظروں میں سولہ سترہ سال کی دوشیزہ سمجھا ہے جو آپ کی یہ باتیں سن کر شرمائے گی......؟ یا پھر آپ نے سوچا ہوگا کہ میں نے اپنی زندگی کے یہ قیمتی سال محض آپ کے لئے ضائع کئے ہیں۔ تو یہ غلط ہے آپ یہاں سے تشریف لے جائیں ورنہ غصے میں نہ جانے میں کیا کر بیٹھوں۔"

"آرزو......! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"بہتر یہی ہوگا کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔"

وہ غصے سے بے قابو ہو کر چیخی۔

"کیا ہوا بی بی......؟"

آرزو کی ذاتی ملازمہ بھاگتی ہوئی آئی۔

"انہیں ذرا باہر کا راستہ دکھاؤ......!"

آرزو نے گھورتے ہوئے کہا۔

"شکریہ......! میں خود بھی جا سکتا ہوں۔"

اشرف نے خشک لہجے میں کہا اور چلا گیا۔

"بے وقوف کہیں کا......؟"

آرزو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور گھاس پر بیٹھ گئی۔

کتنی دیر وہ پریشان پریشان رہی۔ شہزاد ان دنوں بیرونی ٹور پر تھا اور وہ سوچ رہی تھی، کہیں شہزاد کے لئے کوئی مشکل نہ پیدا ہو جائے۔ کیونکہ رات سونے سے قبل عالیہ نے شہزاد اور گڑیا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

صبح عالیہ ڈیوٹی سے سیدھی آرزو کے کمرے میں آئی۔ ان دونوں بہن بھائیوں کی عادت تھی۔ ڈیوٹی سے سیدھے آرزو کے کمرے میں آتے۔

"ارے آپی......! آپ کو کیا ہوا......؟"

عالیہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں......! سر میں معمولی درد تھا۔"

آرزو نے کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ دونوں بہن بھائی اس کا چہرہ پڑھ لیتے ہیں۔

"پھر آپ آرام کیجئے......! میں چائے بھجواتی ہوں۔"

عالیہ نے کہا اور باہر نکل گئی۔

دوسرے دن شہزاد آ گیا۔ تب تلک آرزو سنبھل چکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح شہزاد آرزو، عالیہ کے علاوہ گڑیا کے لئے بھی ساڑھی لایا تھا۔ ان کے تحائف ان کے حوالے کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا اور جب گڑیا والا پیکٹ پکڑ کر باہر نکلا تو عالیہ یونیفارم میں ملبوس اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے......؟"

شہزاد نے اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں......!"

عالیہ شرارت سے مسکرائی۔

"ائیر پورٹ جا رہی تھی، سوچا جانے سے پہلے ایک نظر آپ کو دیکھتی جاؤں۔ ویسے بڑی بے چینی ہو رہی ہے ملنے کی۔"

"دیکھو عالیہ......! میں نے کبھی تم سے تمہارے بونگے حسن کے بارے میں کچھ کہا......؟ پھر تم مجھ پر طنز کیوں کر رہی ہو......؟"

"میں طنز کب کر رہی ہوں......؟"

عالیہ شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سر پر کیپ جما کر بولی۔

"میں آپی سے بات کر چکی ہوں۔ ذرا سنبھل کر جانا۔"

"تمہارا پلین لیٹ ہو رہا ہے۔ حسن انتظار کر رہا ہوگا۔"

شہزاد نے بات اُڑانے کی کوشش کی۔

''خیر......! حسن میرا انتظار نہیں کر رہا۔ وہ اسلام آباد جا رہا ہے اور میں اکیلی پلین لے جا رہی ہوں۔''

''آہ......!''

شہزاد سر پر ہاتھ رکھ کر کراہا اور عالیہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

شہزاد جب گڑیا کے ہاں پہنچا تو موسم بے حد خوش گوار تھا۔ بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ نوکر نے اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا اور شہزاد گنگناتا ہوا گڑیا کا انتظار کرنے لگا۔ اسے بیٹھے کافی دیر گزر گئی تو نوکر آیا۔

''صاحب......! آپ ٹھنڈا لیں گے یا گرم......؟''

''ٹھنڈا نہ گرم، گڑیا کو بھیج دو......!''

تھوڑی دیر بعد ہی پردہ ہٹا اور گڑیا سرمئی سوٹ میں اُداس اُداس سی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''کیا بات ہے گڑیا......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے......؟ اتنی دیر لگا دی......؟''

شہزاد والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

''وہیں رہنا......!''

گڑیا ناگواری سے بولی۔

''گڑیا......! میں اتنے دنوں بعد آیا ہوں اور مذاق کے موڈ میں قطعی نہیں ہوں۔''

''میں خود بھی مذاق کی قائل نہیں......!''

گڑیا نے خشک لہجے میں کہا۔

''کہنا کیا چاہتی ہو......؟ کچھ پتا بھی تو چلے......؟''

''کیا کرو گے پوچھ کر......؟''

گڑیا بے رُخی سے بولی۔

''گڑیا پلیز......! پہیلیاں نہ بجھاؤ، صاف صاف کہو......!''

''تم سن بھی سکو گے......؟''

''اب کہہ بھی چکو......!''

شہزاد صوفے پر بیٹھ گیا۔

''سنو......!''

گڑیا اس کے قریب بیٹھتی ہوئی پیار بھرے لہجے میں بولی۔

''بھیا آرزو سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیا......؟''

شہزاد چونک کر اسے گھورنے لگا۔

''کیوں......؟ چونک کیوں پڑے......؟''

گڑیا اسے گھور کر بولی۔

''بھیا نے کوئی برا تو نہیں چاہا......؟''

''مگر گڑیا......! یہ ناممکن ہے۔''

شہزاد نے ضبط کی آخری کوشش کی۔

''ناممکن کیوں......؟ یہ کوئی انہونی بات تو نہیں......! بھیا نے خود آرزو سے بات کی تو نہ صرف انہوں نے انکار کیا بلکہ بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔''

''مگر تمہارے بھائی کو یہ جرأت کیسے ہوئی......؟''

مارے غصے کے شہزاد اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''تمہیں میرے ساتھ اظہارِ محبت کی جرأت کیسے ہوئی تھی......؟''

گڑیا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''مجھے یا تمہیں......؟''

شہزاد اسے دیکھتے ہوئے حقارت سے غرایا۔

''تم تو خود میرے گرد چکر کاٹنے لگی تھی، کیا بھول گئی......؟''

''کیوں......؟ کیا میں کسی بھوکے ننگے خاندان کی تھی......؟ میرے بھائی نے اپنی زندگی کے پندرہ سال آرزو کی چاہت میں گزار دیئے۔ اب اگر وہ آرزو سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو برائی کیا ہے......؟ اور پھر اس عمر میں تو رشتے بھی مشکل سے ملتے ہیں۔ انہیں تو شکر کرنا چاہئے تھا۔ یوں بھی آرزو آسمان سے تو نہیں اُتری......؟''

''آرزو......؟ آرزو......؟ آرزو......؟''

شہزاد ترشی سے بولا۔

''تم تو یوں بار بار ''آروز، آرزو'' کہہ رہی ہو جیسے وہ کوئی معمولی چیز ہوں یا پھر کوئی بچی......؟ تمہیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں......! میری بہن کی تذلیل تم میرے منہ پر ہی کر رہی ہو......؟ مجھے اس بہن سے زیادہ عزیز کوئی نہیں ہوسکتا جس نے ماں بن کر پالا ہے ہمیں۔''

''تم......''

گڑیا غصے سے سرخ ہوگئی۔

''دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ تمہیں اگر بہن کا اتنا خیال ہے تو میں نے بھی بھائی کو باہر نہیں پھینک رکھا۔ مجھے اپنے بھائی کی بے چینیوں کا اچھی طرح خیال ہے۔ تمہاری بہن نے اگر تمہیں ماں بن کر پالا ہے تو میرے بھائی نے مجھے ماں اور باپ بن کر پالا ہے۔ تڑپے گا اگر میرا بھائی، تو تڑپو گے تم بھی۔''

''ہوں......!''

شہزادہ نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں ان بے حس اور بے غیرت لوگوں میں سے نہیں ہوں جو محض ایک لڑکی کی خاطر کائنات کی عظیم ہستیوں سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہوا ہے کہ میں نے کتنی غلط لڑکی کا انتخاب کیا

ہے......؟''

شہزاد نے ساڑھی والا پیکٹ پکڑا اور باہر نکل گیا۔

رات عالیہ ڈیوٹی سے واپس آئی تو شہزاد بیڈ پر اوندھے منہ پڑا تھا۔

''کیا بات ہے بوائے......؟ موڈ کچھ آف لگ رہا ہے۔ گڑیا کو گفٹ دے آئے......؟''

''ہاں......! دے دیا۔''

شہزاد نے بے زاری سے کہتے ہوئے کروٹ لی۔

''پیکٹ تو یہاں پڑا ہے۔ کہیں جھگڑا تو نہیں ہوگیا......؟''

''کچھ نہیں......! تم جاؤ......؟''

''بتا دینے میں کیا مضائقہ ہے......؟ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں......!''

''عالیہ پلیز......! اس وقت جاؤ......! صبح بتاؤں گا۔''

''صبح تم مجھے نہیں بتا سکو گے۔ کیونکہ صبح میں پہلی پرواز سے حسن کے ساتھ سعودیہ جا رہی ہوں۔''

''جیسی تمہاری مرضی......!''

''تو ٹھیک ہے، واپسی پر پوچھ لینا......!''

عالیہ نے بے پرواہی سے کہا اور چلی گئی۔



''کیا بات ہے شہزاد......؟ جب سے تم بیرونی ٹور سے واپس آئے ہو، پریشان سے دکھائی دیتے ہو......؟''

آرزو نے سویٹر بنتے بنتے پوچھا۔

"آپ کی غلط فہمی ہے......!"
شہزاد نے ہنس کر کہا۔
"پھر بھی کوئی بات تو ہوگی......؟"
آرزو نے کریدا۔
"آپ کا وہم ہے......!"
شہزاد نے جواب دیا۔
"ارے ہاں......! کتنے دن ہوگئے ہیں۔ گڑیا نہیں آئی۔ کیا وجہ ہے......؟"
"کوئی وجہ نہیں آپی جان......! اس کی کوئی اپنی مصروفیات ہوں گی۔"
شہزاد کی چھٹیاں ختم ہوگئیں مگر اس کی پہلی پرواز کے بعد ہی ڈائریکٹر نے آرزو کو فون کیا۔
"مسٹر شہزاد کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس لئے انہیں پھر چھٹی پر بھیجا جاتا ہے۔ چونکہ پائلٹ پر بہت سی دوسری جانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک مسٹر شہزاد اوکے نہیں ہو جاتے، انہیں ڈیوٹی اٹینڈ کرنے کی اجازت نہیں۔"
شہزاد شاید اب بھی آرزو کو کچھ نہ بتاتا مگر آرزو نے براہِ راست اس سے بات کی۔
"آپی......! میں نے کہا ناں......! مجھے کچھ نہیں ہوا اور اگر کچھ ہوا بھی ہے تو اس کی وجہ گڑیا نہیں ہوسکتی۔"
آرزو کے لاکھ پوچھنے پر بھی شہزاد نے کچھ نہ بتایا مگر عالیہ کی سعودیہ سے واپسی پر وہ کچھ نہ چھپا سکا۔
"اب تمہارا کیا ارادہ ہے......؟"
عالیہ بھائی کے درد پر تڑپ اُٹھی۔

"میں نے اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ دُنیا میں وہی ایک لڑکی نہیں ہے۔ بے شمار ملیں گی مگر آپی کا نعم البدل کوئی نہیں بن سکتا۔ تم آپی سے ابھی ان باتوں کا ذکر بالکل نہ کرنا۔ کچھ عرصہ بعد میں خود اس موضوع پر بات کروں گا۔ باقی انشاء اللہ میں کل سے ڈیوٹی اٹینڈ کر رہا ہوں۔"
شہزاد نے بات ختم کی اور آرزو جو باہر کھڑی سب باتیں سن رہی تھی، واپس اپنے کمرے میں آگئی۔
"اُف اللہ......! میں کیا کروں......؟"
وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دباتے ہوئے بڑبڑائی۔
"شہزاد کو تڑپتے دیکھنا میرے بس میں نہیں۔ میں کیا کروں......؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"
وہ روہانسی ہوگئی۔
"تم ہی بتاؤ رضا......! میں کیا کروں......؟ کاش تم مجھے یوں دوراہے پر چھوڑ کر نہ گئے ہوتے۔"
وہ تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔



وہ دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ یعنی کل تین بہن بھائی۔ عالیہ کی پیدائش کے دو سال بعد ماں چل بسی مگر باپ نے انہیں ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔
آرزو کو شروع سے ہی ڈرائنگ سے لگاؤ تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے والد آرٹ کے شیدائی تھے اور جہاں کہیں بھی تصویروں کی نمائش ہوتی، وہ دیکھنے جاتے۔ آرزو ہمیشہ ساتھ ہوتی۔ آرزو کو وہ سب سے زیادہ عزیز

رکھتے اور پھر ان کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے آرزو آرٹ کی دُنیا میں داخل ہوگئی۔ حالانکہ اسے پائلٹ بننے کا شوق تھا۔ اسے اس پروفیشن سے جنون کی حد تک محبت تھی۔

آسمان پر اُڑتے ہوئے جہازوں کو وہ بڑے پیار سے دیکھتی اور سوچتی:

"کتنا عظیم ہے وہ شخص جو بلندیوں میں اُڑتا ہے۔"

مگر جب آرٹ کی دُنیا میں آئی تو بہت کم عمری میں اچھی اچھی تصویریں بنانے لگی۔ باپ اس کا رجحان دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ خود اسے کلر برش لا کر دیتے اور جب آرزو کینوینس کے سامنے کھڑی ہو کر رنگ بکھیرتی تو وہ خوشی سے نہال ہو جاتے۔ عالیہ اور شہزاد اپنی پڑھائی اور ٹریننگ کے لئے سرگودھا ہاسٹل جوائن کر چکے تھے۔

جب آرزو بچپن کی حدود چھوڑ کر جوانی میں داخل ہوئی تو اس کے والد اس کی تصویروں کی نمائش کے لئے زور دیتے مگر وہ کہتی۔

"نہیں ڈیڈ......! ابھی میں مطمئن نہیں ہوں۔ ابھی میں نے کوئی شاہکار تخلیق نہیں کیا۔ کچھ اور انتظار کیجئے، پھر دیکھئے میری پہلی نمائش پر ہی مجھے انٹرنیشنل شہرت ملے گی۔ لوگ اس بات پر یقین نہیں کریں گے کہ میں آرٹ کی دُنیا میں نئی ہوں۔"

ایک دن آرزو اپنی ایک تصویر مکمل کر رہی تھی کہ سیاہ گھٹائیں جھوم کر آئیں اور موسم کو رنگین بنا ڈالا۔ آرزو نے فوراً اپنا سامان سمیٹا اور گھومنے پھرنے کے ساتھ ہلکی پھلکی شاپنگ کا ارادہ کرتی ہوئی گھر سے نکل آئی۔

کتنی دیر تک وہ خواہ مخواہ اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ پھر وہ ایک شاپنگ سنٹر میں داخل ہوگئی۔ یہاں کچھ چیزیں پسند آئیں اور وہ پیک کروانے لگی۔ اتنے میں پیچھے سے آواز آئی۔

"دیکھئے پلیز......! میں یہاں کافی دیر سے کھڑا ہوں۔ پہلے میری

مطلوبہ چیزیں پیک کر دیجئے۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔"

آرزو نے پلٹ کر ایک نظر بولنے والے پر ڈالی۔

دراز قد، تیکھے نقوش، سفید رنگ کا مالک، وہ شخص نرمی سے سیلز مین کو گھور رہا تھا۔ مگر اس کے ارادوں سے لگتا تھا، اگر اس کی بات فوراً نہ مانی گئی تو وہ پٹائی پر اُتر آئے گا۔ آرزو خود بھی ضدی لڑکی تھی، اس لئے تیزی سے بولی۔

"اے مسٹر......! پہلے میری چیزیں پیک کرو......!"

"دیکھئے محترمہ......! میں آپ سے پہلے آیا تھا۔"

اس نے آرزو کو سمجھانا چاہا۔

"تو میں کیا کروں......؟"

آرزو نے چڑانے والے انداز میں شانے اُچکائے۔ اجنبی کا جی چاہا اس معصوم خوب صورت مگر سنگ دل لڑکی کو اُٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دے مگر وہ سختی کی بجائے نرمی سے بولا۔

"دیکھئے محترمہ......! میرا پلین لیٹ ہو جائے گا۔"

"آپ پلین لیٹ ہو جانے کی بات یوں کر رہے ہیں جیسے آپ کو فلائنگ کرنی ہو......؟"

آرزو نے مضحکہ اُڑانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی......! بدقسمتی سے مجھے ہی فلائنگ کرنی ہے۔"

اجنبی نے مسکین سی صورت بنا کر عاجزی سے کہا تو آرزو چونک کر عقیدت بھری نظروں سے اجنبی کو دیکھنے لگی۔

"آئی ایم سوری کیپٹن......!"

وہ فوراً ادب سے بولی۔

آرزو کی اس بدلی ہوئی حالت پر اجنبی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ تب تک دو سیلز مین دونوں کی مطلوبہ چیزیں پیک کر چکے تھے۔

"لیجئے صاحب......!"

ان میں سے ایک نے پیکٹ شوکیس پر رکھتے ہوئے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ دونوں چونک کر مُڑے اور اپنے اپنے پیکٹ اُٹھا لئے۔

"آیئے......! میں آپ کو ڈراپ کر دوں......!"

آرزو نے آفر کی۔ وہ شکریہ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"فوراً ائیر پورٹ چلیں......!"

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

راستے میں آرزو نے پوچھا۔

وہ ابھی تک آرزو کے روّیے پر حیران ہو رہا تھا۔ حیرانگی سے بولا۔

"رضا......!"

"بہت اچھا نام ہے......!"

آرزو نے تعریف کی تو وہ بھی مسکرا دیا اور اخلاقاً آرزو کا نام پوچھا۔

"آرزو......!"

آرزو نے بتایا اور اپنا فون نمبر دیتے ہوئے بولی۔

"جب کبھی فرصت ملے فون کیجئے گا۔"

اور گاڑی ائیر پورٹ کے باہر روک دی۔

"شکریہ......!"

یہ کہتے ہوئے اس نے نمبر لے لیا۔ مگر لگتا تھا جیسے فون کرنے کا ارادہ بالکل نہ ہو۔ اس کے جاتے ہی آرزو نے گاڑی واپسی کے لئے موڑ دی۔ گھر پہنچ کر اس کی نظر فرنٹ سیٹ پر رکھے ہوئے پیکٹ پر پڑی اور وہ سر ہلاتی ہوئی افسوس کرنے لگی۔

"بے چارہ اتنا جھگڑ رہا تھا اس کے لئے اور اب پیکٹ گاڑی میں

ہی بھوگ گیا۔ خیر......! میرا فون نمبر تو ہے اس کے پاس، اسی بہانے فون تو کرے گا......؟"

آرزو منتظر ہی رہی۔

"آج فون کرے گا......!"

"کل فون کرے گا......!"

مگر دو مہینے گزر گئے، فون نہ آیا۔ آرزو بے چین ہی رہی مگر پھر اچانک ایک دن فون چیخ اُٹھا۔ آرزو اس وقت اپنے نگار خانے میں اپنی نئی بنائی ہوئی تصویر پر نظرثانی کر رہی تھی، جب نوکر نے آکر اطلاع دی۔ آرزو برا سا منہ بنا کر آئی اور ماؤتھ پیس میں بولی۔

"کون ہیں آپ......؟ اور کیا چاہتے ہیں......؟"

"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں......؟"

دوسری جانب سے آواز آئی۔

"جی بالکل نہیں......!"

آرزو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"دیکھئے محترمہ......! میری ایک امانت آپ کے پاس ہے۔"

"معاف کیجئے گا میں سمجھی نہیں......!"

آرزو کا ذہن ابھی تک اپنے نگار خانے میں گم تھا۔

"جی میں رضا ہوں......!"

"ارے......! آپ اتنا عرصہ کہاں غائب رہے......؟ اور آج اپنی امانت کا خیال کیسے آگیا......؟"

"سنئے محترمہ......! میں آج ہی اپنے بیرونی ٹور سے واپس آیا ہوں۔ آپ مجھے یہ بتائیں، مجھے میری امانت کس طرح مل سکتی ہے......؟"

"آپ یوں کیجئے، گھر چلے آیئے......!"

آرزو نے ایڈریس بتایا۔

"ٹھیک ہے......! میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ انتظار کیجئے گا۔"

کہتے ہوئے رضا نے فون بند کر دیا۔

آرزو، رضا کے انتظار میں بیٹھ گئی مگر رضا سے پہلے اس کے والد آگئے۔ آرزو نے چائے کا کہا اور اتنے میں رضا بھی آ گیا۔

"ڈیڈ......! یہ رضا ہیں۔"

آرزو نے دونوں کا تعارف کروایا۔ رضا نے مصافحہ کیا اور بیٹھ گیا۔ چائے بناتے ہوئے آرزو نے اپنے باپ کو بتایا کہ کیسے رضا کی اور اس کی ملاقات ہوئی۔ چائے کے بعد رضا بولا۔

"چلئے محترمہ......! مجھے میری امانت لوٹا دیجئے......!"

آرزو اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور اپنی پینٹنگز بھی دکھائیں۔ رضا اس کی پینٹنگز سے کافی متاثر نظر آرہا تھا۔ اپنی امانت لے کر وہ پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

ایک دو ملاقاتیں اور ہوئیں اور یہ لوگ پیار کے پاکیزہ بندھن میں بندھ گئے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ رضا کا جب جی چاہتا فون کرتا اور آرزو بھاگی چلی آتی۔



"آرزو......! رضا پیار سے کہہ رہا تھا۔

"نہ جانے کیوں تم سے ایک پل بھی جدا رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ تم تو واقعی میری جانِ آرزو بن کر رہ گئی ہو۔ جی چاہتا ہے، تمہاری ان گھٹاؤں جیسی زُلفوں کے سائے میں بیٹھا رہوں اور......"

"بکواس بالکل نہیں......!"

آرزو ہنس دی۔

"یہ تمہارے لئے بکواس ہے......؟"

رضا مصنوعی خفگی سے اسے گھورتا ہوا بولا۔

"اتنی محنت سے میں نے یہ مکالمے یاد کئے تھے۔"

پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"تمہیں میری بے چینیوں کا اندازہ نہیں آرزو......! پاپا، مما ہوتے تو کب کا انہیں تمہارے ہاں بھیج چکا ہوتا۔ لیکن افسوس......! اس دُنیا میں اپنی ذات تنہا ہے۔"

رضا افسردہ ہو گیا تو آرزو تڑپ کر بولی۔

"تم اب ایسا کیوں سوچتے ہو......؟ میں جو ہوں تمہارے ساتھ......! اب تم......تم نہیں......ہم ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو تم ڈیڈی سے بات کرو۔ میں بہت جلد شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں......! یہ شادی ابھی نہیں ہو سکتی۔"

آرزو کسی جاگیردار کی طرح بولی۔

"کیوں......؟"

رضا اسے گھورنے لگا۔

"دیکھو بھئی......! جب تک میری تصویروں کی نمائش نہیں ہو جاتی، میں شادی نہیں کروں گی۔ دراصل میں شادی سے پہلے تھوڑا سا مشہور ہونا چاہتی ہوں۔"

"پتہ ہے میں کیا چاہتا ہوں......؟ میں چاہتا ہوں شادی کے بعد تمہاری تصویروں کی نمائش ہو۔ جب میرا نام تمہارے نام کے ساتھ لگ جائے اور جب ہم دونوں نمائش گاہ میں جائیں تو لوگ بجائے تصویروں کے ہم دونوں کو دیکھیں۔"

"بڑا گھمنڈ ہے اپنی خوب صورتی پر......؟"

"بلاوجہ تو نہیں......!"

رضا مسکرایا۔

"آرزو......! نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا ہے، تمہیں ساتھ لئے ہواؤں کے دوش پر اُڑتا رہوں، اونچی اُڑان۔ اور پھر ان بلندیوں میں کھو جاؤں۔"

"خدا نہ کرے رضا......!"

آرزو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم اتنی بلندیوں میں کھونے کی بات مت کیا کرو رضا......! اگر تم بلندیوں میں کھو گئے تو میرا کیا ہوگا......؟ میں کیا کروں گی......؟"

آرزو سچ مچ اس کے بازو پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"یہ کیا پاگلوں جیسی حرکت ہے......؟"

رضا اس کے رونے پر تڑپ گیا۔

"تم کیوں بلندیوں میں کھونے کی بات کرتے ہو......؟"

آرزو ناراض ہو کر بولی۔

"اچھا بابا......! اب نہیں کروں گا۔"

وہ کہتا مگر ہر بار یہی ہوتا۔

"آرزو......! چلو دونوں اُڑتے اُڑتے اُفق کے اس پار کھو جائیں، جہاں اپنے سوا کوئی نہ ہو۔"

"پھر کھونے کی بات......؟"

آرزو چڑ جاتی۔

"سوری حضور......!"

وہ ہاتھ جوڑ دیتا اور آرزو کھلکھلا کر ہنس دیتی۔

پھر ملاقات ہوئی تو وہ سنجیدہ تھا۔

"تم ڈیڈی سے بات کیوں نہیں کرتیں......؟ اگر تم نہیں کر سکتیں تو میں اپنے دوست محسن اور اس کی بیوی کو تمہارے گھر پیغام دے کر بھیجوں......؟"

"وہ کس لئے جناب......؟ ڈیڈی آپ کو پسند کرتے ہیں، آپ خود آ کر ڈیڈی سے بات کریں......!"

"ارے سچ......؟ پہلے کیوں نہیں بتا دیا......؟ اچھا ٹھیک ہے......! میں کل آؤں گا۔"

اگلے روز رضا کے آنے سے پہلے وہ ڈیڈ سے بات کر چکی تھی۔ ڈیڈی کو ہمیشہ اس نے اپنا دوست سمجھا تھا۔ آرزو کے انتخاب کو دیکھتے ہوئے انہیں خوشی ہوئی تھی۔

رضا آیا مگر پُر اعتماد ہونے کے باوجود بوکھلایا سا لگ رہا تھا۔ آرزو کو اس کی صورت دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ رضا کتنی دیر بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور جب اس نے جانے کی اجازت طلب کی تو آرزو اسے دیکھتی ہوئی ہنس کر اُٹھ گئی۔

"بیٹے......! آرزو تو کہہ رہی تھی تم شادی کے سلسلے میں بات کرنے والے ہو......؟"

ڈیڈی نے پیار سے پوچھا۔

"جی نہیں......! جج...... جی ہاں......!"

رضا بوکھلا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ ڈیڈی کتنی دیر بیٹھے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے، پھر نرمی سے بولے۔

"صاحبزادے......! اس میں شرمانے کی کیا بات ہے......؟ شادیاں تو سبھی کی ہوتی ہیں۔ تمہاری کوئی نئی تو نہیں......؟"

"جی ہاں......! دراصل......"

رضا نے بات کرنے کے لئے اپنی پوری قوت جمع کی۔ تب رضا

کافی دیر بیٹھا ڈیڈی سے باتیں کرتا رہا پھر چلا گیا۔

آرزو بے چین تھی کہ کیا کیا باتیں ہوئیں......؟ مگر ڈیڈی نے اسے کچھ نہ بتایا۔ بہر حال اس کی بے چینی یوں ختم ہوئی جب رضا نے اگلے روز اسے ملنے کو کہا۔

رضا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اب فاصلے ختم ہو جائیں گے۔“

رضا اسے ڈیڈی کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں بولا۔

”ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جیسے تم چاہو، میں ویسا کرنے کو تیار ہوں۔ میرا خیال تھا، ایک مہینے کے اندر نکاح اور رُخصتی ہو جائے۔ مگر ڈیڈی چاہتے ہیں، ابھی صرف نکاح کیا جائے۔ اس کے بعد میں بیرونی ٹور پر جا رہا ہوں، ڈیڑھ ماہ کا ٹور ہے۔ واپسی پر رُخصتی ہوگی۔ بس آج سے ہی شاپنگ کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔“

”نہیں رضا......! تم شاپنگ مت کرو۔ فی الحال ایک انگوٹھی کافی ہے۔ شاپنگ ہم شادی پر کریں گے۔“

آرزو کہہ رہی تھی اور رضا پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر مسکراتا ہوا بولا۔

”ٹھیک ہے......!“

چپکے سے نکاح کا دن آ گیا۔ عالیہ اور شہزاد بھی ہاسٹل سے گھر آ گئے۔ آرزو اپنی دوستوں اور رشتے داروں کے جھرمٹ میں دُلہن بنی اور پرائی ہوگئی۔

رضا کی طرف سے اس کے دوستوں اور ان کی بیگمات نے شرکت کی تھی۔ دو دن بعد ہی رضا بیرونی ٹور پر روانہ ہوگیا۔

آرزو نے خوب صورت مستقبل کے سپنے دیکھتے ہوئے اسے ہنستے

مسکراتے رُخصت کیا اور پھر شادی کی شاپنگ میں مصروف ہوگئی۔

رضا کی واپسی سے چند روز پہلے اس نے اپنی شاپنگ مکمل کی۔

جس دن رضا کو آنا تھا، وہ صبح سے ہی بے کل سی پھر رہی تھی۔ بار بار ایئر پورٹ فون کر کے پوچھتی۔

”رضا کا پلین کب آئے گا......؟“

اور جب یہ اطلاع ملی کہ آدھے گھنٹے بعد پلین آ رہا ہے تو آرزو فوراً عالیہ، شہزاد اور ڈیڈی کے ساتھ ایئر پورٹ پہنچ گئی۔ مگر وہاں پلین آنے کی بجائے اناؤنسر نے اطلاع دی کہ لاہور پانچ بجے آنے والا پلین موسم خراب ہونے کی وجہ سے اسلام آباد ایئر پورٹ پر اُتر گیا تو آرزو برا سا منہ بنائے گھر لوٹ آئی۔

صبح وہ لوگ ابھی ناشتہ کر رہے تھے کہ رضا آن دھمکا۔ ناشتہ ان لوگوں کے ساتھ کیا۔ تفصیل سے بات چیت بھی کرتا رہا۔ پھر ڈیڈی سے اجازت لے کر آرزو کو اپنی شاپنگ دکھانے گھر لے آیا۔

آرزو اس کی شاپنگ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہ بے شمار چیزیں آرزو کے لئے لایا تھا۔ آرزو اسے دیکھتی رہی اور اس کی پسند کو داد دیتی رہی۔ آخر میں وہ سب کچھ سمیٹ کر بولا۔

”اب جو تمہیں اپنی پسند سے شاپنگ کرنی ہے، وہ میرے ساتھ چل کے کر لینا۔“

آرزو نے حامی بھر لی۔

پچیس تاریخ کو بارات تھی اور تیئس تاریخ کو آرزو کی تصویروں کی پہلی نمائش۔ ڈیڈی خوش تھے۔ انہیں ایک ساتھ دو خوشیاں مل رہی تھیں۔ آرزو مسرور تھی کہ اسے زندگی کی تمام خوشیاں مل گئیں۔ رضا اپنی جگہ خوش تھا۔

مگر بیس تاریخ کو اچانک محسن کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے

رضا کو ایمرجنسی ڈیوٹی پر پلین لے کر قاہرہ جانا پڑا۔ جاتی دفعہ رضا نے کہا تھا کہ وہ تئیس تاریخ کو ہر حال میں واپس آجائے گا۔ آرزو نے مسکراتے ہوئے رخصت کیا اور خود تصویروں کی نمائش میں لگ گئی۔ اس کے دل میں نہ کوئی اندیشہ تھا اور نہ کوئی وہم۔

شام چھ بجے تئیس تاریخ کو اس کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح تھا۔ صبح رضا نے مصر سے فون کیا تھا۔

''میں سات بجے پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ ائیر پورٹ پر اس کا انتظار کرنا۔''

چھ بجے تیار ہو کر شہزاد، عالیہ اور ڈیڈی نمائش دیکھنے چلے گئے اور آرزو تیار ہونے لگی۔ اس نے رضا کی پسند کا گلابی لباس پہنا اور پونے سات بجے تیار ہو کر ایئر پورٹ چلی گئی۔ اس کا خیال تھا وہ رضا کو یونیفارم میں ہی آرٹ گیلری لے جائے گی مگر سات بجے اناؤنسر نے اعلان کیا۔

''قاہرہ سے آنے والا طیارہ لاپتہ ہوگیا ہے۔''

آرزو نے سنا تو دل دھک سے رہ گیا۔ کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ وہ بنچ پر بیٹھ گئی۔ آنکھوں کے آگے دُھواں سا چھانے لگا اور دماغ جیسے ماؤف ہوگیا۔ ایسے میں اسے اپنے قریب آواز سنائی دی۔

''بھابی جان......! کیا ہوگیا ہے آپ کو......؟ طیارے کبھی کبھی موسم خراب ہونے کی وجہ سے لاپتہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے فکر مند ہونے کی کوئی بات نہیں۔''

آرزو نے سر اُٹھا کر دیکھا تو رضا کا دوست فلائٹ انجینئر فرید کھڑا تھا۔

آرزو کچھ بولنا چاہتی تھی مگر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ دس بجے تک وہ ائیر پورٹ پر رہی اور تب یہ اطلاع پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

''قاہرہ سے پاکستان آنے والا طیارہ گر کر تباہ ہوگیا۔''

''نہیں......! یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟''

آرزو جیسے خواب میں بڑبڑائی۔ پھر اس کی چیخ سے پورا ائیر پورٹ لرز کر رہ گیا۔

ڈیڈی نے جب سنا تو جیسے سکتہ ہوگیا۔ پھر بھی انہیں ایک اُمید تھی۔ شاید رضا زندہ ہو۔ کیونکہ ابھی یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ کتنے مسافر ہلاک ہوئے ہیں۔ فی الحال انہیں آرزو کی فکر تھی۔

اگلے تین دن میں حادثہ میں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں تابوتوں میں بند ہو کر پاکستان پہنچ گئیں۔ ایک شخص بھی زندہ نہ بچا تھا۔

رضا کی میت جب سیدھی آرزو کے گھر لائی گئی تو ڈیڈی بھی اپنے حواس قائم نہ رکھ سکے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ شہزاد اور عالیہ خود بھی رو رہے تھے۔ محسن اور اس کی بیگم افسردہ سے آئے۔

کسی نے خوب کہا۔

''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔''

محسن کی زندگی ابھی باقی تھی۔ وہ بیمار ہوا اور بچ گیا، اور رضا اچھا بھلا تندرست گیا اور لوٹ کر واپس نہ آیا۔

ساڑھے دس بجے کے قریب ڈاکٹروں کی کوششوں سے آرزو کو ہوش آیا تو وہ اپنے حواس میں نہ تھی۔ ڈیڈی حسرت بھری نظروں سے تکتے ہوئے اسے سہارا دے کر رضا کے تابوت کے قریب لائے تو آرزو کے ہونٹوں پر ایک ہی الفاظ کی بازگشت تھی۔

''بلندیوں میں مت کھونا رضا......! بلندیوں میں مت کھونا۔''

''آپی......! رضا بھائی کا آخری دیدار تو کیجئے......!''

شہزاد نے اسے تابوت پر جھکایا تو آرزو یوں جھک کر رضا کی طرف دیکھنے لگی جیسے گہری نیند سے اُٹھ کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی

ہو۔

رضا کا بے جان وجود اس کے سامنے تھا۔ مگر اس کو کوئی خبر نہ تھی اور پھر ''بلندیوں میں مت کھونا رضا......!'' کی دل شگاف چیخ مارتے ہوئے وہ ڈیڈی کے بازوؤں میں جھول گئی۔

ڈیڈی کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا کہ ان کی نازوں سے پلی ہوئی بیٹی اپنا ذہنی توازن کھودے۔

رضا کب اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا، آرزو کو کچھ پتا نہ تھا۔ رضا کی موت سے کچھ دن بعد اسے ہوش آیا تو معلوم ہوا وہ باپ جیسی عظیم ہستی سے بھی محروم ہو چکی ہے۔ آرزو کا صدمہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا اور اسی حالت میں ڈیتھ ہوگئی۔

یہ دوہرا صدمہ آرزو کے لئے ناقابل برداشت تھا مگر محسن اور فرید نے ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے نفسیاتی وار کیا۔

''آرزو بھائی......! آپ کے لئے یہ صدمہ یقیناً ناقابل برداشت ہے اور ناقابل تلافی بھی۔ مگر یہ بھی تو سوچئے......! آپ پر آپ کے دونوں چھوٹے بہن بھائی کی ذمہ داری آن پڑی ہے۔ کیا آپ اپنے آپ میں مگن رہ کر سوگ مناتے ہوئے انہیں بھی موت کی دہلیز پر پہنچا دیں گی......؟''

''نہیں محسن بھائی......! ایسا مت کہئے......!''

آرزو کرب سے چلائی اور موت سے زندگی کی طرف لوٹ آئی۔

رضا کی یاد نے قدم قدم پر اس کا پیچھا کیا تو دوسری سمت ڈیڈی کی موت نے اسے اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور یوں وہ ان دونوں مشترک دُکھوں کو جھیلتے ہوئے زندگی کی دوڑ میں آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگی۔

تصویریں بنانے کا اب اس کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر کچھ سال بعد وہ

عالیہ اور شہزاد کے مجبور کرنے پر پھر تصویریں بنانے کا سامان خرید لائی۔ مگر شروع میں کینوس کے آگے وہ چپ چاپ کھڑی گھورتی رہتی، مگر کچھ بنا نہ پاتی۔

رضا کی یاد ایک لمحہ کے لئے بھی دل سے نہ جاتی۔ آہستہ آہستہ اس کے رنگ کینوس پر بکھرنے لگے۔ وقت کے ساتھ ساتھ زخم بھی کچھ بھر گئے۔ مگر وہ کہتے ہیں ناں......!

''زخم بھر جائے گا تو کیا، داغ تو رہ جائے گا''

یہی داغ سینے سے لگائے وہ جی رہی تھی۔ پائلٹ پروفیشن کے لئے اس کے دل میں جو عقیدت اور محبت تھی، وہ پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ عالیہ اور شہزاد بھی اسی پروفیشن میں تھے۔ آرزو کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو انہیں فوراً منع کر دیتی کہ تم مت فلائنگ آفیسر بنو، مگر وہ انہیں بھی بہادری کی تلقین کرتی اور خود بھی ان کی تربیت پر پوری توجہ دیتی۔

یوں ڈیڈی کے انتقال کے آٹھ سال بعد شہزاد کی تعلیم اور تربیت ختم ہوئی اور وہ فلائنگ آفیسر بن گیا اور عالیہ تعلیم ختم کر کے باہر تربیت حاصل کرنے چلی گئی۔ یوں ڈیڈی اور رضا کی موت کے بعد پہلی بار اسے شہزاد اور عالیہ کے کچھ بن جانے پر خوشیاں ملیں، ورنہ اب اس کی زندگی میں غموں اور دُکھوں کے سوا کچھ نہ تھا۔



وہ رضا کی تصویر کے سامنے کھڑی تھی جو اس کے انتقال کے بعد اس نے بنائی تھی۔

''آپی......! آپی......!''

شہزاد جو کافی دیر سے اسے یوں گم سم کھڑا دیکھ رہا تھا، اسے

جھنجوڑتے ہوئے بولا اور آرزو ماضی سے لوٹ کر حال میں کھڑے شہزاد کو دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے آپی جان......؟ آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی......؟''

شہزاد نے پیار سے گلے میں بانہیں ڈال کر پوچھا۔

''کچھ نہیں میری جان......! میں ٹھیک ہوں۔''

آرزو نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی۔

''تم میری فکر مت کیا کرو......!''

''آپ کی فکر کیوں نہ کریں......؟ آپ کے سوا کوئی ہے ہمارا......؟ ہماری خوشیاں، ہماری مسرت، ہمارا سکون صرف آپ کے وجود سے ہے آپی جان......! آپ کا وجود ہمارے لئے زندگی کا پیغام ہے۔''

آرزو نے پیار سے اسے دیکھا اور دل میں سوچا۔

''میں تمہیں تمہاری زندگی کی ہر خوشی دوں گی میرے منے......!''

وہ ایک عزم کے ساتھ اُٹھی۔

''کہاں چلی ہیں آپ......؟''

شہزاد نے یک دم انہیں اُٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

''یوں ہی ایک سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں۔''

آرزو نے کہا اور شانوں پر چادر ڈال کر باہر نکل گئی۔

''آپی......! میں بھی چلوں......؟''

شہزاد اس کے پیچھے چلا آیا۔

''نہیں بھئی......! تم اب بچے تو نہیں رہے جو میں تمہاری اُنگلی پکڑ کر تمہیں گھماتی رہوں......؟''

آرزو نے اسے روکنے کی غرض سے کہا۔

آرزو جب خود ہی گاڑی ڈرائیور کرتی ہوئی گڑیا کے ہاں پہنچی تو

گھر پر ہو کا عالم تھا۔ نوکر اسے ٹی وی لاؤنج میں لے گیا۔

اشرف سادہ شلوار سوٹ پہنے آرام چیئر پر نیم دراز سینے پر کتاب رکھے گہری سوچ میں محو تھا۔ ٹی وی بھی آن تھا مگر نہ اشرف ٹی وی دیکھ رہا تھا اور نہ کتاب پڑھ رہا تھا۔ آرزو کے قدموں کی آہٹ پر بھی وہ نہ چونکا۔

''اشرف صاحب......!''

آرزو نے سنجیدگی سے آواز دی۔

''آپ......؟''

اشرف اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

''جی...... میں......!''

آرزو پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''آپ کو اگر ناگوار نہ گزرے تو میں بیٹھ جاؤں......؟''

''جی ضرور ضرور......! تشریف رکھئے......!''

اشرف نے متانت سے کہا اور آرزو کو دیکھنے لگا۔

''میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنے آئی ہوں۔''

آرزو نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

''جی فرمایئے......!''

اشرف پوری توجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''لگتا ہے آپ نے میری باتوں کا بہت زیادہ اثر لیا ہے......؟''

آرزو نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کیا کہہ رہی ہیں......؟ مس آرزو......! میں کچھ نہیں سمجھا......؟''

اشرف نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ نے گڑیا کو شہزاد سے ملنے کو منع کر دیا ہے۔ کیا یہ اچھی بات ہے......؟ میں آپ کے گھر کبھی نہ آتی، کبھی کوئی وضاحت، کوئی تردید، کوئی

صفائی پیش نہ کرتی کیونکہ خدا نے مجھے جس حال میں رکھا ہے، میں اس میں خوش ہوں۔ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں......؟ کیا کہتے ہیں......؟ میں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ مگر شہزاد کے لئے مجھے آنا پڑا۔ کیونکہ وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میری جان کا ٹکڑا ہے وہ۔

میں آپ کو یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ ہمیں اپنی خوشی کی خاطر یا آپ کو اپنی خوشی کی خاطر دوسروں کی خوشیاں نہیں لوٹنی چاہیئے۔"

"آپ نے یہ بات کر کے مجھے بہت چھوٹا بنا دیا ہے۔ میں خود ایسی باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ بخدا میں نے ایسی کوئی پابندی گڑیا پر عائد نہیں کی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے خود میری وجہ سے اتنا اثر لیا ہو۔

بہرحال اگر ایسی بات بھی ہے تو میں خود گڑیا کو سمجھاؤں گا۔ مگر آرزو صاحبہ......! آپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا، اس کی وجہ بتانا پسند کریں گی......؟ یہ تو بالکل معمولی بات ہے کہ کوئی کسی کو پسند کرتا ہے اور اس کا اظہار کر دیتا ہے، مگر جس طریقے سے آپ نے انکار کیا، یہ پڑھے لکھے لوگوں کا تو شیوا نہیں......! آپ نرمی سے بھی انکار کر سکتی تھیں......؟"

"آپ وجہ جاننا چاہتے ہیں تو سنئے......! میری شادی ہو چکی ہے اور یہ شادی لو میرج تھی۔"

"جی......! کیا کہا......؟"

اشرف چونکا۔

"جی ہاں......!"

آرزو کی آواز میں درد کی کسک تھی۔

"آپ کے میاں کہاں ہیں......؟"

آرزو نے طویل سانس لی اور دُکھ سے بولی۔

"ان کا جہاز کریش ہو گیا تھا۔"

"کیا......؟"

اشرف پر جیسے بہت ساری بجلیاں ایک ساتھ گریں۔ وہ بے یقینی سے آرزو کو دیکھنے لگا۔

"جی ہاں......!"

آرزو کی آواز بھیگ گئی اور پھر اس نے اپنے ماضی کی کرب ناک کہانی اشرف کو سنا دی۔ اس کی زندگی کی کرب ناک کہانی سن کر اشرف مضطرب انداز میں ٹہلنے لگا۔

پھر رُک کر پشیمانی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"مجھے افسوس ہے آرزو صاحبہ......! کہ میری باتوں سے آپ کو دُکھ پہنچا ہے، میری وجہ سے جو ذہنی کوفت اُٹھانا پڑی ہے، اس کے لئے میں آپ سے تہہ دل سے معافی چاہتا ہوں۔ اُمید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گی۔"

"بات میرے دُکھ کی نہیں۔ میرے دُکھوں کی تو کوئی تعداد نہیں۔ دراصل گڑیا کے روّیے کی وجہ سے شہزاد ذہنی طور پر پریشان ہے اور اسے ڈیوٹی اٹینڈ کرنے کی اجازت نہیں۔"

"مجھے ایک بار پھر کہنا پڑ رہا ہے کہ میری وجہ سے آپ کو پریشان ہونا پڑا۔ بہرحال گڑیا اس وقت گھر پر نہیں، مگر جیسے ہی وہ گھر آئے گی تو میں اس سے بات کر کے آپ کو اطلاع دوں گا۔ پھر انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اشرف کے لہجے میں پہلی والی عقیدت و محبت لوٹ آئی۔

"پھر مجھے اجازت دیجئے......!"

آرزو اُٹھتی ہوئی بولی۔

"ارے......! یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟ آپ پہلی بار ہمارے گھر آئی ہیں۔ چائے تو پینی پڑے گی۔"

اشرف نے نوکر کو آواز دی اور آرزو بھی بیٹھ گئی۔

اگلے روز سہ پہر کی چائے عالیہ اور شہزاد دونوں اس کے ساتھ پی رہے تھے۔ عالیہ کبھی برا سا منہ بنا کر گیٹ کی طرف دیکھتی اور کبھی چائے کی پیالی کی طرف۔

''عالیہ......! تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو......؟''

آرزو نے پوچھ ہی لیا۔

''آپی......! وہ جو حسن ہے ناں......''

عالیہ دانت پیس کر بولی۔

''اسے میرا کوئی کام پسند نہیں آتا۔ کہتا ہے کسی دن تم اپنے ساتھ دوسرے مسافروں کو بھی لے ڈوبو گی۔ میں اب تمہارے ساتھ نہیں جایا کروں گا۔ کیونکہ مجھے اپنی جان بہت پیاری ہے۔''

عالیہ کی بات پر آرزو مسکراتے ہوئے بولی۔

''یہ تو اس کی محبت کا اظہار ہے جسے تم نفرت سمجھتی ہو۔ حسن بہت اچھا لڑکا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔''

''کیا کیا چغلیاں لگائی جا رہی ہیں......؟''

حسن اچانک ہی ٹپک پڑا۔

''تم سے مطلب......؟''

عالیہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

''لو بھلا......! مجھ سے مطلب کیوں نہیں......؟ جب بات میری ہو رہی ہے تو میں کیوں نہ بولوں......؟ کیوں آپی جان......؟''

حسن آرزو کے پاس بیٹھ گیا۔

آرزو کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سامنے سے آتی گڑیا اور اشرف کو دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ آہٹ پر شہزاد نے پلٹ کر دیکھا اور گڑیا کو دیکھتے ہی ناگواری سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اشرف اور گڑیا سلام کر کے خاموشی سے بیٹھ

گئے۔

آرزو نے شہزاد کو دیکھا تو اشرف بولا۔

''آرزو صاحبہ......! میں آپ کی امانت آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ اب آپ جو فیصلہ کریں۔ ویسے میرے خیال میں گڑیا کو پہلے شہزاد سے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگنی چاہئے، چلو گڑیا......!''

گڑیا نے شہزاد کی طرف دیکھا اور معذرت بھرے لہجے میں بولی۔

''مجھے افسوس ہے شہزاد......! میں نے......''

''اس میں معذرت کی کیا بات ہے......؟''

شہزاد اس کی بات کاٹ کر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''آپ کو تو اپنے کارنامے پر خوش ہونا چاہئے۔ آپ نے اپنے بھائی کا بدلہ تو چکایا، ویسے میں پوچھ سکتا ہوں، آپ یہاں کس خوشی میں تشریف لائی ہیں......؟''

آرزو دم بخود شہزاد کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ وہی شہزاد تھا جسے وہ اپنی نظروں میں بچہ تصوز کرتی تھی۔

''مجھے معاف کر دو شہزاد......! میں کچھ نہیں جانتی تھی۔''

گڑیا کی آواز بھرا گئی اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

''شہزاد......! تمہیں شرم نہیں آتی، ایسی باتیں کرتے ہوئے......؟''

آرزو، شہزاد کو ڈانٹنے لگیں۔

''آپی......! آپ نہیں جانتیں، آپ اس کے رونے پر مت جائیں۔''

شہزاد کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔

''بکواس مت کرو......! ورنہ مار بیٹھوں گی۔ اور گڑیا ڈیئر......! تم بھی چپ ہو جاؤ......!''

آرزو نے کہا تو گڑیا ان کی گود میں سر رکھ کر گھاس پر بیٹھ گئی۔

"اشرف صاحب......! میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔"

آرزو نے کہا اور اپنے ہاتھوں کو یوں دیکھنے لگی جیسے انگوٹھی اُتار کر گڑیا کو پہنانا چاہتی ہو۔ مگر انگوٹھی پر نظر پڑتے ہی ارادہ بدل گیا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں نکاح کی انگوٹھی تھی، رضا کی نشانی۔

"جانِ آرزو......!"

کوئی ہواؤں میں سرگوشی کرتا بلندیوں میں پرواز کر گیا۔

"رضا......!"

اس کے دل نے سسکی بھری اور آرزو نے اس کی یاد سے پیچھا چھڑانے کے لئے شہزاد کو مخاطب کیا۔

"چلو شہزاد......! تم نے جو فضول بکواس کی ہے، گڑیا سے اس کی معافی مانگو......!"

شہزاد نے بہن کو دیکھا، وہ اس کے لئے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ گڑیا کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"اے میڈم......! معاف کر دیجئے......!"

"آپی......! آپ عالیہ سے بھی کہیں، وہ مجھ سے معافی مانگے۔ کیونکہ یہ مجھ سے زبردست جھگڑا کر کے آئی تھی۔"

حسن کی بات پر عالیہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ حرکت ایسی تھی کہ اشرف کے چہرے پر سنجیدگی کے باوجود مسکراہٹ پھیل گئی۔

آرزو کے چہرے پر ہلکا سا تبسم تھا۔ شہزاد، گڑیا، عالیہ اور حسن قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

